خدا اور کائنات
پیام شاہجہان پوری
خدا اور کائنات
پیام شاہجہان پوری

پیام شاہجہانپوری کی تصانیف

1- خدا اور کائنات
2- رسول کریمؐ
3- اُمِ رسولؐ
4- مقام آمنہؓ (زیرتالیف)
5- مسیحؑ کا سفرزندگی
6- مقام مسیحؑ
7- مسیحؑ کی گمشدہ زندگی
8- مسیحؑ کی بن باپ پیدائش
9- مسیحؑ کی گمشدہ انجیل (ہندی انجیل)
10- عثمانؓ اور خلافتِ عثمانؓ
(ایم اے اسلامی تاریخ کے طلباء کیلئے پنجاب یونیورسٹی کی طرف سے منظور شدہ امدادی کتاب)
11- علیؓ اور ان کی خلافت
12- حیاتِ حسنؓ
13- مقام حسینؓ
14- عائشہؓ اور خلافتِ علیؓ
15- شہادت گاہِ بالاکوٹ
(سید احمد شہیدؒ کی تحریکِ اصلاح و جہاد)
16- حیاتِ اسمٰعیل شہیدؒ
17- آفتابِ ہجویرؒ
18- تذکرہ شاہ محمد غوثؒ
19- تاریخ تحریکِ پاکستان
20- ہماری تاریخ (کراچی کے پرائمری اسکولوں کیلئے منظور شدہ)
21- 1857ء کا جہاد
22- جنوبی ہند میں اُردو
23- انیسویں صدی کی اُردو نثر
24- میخانۂ عجم
(فارسی شاعر ''رودکی'' کے عہد سے صفوی دور تک کے ایرانی ادب کا جائزہ)
25- شعلۂ احساس (مصنف کی قومی نظمیں)
26- آئینہ (مصنف کی مزاحمتی شاعری)
27- ''دل ہی تو ہے''
(مصنف کی غزلوں کا زیرِ ترتیب مجموعہ)

خدا اور کائنات

تالیف

پیام شاہجہانپوری

ادارۂ تاریخ و تحقیق

این۔23، عوامی فلیٹس، ریواز گارڈن، لاہور (54000)

نام کتاب : خدااور کائنات

مولف : پیام شاہجہانپوری

مقام اشاعت : این/23، ریواز گارڈن، لاہور

ناشر : محمد رضی الدین خاں

طابع : چوہدری طاہر حمید پریس

6- قطب روڈ عقب داتا دربار ہسپتال لاہور

کمپوزنگ : تصور کمپوزنگ سنٹر، 108۔ لٹن روڈ، لاہور

تاریخ طباعت (باراول): جون 2004ء

تعداد: 500

ٹیلی فون: 7322313

قیمت =/200 روپے

حرفِ آغاز

یہ کتاب جو اس وقت آپ کے ہاتھ میں ہے آج سے کم وبیش ربع صدی قبل لکھی گئی تھی مگر حادثہ یہ ہوا کہ اس کی کتابت شدہ کاپیاں ضائع ہوگئیں'یہ ایک لمبی کہانی ہے'اس کا قلمی مسودہ بھی گم ہوگیا جس سے دوبارہ کتابت کروالی جاتی'صبر کرلیا مگر دل میں ایک تڑپ تھی'جستجو رہتی تھی کہ یہ متاعِ گم شدہ مل جائے۔اللہ کریم زندگی اور صحت سے نوازے میرے فرزند زادہ (Grand Son) فیضان سلمہٗ کو جس نے کاغذات کی ایک پرانی گٹھری میں سے (دو سال قبل) اس کتاب کا قلمی مسودہ ڈھونڈ نکالا۔ یہ مسودہ بھی میرے اصل قلمی مسودے کی نقل ہے۔وقت کی گرد نے مسودے کے بعض حصوں کو خاصا نقصان پہنچایا تھا' کچھ اوراق گم گئے تھے۔بہر حال حافظہ پر زور ڈال کر اور کچھ پرانی یادداشتوں سے امداد لے کر اسے مکمل کرلیا الحمدللہ ثم الحمدللہ کہ اب یہ کتاب آپ کے ہاتھ میں ہے۔

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے اس کتاب میں خداوند تعالیٰ کی ہستی اور اس کائنات کی تخلیق کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے۔ہستی باری تعالیٰ کے منکروں نے خدا کے تصور پر جو اعتراضات کئے ہیں انہیں موضوعِ گفتگو بنایا گیا ہے اور ان کے وزن ومعقولیت کا جائزہ لیا گیا ہے۔یہ جائزہ جذبات کی رو میں بہہ کر نہیں بلکہ تاریخ' عقل اور سائنس کی روشنی میں لیا گیا ہے۔

دوسرے حصہ میں خدا کی ہستی کے عقلی دلائل پیش کئے گئے ہیں۔ان دلائل کا تعلق بھی جذبات سے نہیں بلکہ عقل وفکر اور روزمرہ کے مشاہدے سے ہے جو پکار پکار کر

شہادت دیتا ہے کہ اس کائنات کا ایک خالق ہے۔ گویا یہ انسانی فطرت کی پکار ہے بشرطیکہ کسی کی فطرت مسخ نہ ہوگئی ہو۔

کتاب کے تیسرے اور چوتھے ابواب کا تعلق تخلیق کائنات اور زندگی کے آغاز سے ہے۔ ان ابواب میں بنیادی بحث یہ ہے کہ سائنس نے تخلیق کائنات کے بارے میں جو نظریات گزشتہ دو تین صدیوں میں پیش کئے ہیں وہ قرآنِ کریم آج سے ڈیڑھ ہزار سال قبل پیش کر چکا ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ جدید سائنس نے یہ نظریات قرآن شریف سے اخذ کئے ہیں یا ان مسلمان اکابر سے جنھوں نے قرآن کی روشنی میں اپنے فلسفیانہ افکار پیش کئے۔ اس باب کا وہ حصہ بھی قابل توجہ قرار پائے گا جس میں انسان کی تخلیق کے بارے میں بحث وگفتگو کی گئی ہے کہ اس کائنات کا خلاصہ اور جوہر تو انسان ہی ہے، یہ کیسے تخلیق پایا، کن مراحل سے گزر کر اپنی موجودہ شکل وصورت تک پہنچا۔

کتاب کا پانچواں باب ''ظہورِ آدم'' سے متعلق ہے یہ بہت نازک اور چشم کشا بحث ہے کہ ''آدم'' اور ''حضرت آدمؑ'' میں کیا فرق ہے؟ حضرت آدمؑ سے پہلے کیا روئے زمین پر نسل انسانی موجود تھی؟ حضرت آدمؑ کہاں پیدا ہوئے، جنتِ اُخروی میں جہاں انسان اپنی موت کے بعد جائے گا؟ یا اسی دنیا کے کسی پر فضا مقام پر؟ اب تک کتنے آدمؑ پیدا ہو چکے ہیں؟

کتاب کے چھٹے باب میں ابلیس اور جن کی حقیقت پر بحث کی گئی ہے۔ قرآن شریف، احادیثِ نبویؐ، مفکرین اسلام، عربوں کے اہل لُغت اور قدیم عرب شعراء کے کلام سے استدلال کیا گیا ہے کہ ابلیس کون تھا؟ اس کا انجام کیا ہوا؟ جن کیا انسانوں سے الگ کوئی نوع ہے یا انسانوں ہی کی ایک قسم ہے؟ کیا جن کا کوئی مستقل وجود ہے؟

آخری اور چھٹا باب روح کی حقیقت سے متعلق ہے۔ ہندوستان، یونان، مصر اور دنیا کے مختلف ممالک میں پیدا ہونے والے فلاسفروں نے روح کے بارے میں کیا نظریات پیش کئے؟ قرآن شریف روح کے بارے میں کیا نظریہ پیش کرتا ہے؟ اور گزشتہ چودہ سو سال میں منظر عام پر آنے والے مسلمان مفکروں نے روح کے بارے میں کیا کہا؟

روح اور جان، روح اور نفس میں کیا فرق ہے؟ کوئی فرق ہے بھی یا نہیں؟ یہ لطیف مباحث اس باب کی جان ہیں۔

آخر میں شکریہ ادا کرتا ہوں اپنے عزیز دوست اور پنجاب یونیورسٹی لائبریری کے سینئر لائبریرین مکرم حافظ مختار احمد صاحب گوندل کا کہ موصوف نے اس کتاب کے پروف دیکھے اور جہاں بھی کمپوزنگ کی ادنیٰ سی بھی غلطی نظر آئی اس کی نشاندہی فرمائی۔ اسی طرح میرے دیرینہ کرم فرما اور پنجاب یونیورسٹی لائبریری کے سابق چیف لائبریرین مکرم سید جمیل احمد رضوی صاحب بھی میرے دلی شکریے کے مستحق ہیں کہ موصوف نے بھی نہایت مخلصانہ تعاون فرمایا، ایک عنایت یہ کی کہ ''نہج البلاغہ'' کے ایرانی ایڈیشن کے چند صفحات کے فوٹو عنایت فرمائے۔ اورینٹل کالج لاہور کے ایسوسی ایٹ پروفیسر شعبۂ عربی مکرم ڈاکٹر خالق داد اعوان صاحب نے بھی تعاون فرمایا اور پروف میں موجود بعض عربی عبارت کی اغلاط کی نشاندہی فرمائی ان کا بھی دل کی گہرائیوں سے شکریہ۔ پنجاب یونیورسٹی لائبریری کے شعبۂ مشرقیات کی خاتون لائبریرین میڈم مسرت جبیں صاحبہ بھی میرے شکریہ کی مستحق ہیں کہ موصوفہ نے بعض چینی اور افریقی شخصیات کے ناموں کے صحیح تلفظ کے تعین میں تعاون فرمایا۔ اللہ تعالیٰ ان سب کرم فرماؤں کو دنیا اور آخرت کی بھلائیوں سے نوازے آمین!

اور ہاں اپنے سب سے بڑے فرزند زادہ (Grand Son) عزیزم ذی شان احمد خاں سلمہٗ کا ذکر کرنا تو بھول ہی گیا کہ اس عزیز نے ساری کتاب کی پروف ریڈنگ کی اور بہت محنت سے کی۔ اللہ کریم میرے اس برخوردار کو بھی اپنی عنایات سے نوازتا رہے۔ آمین!

والسلام

پیام شاہجہانپوری

18 اپریل 2004ء

ریواز گارڈن لاہور

⌘⌘⌘

فہرستِ عنوانات

نوٹ: یہ عنوانات کی محض ایک جھلک ہے ورنہ کتاب کے عنوانات کی تعداد ان عنوانات سے دوگنی سے بھی زیادہ ہے۔ (مولف)

⌘⌘⌘

Mian Abdul Latif Shakholi
Tamga Khidmat Pakistan

خدا کا تصور

منکرینِ خدا کہتے ہیں کہ جب روئے زمین پر انسانی زندگی کا آغاز ہوا اور وحشی انسانوں نے اپنے اردگرد خونخوار، خوفناک اور موذی جانوروں مثلاً شیر، بھیڑیا، ہاتھی اور سانپ وغیرہ کو دیکھا، بادلوں کے گرجنے، بجلیوں کے کڑکنے اور آتش فشاں پہاڑوں کے پھٹنے کا مشاہدہ کیا تو چونکہ یہ جانور اور یہ اشیاء ان لوگوں کو نقصان پہنچاتے تھے اس لئے ان کے دل میں ان سے خوف پیدا ہوا اور خوف کے تحت انہوں نے ان کی پرستش شروع کر دی۔ پھر انہوں نے سورج، چاند اور دریاؤں کو دیکھا جو انہیں نفع پہنچاتے تھے انہیں خوش رکھنے کے لئے وہ ان چیزوں کی عبادت کرنے لگے یہیں سے انسان کے ذہن میں خدا کا تصور پیدا ہوا۔ مغرب کے ان ''دانشوروں'' کے نظریئے کے مطابق خدا نے انسان کو پیدا نہیں کیا کیونکہ اس کا تو وجود ہی نہیں بلکہ انسان کے ذہن نے خدا کا فرضی وجود تخلیق کر لیا۔ مشہور منکرِ خدا فریڈرک اینجلز (Fredrick Angels) نے اس نظریئے کو اپنے مخصوص فلسفیانہ انداز سے پیش کیا چنانچہ "A Glance at Historical Materialism" نامی کتاب میں اینجلز کا نقطۂ نگاہ ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

''مذہب اس کے سوائے اور کچھ نہیں کہ انسان کو جو مادی قوتیں مغلوب کر لیتی ہیں ان کا ایک غیر متوازن اثر اس کے دل پر قائم ہو جاتا ہے۔ مافوق الفطرت طاقتوں (فرشتوں، شیطان اور خدا) پر یقین تمام مذاہب میں قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ لوگوں نے مافوق الفطرت طاقتوں کا تصور کہاں سے لیا اور ایک ایسی مافوق الفطرت ہستی (خدا) کو کیوں تسلیم کر لیا جس کا سرے سے وجود ہی نہیں''۔

اینجلز اس سوال کا خود ہی جواب دیتا ہے، وہ کہتا ہے کہ:۔

''مافوق الفطرت قوتوں پر ایمان رکھنے سے انسان کے اس دور کی بے چارگی ظاہر ہوتی ہے جب وہ غیر مہذب، وحشی اور لاچار تھا۔ اس دور میں انسان کائنات کے مختلف عناصر کا غلام ہو کر رہ گیا تھا۔ بادلوں کے گرجنے، بجلی کے کڑ کنے، مینہ برسنے، سمندر کے جوار بھاٹے، سیلابوں، زلزلوں، آتش فشاں پہاڑوں کے لاوا اُگلنے اور بیماریوں کی اصل حقیقت کا اس میں شعور پیدا نہیں ہوا تھا۔ وہ ان مناظر اور حادثات و واقعات کے منطقی اسباب تلاش کرنے سے قاصر تھا اس لئے اس نے عناصرِ فطرت کی ان کار فرمائیوں کو ایک فرضی مافوق الفطرت ہستی (خدا) سے منسوب کر دیا اور اسے راضی کرنے کے لئے قربانی، عبادت اور دعا کے طریقے گھڑ لیے''۔

منکرینِ خدا کے نظریات کا تجزیہ

اینجلز ہی پر منحصر نہیں زمانہ حال کے تمام ملحد اور خداوند تعالیٰ کی ہستی کے منکر انکارِ خدا کی عمارت انہی بنیادوں پر اُٹھاتے ہیں۔ آیئے اس نظریئے کا منطق اور تاریخ کی روشنی میں جائزہ لیں۔ یہ درست ہے کہ بنی نوع انسان ابتدائی دور میں غیر مہذب اور وحشی تھا اور اس میں عقل و فراست پیدا نہیں ہوئی تھی اُس کے اِس دور کو قبلِ تاریخ کا زمانہ کہتے ہیں۔ اینجلز اور اس کے ہم عقیدہ منکرینِ خدا کے نظریئے کے مطابق اگر ان وحشی لوگوں نے اپنی جہالت کی وجہ سے خونخوار درندوں اور مظاہرِ فطرت مثلاً سورج، چاند، دریاؤں اور پہاڑوں کی پرستش شروع کر دی تو یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ انسان ہمیشہ تو وحشی اور جاہل نہیں رہا۔ ایک زمانہ آیا جب وہ جہالت کے تاریک دور سے نکل کر تہذیب، شائستگی، عقل و فراست اور علم کے روشن دور میں داخل ہوا۔ اس دور میں اس نے بڑے بڑے شہر آباد کئے، سر بفلک اور عظیم الشان عمارتیں تعمیر کیں، ستاروں اور سیاروں کی رفتار اور ان کے اثرات کا علم حاصل کیا، سورج اور چاند گرہن کی تاریخیں متعین کیں، زمین کی سیرابی کے لئے نہریں نکالیں، پل بنائے، فضا میں معلق باغات لگائے، علمِ طب کی بنیاد رکھی اور رسم الخط ایجاد کیا۔ ظاہر ہے کہ یہ عظیم الشان علمی اور تہذیبی کارنامے غیر متمدن اور وحشی لوگ تو سر انجام نہیں دے سکتے تھے۔

اگر مافوق الفطرت ہستیوں یعنی فرشتوں' شیطانوں اور خدا کا عقیدہ انسان نے دورِ جاہلیت میں اختیار کر لیا تھا تو مہذب و متمدن اور ترقی یافتہ ہونے کے بعد تو اسے یہ عقیدہ ترک کر دینا چاہیئے تھا کیونکہ اب اس کے ذہن کو روشنی مل چکی تھی مگر ہم دیکھتے ہیں کہ بنی نوع انسان علمی اور ذہنی لحاظ سے جس قدر ترقی کرتا گیا خداوند تعالیٰ کے بارے میں اس کا نظریہ اسی قدر مضبوط ہوتا گیا' اس سے ثابت ہوا کہ خداوند تعالیٰ کے وجود کے عقیدے کی بنیاد جہالت پر قائم نہیں تھی۔

دوسری غور طلب بات یہ ہے کہ منکرینِ خدا کے بقول قبل از تاریخ کے وحشی انسان نے درندوں' سورج' چاند' دریاؤں اور پہاڑوں کی عبادت کی کیونکہ وہ انہی چیزوں کو اپنے نفع و نقصان کا باعث سمجھتا تھا' سوال یہ ہے کہ اس کے ذہن میں خدا کے وجود کا تصور کیسے پیدا ہو گیا۔ وہ تو صرف ان چیزوں کی عبادت کرتا اور انہیں نذریں پیش کر کے خوش رکھنے کی کوشش کرتا تھا جو اسے نظر آتی تھیں جن سے ظاہر ہونے والے فائدے یا نقصان کا وہ مشاہدہ کرتا تھا خدا تو اسے نظر نہیں آتا تھا اور نہ انسان نے خدا کو فائدہ یا نقصان پہنچاتے ہوئے دیکھا تھا' پھر اس نے خدا کی عبادت کیسے شروع کر دی؟ منکرینِ خدا کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں۔

منکرینِ خدا کے اس نظریئے پر سب سے بڑا اعتراض یہ پیدا ہوتا ہے کہ زمانہ قبل از تاریخ کے اس وحشی انسان کی توہم پرستی کے بارے میں اینجلز اور اس کے ہم خیال مفکروں نے جو ''دریافت'' ہمارے سامنے پیش کی ہے اس کا ماخذ کیا ہے؟ آخر انہیں کیسے معلوم ہوا کہ ابتدائی عہد کے انسانوں کے جذبۂ عبادت کی بنیاد خوف اور لالچ پر مبنی تھی؟ آیا کوئی ایسی تحریر یا تاریخی دستاویز دستیاب ہوئی ہے جس سے یہ ثابت ہوتا ہو کہ ان وحشی انسانوں نے ڈر' خوف اور لالچ کے تحت مختلف جانوروں اور مظاہرِ فطرت کی پرستش شروع کی تھی اور اسی پرستش نے آگے چل کر ایک مافوق الفطرت ہستی (خدا) کا تصور گھڑ لیا؟ ظاہر ہے کہ ایسی کوئی اطلاع کسی ذریعے سے ہم تک نہیں پہنچتی۔ یہ سب منکرینِ خدا کے اپنے ذہن کے قیاسات' مفروضات اور وسوسے ہیں جن کا ان کے پاس کوئی ثبوت نہیں اور حقائق

کی دنیا میں قیاسات اور مفروضات کو کوئی جگہ نہیں مل سکتی۔ ان قیاسات کی حیثیت عالمِ خواب میں محلات تعمیر کرنے سے زیادہ اور کچھ نہیں۔ اب ہم تاریخ کی روشنی میں اس حقیقت کا جائزہ لیتے ہیں کہ انسان نے پہلے آگ، پانی، درندوں، فرشتوں اور اپنے بزرگوں کی عبادت کی یا وہ پہلے خدائے واحد کے وجود پر ایمان لایا؟

جب ہم قدیم اقوام کی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ جب سے روئے زمین پر انسان نے سوچنا شروع کیا اسی وقت سے اس کی تمدنی اصلاح، تربیتِ اخلاق اور تزکیۂ نفس کے لئے انبیاء کا سلسلہ شروع ہو گیا جنہوں نے بنی نوع انسان کو ایک ایسی ہستی کا ادراک عطا کیا جو اس کائنات کی خالق و مالک ہے۔ ابتدا میں ہر مذہب نے اس کائنات کے ایک اور صرف ایک خالق کا تصور پیش کیا جو بعد میں مسخ ہو کر لاتعداد خداؤں میں تقسیم ہو گیا۔ چنانچہ ہندوستان، ایران، عراق، مصر، یونان، چین اور جاپان غرض جن ممالک کی قدیم تاریخ محفوظ ہے ان سب ممالک کی تاریخوں میں مذہب، اس کے بانیوں اور ان کی پاکیزہ تعلیمات کے نقوش بھی کسی نہ کسی صورت میں محفوظ ہیں۔

ہندو مت

ہندوستان میں مذہب کا تصور بہت قدیم ہے۔ مشہور مورخ و محقق فاکس مولر (Fox Muller) نے ویدوں اور ان کی تحریر و ترتیب سے قبل کے ہندی مذہب پر تحقیق کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ہندو ابتدا میں خدائے واحد پر ایمان رکھتے تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ خدا مذکر اور مونث کی قیود سے بالا ہے۔ وہ خدا کو انسانی خصوصیات سے بھی بلند اور پاک قرار دیتے تھے۔ مولر کہتا ہے کہ حقیقت تو یہ ہے کہ خود ویدوں کے (آریہ) علما نے یہی تصور اپنا کر اللہ کے رب ہونے کا عقیدہ اختیار کیا۔

فاکس مولر نے جس ہندو عقیدے کی تحقیق کی ہے اس کا زمانہ تقریباً ڈیڑھ ہزار سال قبل مسیح یعنی آج سے ساڑھے تین ہزار سال قبل سے بھی پہلے کے زمانہ سے تعلق رکھتا ہے۔ گویا اس وقت تک ہندو ایک خدا کی ہستی پر ایمان رکھتے تھے۔ انہوں نے اس خدا کی مختلف صفات اور طاقتیں متعین کی تھیں جو بلا شبہ ان کے مذہبی پیشواؤں کے ذریعے ان تک

پہنچیں۔ محقق مولر کی تحقیق کے مطابق قدیم ہندوؤں کے عقیدے کی رو سے اللہ تعالیٰ کی تین بڑی صفات ہیں' اول برہما یہ اس کی صفتِ خالقیت ہے۔ دوم وشنو' یہ اس کی وہ صفت ہے جس کی رو سے خدا اس کائنات کا محافظ و نگراں ہے۔ سوم شیو' یہ اس کی وہ صفت ہے جس کی رو سے اللہ تعالیٰ اپنے گنہگار بندوں پر اپنا قہر نازل کرتا ہے۔ گویا یہ تینوں اللہ تعالیٰ کے صفاتی نام تھے بعد کو ان عقائد میں بگاڑ پیدا ہوا اور خدا کی ان صفات کے بت بنا کر مندروں میں رکھ دیئے گئے جن کی پرستش ہونے لگی۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کی قدرتوں مثلاً آگ' پانی' سورج' چاند اور ستاروں کو بھی دیوی دیوتا کی شکل دیدی گئی اور ان کے بھی بت بنا کر ان کی پرستش کی جانے لگی۔

بدھ مت

ہندوستان کے قدیم مذاہب میں دوسرا مذہب بدھ مت ہے جس کے داعی گوتم بدھ تھے۔ مہاتما بدھ چھ سو قبل مسیحؑ کے وسط میں پیدا ہوئے۔ گوتم بدھ کی تعلیم بھی اپنی اصل میں نہایت پاکیزہ اور ہر قسم کے توہمات سے پاک تھی۔ ہندوستان کے اس عظیم مذہبی رہنما نے بھی ہندوؤں کو خدائے واحد کی عبادت کی دعوت دی اور نہایت پاکیزہ اور ارفع و اعلیٰ اخلاق کی تلقین کی۔ افسوس کہ بعد میں بدھ مت کے مخالفوں نے ایک سازش کے تحت اس مذہب میں ایسے عقائد کی آمیزش کر دی کہ یہ موحدانہ تعلیم الحاد بن کر رہ گئی۔ بدھ مت کے مخالفین نے یہ تاثر دیا کہ گوتم بدھ خدا ہی کے منکر تھے' حالانکہ ایسا نہ تھا۔ چنانچہ مشہور محقق ایڈون آرنلڈ (Edwin Arnold) نے گوتم بدھ کے اقوال ''پالی'' زبان سے انگریزی میں ترجمہ کر کے اپنی کتاب میں درج کئے ہیں۔ ''پالی'' مہاتما بدھ اور ان کی قوم کی زبان تھی۔ گوتم بدھ فرماتے ہیں:

''وہ چیز جس کا نام حقیقت (خدا) ہے سب گہرائیوں سے گہری' آسمان سے بلند' ستاروں سے دور اور برہما سے بہت آگے ازلی و ابدی ہے۔ یہ ایک ایسی طاقت ہے جو نہایت بلند اور ہمہ گیر ہے جو ازل سے اچھائیوں کو پسند کرتی ہے کیونکہ وہ خود اچھائی ہے' جو کچھ ہے اس کی ذات سے ہے اور جو کچھ ہے اس کی طرف واپس جائے گا۔ وہی ہے جو ماں

کی چھاتیوں میں دودھ پیدا کرتی ہے، سانپ کے منہ میں زہر پیدا کرتی ہے، کبھی بیاباں کو گلستاں میں تبدیل کر دیتی ہے، اس کی کچھ صفات سے تو ہم واقف ہیں مگر اس کی لاتعداد صفات ایسی بھی ہیں جن کا ہمیں مطلق علم نہیں۔ وہ ہمیں نظر نہیں آتی مگر اس کے باوجود ہمارے جملہ امور میں ہماری امداد کرتی ہے۔ اگر تم اپنے پیروں پر خود کلہاڑی مارو گے تو وہ ہستی تمہیں معاف نہیں کرے گی۔ وہ کسی کی طرفداری نہیں کرتی، صرف یہ چاہتی ہے کہ ہم اپنے فرائض ادا کرتے رہیں، اس کی میزانِ عدل نصب ہے۔ اسے اختیار ہے جب چاہے گی ہمارے اعمال کا وزن کرلے گی، اس وقت اس حقیقت کا انکشاف ہوگا کہ ہم جو کچھ کرتے رہے غلط تھا، اس وقت کوئی ہماری مدد نہیں کرے گا۔ اُس (خدا) کا انصاف برقرار ہے، کوئی قوت نہیں جو اس سے عظیم ہو۔ محبت اس کا آغاز ہے اور آشتی اس کا انجام۔ اس کی اطاعت ہر ایک پر واجب ہے''۔(The Light of Asia by Edwin Arnold)

آپ نے دیکھا! گوتم بدھ کی تعلیم کتنی موحدانہ اور حقیقت پسندانہ تھی حتیٰ کہ وہ دیوی دیوتا کی بھی ہمیشگی کے منکر تھے اور ان صفات کو رد کرتے تھے جو برہموں نے ان سے منسوب کر کے انہیں خدا کا درجہ دے دیا تھا۔ چنانچہ گوتم بدھ کہتے ہیں کہ ''دیوتا انسان کی مانند ہیں اور اسی کی طرح بے بس اور محتاج ہیں''۔ مگر بعد میں مہاتما بدھ کی اس موحدانہ تعلیم میں تحریف کی گئی۔ گوتم بدھ کے مجسمے بنا کر ان کی پرستش شروع کر دی گئی اور اس پاکیزہ تعلیم میں ایسے عقائد داخل کر دیئے گئے، جن کی وجہ سے بدھ مت بھی دیومالائی داستانوں کا مذہب بن کر رہ گیا۔

یہاں ایک امر کی وضاحت نامناسب نہ ہوگی کہ دنیا کے دوسرے مذاہب کے علماء و محققین کے علاوہ خود مسلمانوں کے وسیع النظر اور ادیانِ عالم کی تاریخ سے پوری طرح باخبر علماء نے بھی اس رائے کا اظہار کیا ہے کہ گوتم بدھ خدا کے فرستادہ اور روحانی پیشوا تھے اور ظاہر ہے کہ روحانی پیشوا خدا کی ذات کے منکر نہیں ہوتے نہ اپنی پرستش کی تعلیم دیتے ہیں چنانچہ مولانا اشرف علی صاحب تھانوی کے خلیفہ اور ممتاز عالم دین مولانا مناظر احسن گیلانی نے گوتم بدھ کو نہ صرف مقدس روحانی پیشوا بلکہ حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی

تشریف آوری کی بشارت دینے والا قرار دیا ہے۔ مولانا موصوف لکھتے ہیں کہ:

''میں بدھا (گوتم بدھ) کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مشرقی نقیب خیال کرتا ہوں''۔ (النبی الخاتمؐ۔ فٹ نوٹ صفحہ نمبر 20)

آگے چل کر مولانا مناظر احسن گیلانی گوتم بدھ کی شخصیت پر ان الفاظ میں اظہارِ خیال کرتے ہیں کہ ''جس نے دھرم کا نرسنگھا ایران سے چین کی دیواروں تک پھونکا' سنو! چلتے ہوئے اس نے دنیا کو کیا وصیت کی۔ اگر چہ بہت کچھ مٹ چکا ہے لیکن مٹنے سے جو چیزیں بچ گئی ہیں اس میں مہاتما بدھ کا یہ آخری فقرہ اب تک زندہ ہے جس کو اپنی زندگی ختم کرتے ہوئے خدا کے اس بندہ نے اپنے شاگرد ''نندا'' کے کان میں اُس وقت ڈالا جب، اس کی سانس اکھڑ رہی تھی اور اس کا یہ مخلص خادم اس کے قدموں کو اپنے آنسوؤں سے یہ کہتے ہوئے دھو رہا تھا:

''آقا! آپ کے جانے کے بعد دنیا کو کون تعلیم دے گا؟''

بدھ نے اس کے جواب میں کہا کہ:

''نندا! میں پہلا بدھ نہیں ہوں جو زمین پر آیا' نہ میں آخری بدھ ہوں۔ اپنے وقت پر دنیا میں ایک اور بدھ آئے گا''۔

مہاتما بدھ نے اس آخری تشریف لانے والے کی مندرجہ ذیل علامات بیان کیں:

''مقدس' منور القلب' عمل میں دانائی سے لبریز' مبارکِ عالم کائنات' انسانوں کا عدیم النظیر سردار۔ جو غیر فانی حقائق میں ظاہر کرتا رہا ہوں وہ بھی وہی ظاہر کرے گا' وہ ایک مکمل اور خالص مذہبی نظامِ زندگی کی میری طرح تبلیغ کرے گا''۔

نندا نے کہا کہ ہم اس کو کس طرح پہچانیں گے؟ آقا نے فرمایا:

''وہ ''تیریا'' کے نام سے موسوم ہوگا''۔ (''تیریا'' پالی زبان کا لفظ ہے جو مہاتما بدھ اور ان کی قوم کی زبان تھی۔)

''تیریا'' کی تشریح کرتے ہوئے مولانا مناظر احسن گیلانی لکھتے ہیں کہ 16 اکتوبر 1930ء

کی اشاعت میں الہ آباد کے مشہور انگریزی اخبار ''لیڈر'' میں ایک بدھ عالم نے ''تیریا'' کا ترجمہ کیا ہے...... ''وہ جس کا نام رحمت ہے''۔

گویا مہاتما بدھ ایک ایسے نبیٔ کامل کی آمد کی خوشخبری دیتے ہیں جو مقدس ہوگا' جس کا قلب نور سے لبریز ہوگا' جس کے ہر عمل میں دانائی ہوگی' جو مکمل نظامِ حیات پیش کرے گا اور جسے رحمت کے لقب سے یاد کیا جائے گا یعنی

وما ارسلنک الا رحمته اللعالمین

''وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا''

کیا ایسی شخصیت کے متعلق یہ گمان بھی کیا جا سکتا ہے کہ وہ (گوتم بدھ) خدا کے منکر تھے یا انہوں نے اپنے مجسمے بنا کر ان کی پرستش کرنے کی ہدایت کی تھی۔ ظاہر ہے کہ گوتم بدھ کے اقوال اور ان کی شخصیت سے متعلق مندرجہ بالا صراحت سے ایک ہی نتیجہ نکلتا ہے کہ وہ خدا کے فرستادہ اور اس کے مقدس بندے تھے اور دنیا میں خدائے واحد پر ایمان لانے کی تعلیم دینے کی غرض سے بھیجے گئے تھے ان کی تعلیمات میں تحریف ان کے بعد کی گئی۔

دینِ ابراہیمی

دینِ ابراہیمی کا شمار دنیا کے قدیم مذاہب میں ہوتا ہے جس کے بانی حضرت ابراہیم علیہ السلام تھے۔ آپؑ کا زمانہ آج سے چار ہزار سال قبل کا ہے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق قرآن حکیم بیان کرتا ہے کہ ابراہیمؑ موحد تھا۔ یعنی حضرت ابراہیمؑ نے خدا کا جو تصور پیش کیا اس میں ایک سے زیادہ خداؤں یا بت پرستی کا شائبہ تک نہ تھا چنانچہ حضرت ابراہیمؑ اپنے والد (دراصل چچا) اور اپنی بت پرست قوم کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

واعتز لکم وما تدعون من دون اللہ الخ

''میں تم لوگوں سے اور اللہ کے سوائے جن کی تم عبادت کرتے ہو ان سے کنارہ کشی اختیار کرتا ہوں اور میں اپنے رب کی عبادت کروں گا۔ مجھے یقین ہے کہ میں اپنے رب کی عبادت کر کے محروم اور بے نصیب نہیں

رہوں گا''۔(سورہ مریم آیت نمبر ۴۸)

حضرت ابراہیمؑ سے انبیاء کا جو سلسلہ شروع ہوا اس میں حضرت یعقوبؑ اور حضرت موسیٰؑ بڑے جلیل القدر نبی گزرے ہیں اور ان سب نے خدائے واحد کا تصور پیش کیا اور بت پرستی کو سختی سے رد کیا چنانچہ ''عہد نامۂ قدیم'' میں اللہ تعالیٰ حضرت موسیٰؑ کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ:

''پس آج کے دن تو جان لے اور اس بات کو اپنے دل میں جما لے کہ اوپر آسمان میں اور نیچے زمین پر خداوند ہی خدا ہے کوئی دوسرا نہیں''۔
(عہد نامۂ قدیم باب استثناء)

حضرت موسیٰ علیہ السلام چودہ سو سال قبلِ مسیحؑ میں پیدا ہوئے۔ گویا آج سے قریباً ساڑھے تین ہزار سال قبل بھی ایشیا کے قلب میں توحید کے نغمے گونج رہے تھے اور بت پرستی کے تصورات پاش پاش ہو رہے تھے۔

زردشتی مذہب

ہندوستان کی سرحدوں سے ملحق ایران کی قدیم مملکت ہے جس کی تہذیب اور تاریخ بھی نہایت قدیم ہے۔ ایران کو بھی یہ شرف حاصل ہے کہ اس سرزمین پر بھی خدا کا ایک فرستادہ پیدا ہوا جس نے وحدانیت، اخلاقی برتری اور پاکیزگی کے سرمدی نغمے گائے اور بندوں کو خدا کی طرف مدعو کیا۔ یہ بزرگ ہستی حضرت زردشت کی تھی۔ مشہور محقق Darmesteter نے اپنی محققانہ تصنیف ''حادثاتِ عالم'' میں زردشت اور ان کے مذہب پر تفصیل سے بحث کی ہے۔ زردشت قریباً ساڑھے چھ سو سال قبل مسیح میں پیدا ہوئے یعنی آج سے ڈھائی ہزار سال قبل۔ زردشت اللہ تعالیٰ کو ''ہرمز'' کے نام سے موسوم کرتے ہیں اور اپنی کتاب ''ژند'' میں اسے مخاطب کرتے ہوئے اس سے سوال کرتے ہیں کہ ''اے دنیا کی تخلیق کرنے والے ہرمز! اے تقدس مآب! اس کائنات اور اس کے ماسوا میں وہ کون سی شے ہے جو سب سے زیادہ قوتوں کی مالک ہے''۔ اللہ تعالیٰ جواب دیتا ہے کہ ''وہ میرا نام ہے''۔ زردشت بت پرستی کی شدید مخالفت کرتے تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہر شخص

کو نیکی کی فطرت پر پیدا کیا ہے لیکن اگر فطرتِ انسانی نیکی کے راستے سے دور جا پڑے اور لوگ گمراہ ہو جائیں تو اللہ تعالیٰ وعظ کہنے والوں اور اپنے رسولوں کو مبعوث کرتا ہے تا کہ وہ گمراہوں کو تلقین و تعلیم کے ذریعے راہِ راست پر لائیں۔ زردشت اپنے آپ کو بھی خدا کا ایسا ہی فرستادہ قرار دیتے تھے۔

زردشت سے ان کے ایک شاگرد نے سوال کیا کہ اے استاد! خدا کیسا ہے؟ زردشت نے آگ کی طرف اشارہ کیا۔ حضرت زردشت کے انتقال کے بعد ان کی تعلیم کو بھی مسخ کر دیا گیا آگ کو خدا بنالیا گیا جسے زردشت نے خدا کی ایک صفت قرار دیا تھا۔ ایک خدا کی بجائے دو خداؤں کا تصور زردشت سے منسوب کر دیا گیا' ایک نیکی اور خیر کا خدا اور دوسرا بدی اور شر کا خدا' آگ کی پرستش کو زردشتی مذہب کا جزوِ اعظم بنالیا گیا حالانکہ حضرت زردشت نے نہ تو دو خداؤں کا تصور پیش کیا تھا اور نہ آگ کی پرستش کا حکم دیا تھا کیونکہ سطورِ بالا میں ان کی تعلیم کا جو خلاصہ پیش کیا گیا ہے یہ تصورات اس سے بالکل متضاد ہیں اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ بعد کے لوگوں کی آمیزش ہے۔

یونانی مذاہب

ایران کے بعد یونان اپنی تہذیب وتمدن اور اپنی علمی ترقی کے لحاظ سے دنیا کے چند انتہائی ترقی یافتہ ممالک میں شمار ہوتا ہے بلکہ یونانی تہذیب کو قدیم ترین تہذیبوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس سرزمین کو فلسفیوں' مفکروں اور مذہبی مصلحین کی سرزمین کہنا غلط نہ ہو گا۔ یونان کے فلسفیوں اور مذہبی مفکرین نے متعدد نظریات پیش کیے جو ایک دوسرے سے مماثل بھی ہیں اور متضاد بھی۔ خدا کی ہستی کے متعلق ان تمام مفکرین نے کسی نہ کسی رنگ میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ان میں سے قدیم یونانی مفکرین میں ''انکس مندر'' (Anaximander) وہ ممتاز مذہبی مصلح ہے جس نے خدا کے وجود کا نظریہ پیش کیا۔ اس کا زمانہ چھ سو سال قبلِ مسیحؑ کا ہے یعنی آج سے تقریباً ڈھائی ہزار سال قبل۔ انکس مندر اس کائنات کو ایک جوہر کی تخلیق اور اس کا عکس قرار دیتا ہے اس کا عقیدہ ہے کہ یہ جوہر حقیقی زمان و مکان کی قیود سے آزاد ہے' اس کی نہ کوئی ابتدا ہے نہ انتہا' یہ ایسی ہستی ہے جس کی

تعریف ممکن ہی نہیں۔اس نے چار عناصر کو تخلیق کیا اور ان عناصر سے یہ کائنات عالم وجود میں آئی۔ یہ ہستی ہر شے کو دیکھتی ہے، ہر بات کو سنتی ہے اور نظامِ کائنات کو قائم و جاری رکھنے کے لئے احکام صادر کرتی ہے۔ گویا انکس مندر خدائے واحد کی ہستی کا قائل تھا اور اسے قادر و توانا بھی قرار دیتا تھا۔ بت پرستی یا اوہام پرستی انکس کی تعلیم میں مطلق نہیں پائی جاتی۔

انکس کے بعد یونان کی سرزمین پر ایک اور مذہبی مفکر و مصلح پیدا ہوا جس کا نام کسینو فانوس تھا۔ یہ حضرت مسیحؑ ناصری کی ولادت سے پانچ سو سال قبل پیدا ہوا۔ کسینو اپنے عہد کا سب سے بڑا موحد تھا۔ اس کا عقیدہ تھا کہ حقیقتِ ازلی ہر قسم کی شرکت سے پاک ہے، کوئی برائی اس سے منسوب نہیں کی جاسکتی، اس میں کوئی کمزوری نہیں پائی جاتی۔ کسینو ہر قسم کی بت پرستی اور دیوی دیوتاؤں کے تخیلات کو رد کرتا ہے۔

کسینو کے بعد یونان نے اس سرزمین کے سب سے عظیم فلسفی اور مذہبی مصلح سقراط کو پیدا کیا۔ اس کا زمانہ 470 قبل مسیحؑ قرار دیا جاتا ہے۔ سقراط نے ستر سال کی عمر پائی اور ابتدائی چند برسوں کو چھوڑ کر باقی زندگی نیکی، پاکیزگی اور تہذیب و شائستگی کی تعلیم و تلقین میں گزار دی۔ وہ اپنے زمانے کا بلکہ یونان کی تاریخ کا سب سے بڑا خدا پرست تھا جس کے اقوال کو اس کے شاگرد افلاطون نے اپنے ''مکالمات'' میں بیان کیا ہے کیونکہ سقراط نے اپنی کوئی تصنیف یادگار نہیں چھوڑی۔ سقراط کے عہد میں خدائے واحد کا تصور مسخ ہو کر بہت سے خداؤں میں منقسم ہو چکا تھا۔ سقراط نے بڑی جرأت مندی سے اعلان کیا کہ ''خدا اپنی ذات میں یکتا و یگانہ ہے، یونان کے لوگوں نے بہت سے خداؤں کا جو نظریہ گھڑ لیا ہے یہ باطل ہے، روح ایک مستقل وجود ہے اور جسم سے الگ ہے، جسم کی موت سے روح کی موت واقع نہیں ہوتی بلکہ یہ جسم کی قید سے آزاد ہو جاتی ہے اس لئے انسان کو مرنے سے خوف زدہ نہیں ہونا چاہئے''۔ سقراط کو ان جرأت مندانہ اور موحدانہ نظریات کی بنا پر حکومتِ وقت نے موت کی سزا دی اور اسے زہر کا پیالہ پلا کر ابدی نیند سلا دیا گیا۔

چینی و جاپانی مذاہب

اب چین اور جاپان کی قدیم اقوام کی تاریخ پر ایک نظر ڈالئے۔ مصر کے مشہور محقق

ومفکر عباس محمود العقاد نے اپنی تحقیقی کتاب ''اللہ'' میں قدیم چینی و جاپانی مذاہب پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ چین کے عظیم روحانی مفکر کنفیوشس نے جس کا زمانہ حضرت مسیحؑ ناصری سے تقریباً پونے پانچ سو سال قبل کا ہے دین کا بڑا واضح تصور پیش کیا جس میں اصنام پرستی یا مظاہر پرستی کا کوئی دخل نہیں تھا۔ اس دین میں والدین کی اطاعت، قرابت داروں اور غربا سے حُسنِ سلوک اور مصائب و آلام میں استقامت کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ کنفیوشس سے بھی قبل چین میں ایک اور مذہبی مصلح کا سراغ ملتا ہے جس کا نام ''لاؤ'' (Laozi) ہے۔ ممکن ہے کہ کنفیوشس کی تعلیم کسی حد تک ''لاؤ'' کے نظریات سے ماخوذ ہو جسے کنفیوشس کی طرح تو شہرت نصیب نہ ہوسکی مگر جس کا مذہب یہ تھا کہ ''جو شخص میرے ساتھ اچھے سلوک سے پیش آئے گا میں بھی اس سے بھلائی کروں گا اور جو شخص میرے ساتھ بدی کا سلوک کرے گا میں اس کے ساتھ بھی بھلائی سے پیش آؤں گا''۔

کنفیوشس اور اس کے پیش رو مذہبی مصلح ''لاؤ'' کی تعلیمات سے صراحتہً خدا کے وجود پر کوئی روشنی نہیں پڑتی مگر ان مصلحین نے جو تعلیم پیش کی ہے اس کی اعلیٰ صداقتیں غمازی کرتی ہیں کہ ان کے پیچھے کوئی بزرگ و برتر ہستی ضرور کارفرما ہے جس کا تصور ان مصلحین نے ضرور پیش کیا ہوگا جو بعد کے لوگوں کے ہاتھوں اپنے اصل خدو خال کھو بیٹھا۔

''تاریخِ اقوامِ عالم'' میں حضرت مسیحؑ ناصری کی ولادت سے دو ہزار سال قبل یعنی آج سے چار ہزار سال پہلے چین کے جو حالات بیان کئے گئے ہیں ان میں صراحت کی گئی ہے کہ چینی اللہ تعالیٰ کی ہستی کے قائل تھے اور ان کا عقیدہ تھا کہ عام انسانوں اور بالخصوص بادشاہ کی غفلت اور کج روی سے دنیا پر بلائیں نازل ہوتی ہیں۔ اس دور میں چینی ایک مخفی طاقت کو حاکمِ اعلیٰ مانتے تھے جو نیکی کا اجر اور بدی کی سزا دیتی ہے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ ہر شخص کو اپنی اصلاح کرنی چاہیئے اور تعلقات و فرائض خوش اسلوبی سے نباہنے چاہئیں اس طرح سب کام ٹھیک چلیں گے۔

چین کی قدیم تاریخوں میں ایک مصلح ''فوہ ہی'' کا ذکر آتا ہے۔ اس نے ایک مسلک کی بنا ڈالی جس کے مطابق والدین کی اطاعت، زندگی گزارنے کے بہترین اصول

اور شوہر اور بیوی کے درمیان مخلصانہ تعلقات کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ اس مسلک کی رو سے اس کائنات کا ایک خالق ہے جسے چینی زبان میں ''شانگ ٹی'' (Schong-Ti) کے نام سے موسوم کیا گیا ہے جو مختلف فرشتوں اور اولیاء کے ذریعے کائنات میں اپنے احکام نافذ کرتا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ چین میں ابتدا ہی سے اللہ تعالیٰ کے وجود کا تصور پیدا ہو گیا تھا مگر کچھ مدت کے بعد شیاطین، بھوت اور دیوی دیوتاؤں کے فرضی وجود بھی تخلیق کر لئے گئے اور ان کی بھی پرستش شروع کر دی گئی۔ اس طرح توحید خالص شرک کے دبیز پردوں کے نیچے دب کر رہ گئی۔

محقق عباس محمود العقاد کی تحقیق کے مطابق جاپان کے لوگ بھی ابتدا میں توحید پرست تھے۔ وہ اس کائنات کا خالق ایک آسمانی باپ کو قرار دیتے تھے ان کا عقیدہ تھا کہ وہ بلا شرکت غیرے اس ساری کائنات کا مالک ہے۔ کچھ مدت گزرنے کے بعد اس آسمانی باپ کی بیوی فرض کر لی گئی اور یہ عقیدہ اختیار کر لیا گیا کہ ان دونوں نے مل کر اس کائنات کو تخلیق کیا۔ اس کے بعد سورج کی عبادت ان کے دین کا جزو بن گئی اور پھر بہت سے دیوی اور دیوتا اس عبادت میں شامل کر لیے گئے۔

ایشیائی مذاہب کے سلسلے میں ممتاز مغربی محقق کالبروک کی تحقیقات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا جس نے ایشیاء کے حالات کی تحقیق سے متعلق ایک کتاب مرتب کی تھی۔ اس کتاب میں ایک باب ''کتاب وید'' پر تبصرے کے لئے مخصوص ہے۔ کالبروک نے وید کے ایک مقام کا انگریزی میں ترجمہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ویدک عقیدے کی رو سے ''اللہ تعالیٰ نے جو اشیاء تخلیق کی ہیں ان میں سے بعض کو بعض پر برتری عطا فرمائی ہے۔ انسان کو چاہئے کہ وہ ان کی عبادت کرے، ان سے دعا کے ذریعے سلامتی حاصل کی جا سکتی ہے۔ ان چیزوں میں ہوا، آگ، پانی، مٹی کے دیوتا، ستارے اور سیارے شامل ہیں۔ ان کے علاوہ اور صفات اور طاقتیں بھی بیان کی گئی ہیں جنہیں مجسم قرار دیا گیا ہے''۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ گو وید کے بعض آریہ مرتبین کے عقائد بگڑ گئے تھے اور ان پر بت پرستی غالب آ گئی تھی مگر اس کے باوجود ان کا بنیادی عقیدہ یہی تھا کہ اس کائنات کی

جملہ اشیاء کا خالق اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ان اشیاء میں سے بعض کو بعض پر برتری حاصل ہونے کی وجہ سے ان کی عبادت کی تلقین کرنا یہ ان آریہ علماء کی اپنی ذہنی اختراع تھی۔

مذاہبِ عرب

ہندوستان، ایران اور عراق کی طرح عربوں کی تاریخ بھی بڑی قدیم ہے۔اس سرزمین پر عاد، ثمود اور عمالقہ جیسی باجبروت قومیں پروان چڑھیں اور اپنی تہذیبی وتمدنی ترقی کی ایسی یادگاریں چھوڑ گئیں جن کے کھنڈرات آج بھی ان کی عظمت کا پتا دیتے ہیں بلکہ تاریخ تو یہاں تک بتاتی ہے کہ دنیا کے سب سے پہلے نبی اور تہذیب وتمدن کے بانی حضرت آدمؑ اپنے وطن عراق سے ہجرت کر کے اسی سرزمین پر تشریف لائے۔یہی وجہ ہے کہ عرب کی قدیم اقوام میں خدا کا تصور ابتدا سے موجود تھا۔''ان اقوام میں سے ایک قدیم قوم حضرت آدمؑ کے فرزند حضرت شیثؑ کو خدا کا نبی قرار دیتی تھی۔اس قوم کے لوگوں کے پاس ایک آسمانی کتاب بھی تھی جسے وہ ''صحیفۂ شیث'' کے نام سے موسوم کرتے تھے''۔
(مراسم العرب قبل الاسلام ص20)

عرب کی انہی قدیم اقوام میں سے ایک قوم تھی جس کے مذہب کو مورخین نے ''صابی مذہب'' کے نام سے یاد کیا ہے۔یہ لوگ دن اور رات میں سات نمازیں پڑھتے تھے اور ان کا طریق نماز مسلمانوں سے ملتا جلتا تھا، یہ لوگ نماز جنازہ بھی پڑھتے تھے، ایک قمری ماہ کے روزے بھی ان کی شریعت میں شامل تھے۔رفتہ رفتہ اس قوم میں ستارہ پرستی نے رواج پا لیا اور ان لوگوں نے ستاروں کی پرستش کے سات عبادت خانے بھی تعمیر کر لئے۔

اس کے ساتھ ساتھ انہی ادوار میں یعنی ظہور اسلام سے صدیوں قبل عرب میں ایک ایسا فرقہ بھی موجود تھا جو خدا کے وجود کا منکر تھا۔یہ نہ بت پرستی کو درست قرار دیتا تھا اور نہ کسی الہامی مذہب کا قائل تھا۔یہ لوگ حشر اور جزا وسزا کے بھی منکر تھے۔''ان کا عقیدہ تھا کہ انسان کا وجود اس دُنیا میں ایک درخت یا جانور کی مانند ہے۔وہ پیدا ہوتا ہے اور پختگی پر پہنچ کر تنزل پکڑتا ہے اور مر جاتا ہے جس طرح کوئی ادنیٰ جانور مر جاتا ہے اور جانوروں کی مانند بالکل نیست ونابود ہو جاتا ہے''۔(مراسم العرب قبل الاسلام ص 23)

گویا ہمارے موجودہ دور کے منکرینِ خدا نے انکارِ خدا کے بارے میں جو نقطۂ نظر اختیار کیا ہے اس کی بنیاد دورِ جاہلیت کے عربوں نے رکھی تھی اور یہ نظریہ نہایت دقیانوسی‘ فرسودہ اور پیش پا افتادہ ہے جس کے پیچھے نہ کوئی فلسفہ ہے نہ فکر بلکہ جہالت اس کی بنیاد ہے مگر اس گروہ کے جاہلانہ نظریے کو بحیثیت مجموعی پذیرائی نصیب نہ ہو سکی اور سرزمین عرب پر ہر دور میں ایسے لوگ موجود رہے جو خدائے واحد کی ہستی کے قائل تھے اور لوگوں میں اپنے عقیدے کی تبلیغ کرتے تھے۔ ’’ان میں سے بعض نے مجددِ مذہب ہونے کا دعویٰ کیا‘‘۔ تاریخ نے ان میں سے چند نام محفوظ کر لئے ہیں مثلاً حنظلہ ابن صفوان‘ خالد ابن سنان‘ اسد ابو کرب‘ اور قیس بن صیداہ۔ یہ لوگ عام اجتماعات میں خدائے واحد کی ہستی پر ایمان لانے اور بت پرستی ترک کرنے کی تبلیغ و تلقین کیا کرتے تھے۔ (مراسم العرب قبل الاسلام ص 29)

مصری مذاہب

ایشیا اور یونان کی طرح مصر بھی انتہائی ترقی یافتہ تہذیب کے آثار پیش کرتا ہے۔ یہ سرزمین اپنے تمدن کے لحاظ سے اقوامِ عالم میں ہمیشہ سے ممتاز رہی ہے۔ یہاں بہت سی تہذیبوں نے جنم لیا۔ یہ ملک اور اس کی اقوام بہت سے نشیب و فراز سے گزریں مگر کائنات کے ایک سرپرست اور خالق و مالک کا عقیدہ مصر میں بھی موجود رہا۔ چنانچہ حضرت مسیح علیہ السلام سے چودہ صدیاں قبل مصر کے لوگ ’’اتون‘‘ (Aton) کی پرستش کرتے تھے اور ’’اتون‘‘ ان کے عقیدے کے مطابق وہ ہستی ہے جس نے سورج کو نور اور روشنی عطا کی ہے۔ ’’اتون‘‘ کی جامع تعریف مصر کے مشہور مفکر و موحد بادشاہ اخناتون (Akhenaton) نے اس طرح کی ہے کہ ’’وہ زندگی کا آغاز کرنے والا ہے اور ہمیشہ زندہ رہنے والا ہے۔ ہر جاندار اسی کے حکم سے اور اسی کی عطا کردہ سانس لے رہا ہے۔ اسی نے زمین کو بچھایا اور آسمان کو ارفع و بلند بنایا۔ وہ ایسی نگاہ کا مالک ہے جو نہایت وسیع ہے‘‘۔

(History of Egypt by James Henry Breasted)

مصر کے بعض کھنڈرات کی کھدائی کے دوران جو تختیاں برآمد ہوئی ہیں ان میں یہ عبارت درج ہے کہ ’’تو نے یہ کائنات پیدا کی تا کہ اے پیدا کرنے والے یہ تجھ سے اپنا

رزق مانگیں۔ اے خدا تیرے فیصلے کیسے حکیمانہ ہیں۔ یہ زمین اور حدِ نگاہ تک پھیلے ہوئے یہ سمندر' ان میں پائے جانے والے لاتعداد جانور سب تیرے پیدا کردہ ہیں اور ان میں چلنے والی کشتیاں تیرے حکم سے تیر رہی ہیں''۔ گویا آج سے ساڑھے تین ہزار سال قبل مصر کی اقوام حتی کہ ان کے طاقتور بادشاہ بھی ایک برتر و اعلیٰ ہستی کو اس کائنات کا خالق تسلیم کرتے اور اس کے سامنے سرِ عبودیت خم کرتے تھے۔

تاریخ سے مصر کی ایک قدیم قوم کا سراغ لگتا ہے جس کا پایۂ تخت ''طب'' نامی شہر تھا' یہ مصر کے اولین بادشاہوں کا زمانہ سمجھا جاتا ہے۔ اس قدیم عہد میں گو مصر میں متعدد خداؤں کا تصور بھی موجود تھا لیکن ان سب پر ایک برتر خدا کا وجود تسلیم کیا جاتا تھا جسے وہ لوگ ''آمن'' کے نام سے موسوم کرتے تھے' اسے کامل و اکمل اور ابدی ہستی قرار دیا جاتا تھا۔ قدیم اہلِ مصر اسے تمام موجودات کا خالق تسلیم کرتے تھے جس کا کوئی خالق نہیں۔ اس خدا کی تعریف میں مصر کے مذہبی پیشوا عبادت کے وقت جو گیت گاتے تھے فرانس کے مشہور محقق ''موسیو سینولیس'' نے اسے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

''اے آمن! اے آسمان کے دونوں کناروں کے خداوند! تو اپنی ذات میں موجود ہے' تیرے ہی نور سے تمام راستے منور ہیں' تو اس بلندی کا مالک ہے جس کو کوئی نہیں چھو سکتا' تو وہ پوشیدہ ہستی ہے جسے کوئی نہیں دیکھ سکتا' تو ہر جاندار کو زندگی بخشتا ہے' تو نے ہی مٹی' سونا' چاندی اور لاجورد پیدا کئے' تو نے جانوروں کے لئے گھاس اور انسانوں کے لئے سبزیاں پیدا کیں' تو مچھلیوں کو دریاؤں میں اور پرندوں کو ہوا میں زندہ رکھتا ہے' ساری نسل انسانی اور آدم کی تمام اولاد تجھے سلام کرتی ہے اور تجھے سجدہ کرتی ہے کیونکہ تو نے ہی ہم سب کو پیدا کیا''۔ (تاریخ ملل قدیمہ مصنفہ موسیو سینولیس۔ فارسی ترجمہ مرزا محمد علی خان ذکاء الملک)

''موسیو سینولیس'' لکھتا ہے کہ بعض لوگوں کی رائے ہے کہ قدیم مصر کے اکابر ایک خدا کے پرستار تھے' ایک سے زیادہ خداؤں کی پرستش عوام الناس کا عقیدہ تھا۔

مشہور محقق اور "History of Egypt" کے مصنف برسٹیڈ (Breasted)
نے مصری مذاہب کی تحقیق کے دوران خدا کے بارے میں ایک ایسے عقیدے کا سراغ لگایا
جسے ہستی باری تعالیٰ کا قدیم ترین عقیدہ کہنا چاہیئے۔ یہ قدیم مصریوں کا سب سے مقبول
عقیدہ ہے جسے وہ ''فتاح'' کے نام سے موسوم کرتے تھے۔ فتاح اہلِ مصر کے عقیدے کی رو
سے ایک ایسی ہستی ہے ''جس کا کوئی ہمسر نہیں' اس کا کوئی جسم نہیں اور نہ وہ ظاہری آنکھوں
سے مشاہدے میں آسکتی ہے۔ کائنات کے ہر ذی روح کا دل' عقل' زبان اور کلمات اس
ہستی ''فتاح'' کی عطا ہیں' اس کے حکم کے بغیر کوئی چیز پیدا نہیں ہوسکتی' جب وہ کوئی عالم یا
کوئی شے تخلیق کرنا چاہتا ہے تو صرف اس کے ذہن میں اس کا خیال آتا ہے اور وہ چیز پیدا
ہو جاتی ہے''۔ ظاہر ہے کہ یہ وہی ہستی ہے جسے ہم اللہ اور خدا کے نام سے موسوم کرتے
ہیں۔ ''فتاح'' کے اس تصور کے ساتھ دیوی دیوتا یا اصنام پرستی کا کوئی تصور موجود نہیں۔
مغربی مورخین نے جن میں برسٹیڈ کا نام سرفہرست ہے اس عقیدے کو طوفانِ نوح سے بھی
پہلے کا عقیدہ قرار دیا ہے اور طوفانِ نوح جدید تحقیق کے مطابق حضرت مسیح ناصری کی
ولادت سے تقریباً تین ہزار سال قبل آیا تھا۔ گویا آج سے پانچ ہزار سال پہلے بھی دنیا میں
ایک ایسی ہستی کا تصور موجود تھا جو تمام اشیا کی خالق ہے اور جس کی ذات وصفات میں کوئی
شریک نہیں۔

یہ ہے دنیا کی قدیم اقوام میں خداوند تعالیٰ کے تصور کا ایک اجمالی جائزہ۔ اس
جائزے سے یہ حقیقت پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ ابتدا میں جو آج سے کم از کم چھ ہزار
سال قبل کا زمانہ ہے دنیا کی قدیم اقوام ایک خدا کے وجود پر ایمان رکھتی تھیں کیونکہ تمام
مذاہب کے بانیوں نے جو ان اقوام میں مبعوث ہوئے خدائے واحد کے وجود اور اس کی
عبادت کی تعلیم دی۔ یہ تعلیم اصنام پرستی اور توہمات سے بالکل پاک تھی مگر بعد کے لوگوں
نے اپنی کم فہمی اور کج فکری سے اس تصور کو مسخ کر دیا اور اس میں دیوی دیوتا اور عناصرِ فطرت
کی پرستش شامل کر لی اس طرح ایک سے زیادہ خداؤں کا تصور پیدا ہو گیا۔ اس کی اصل وجہ
یہ تھی کہ انبیاء اور ان کے مقدس جانشینوں نے سورج' چاند ستاروں' دریاؤں اور پہاڑوں کو

اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نشانیاں قرار دیا۔ ان بزرگوں نے خداوند تعالیٰ کی متعدد صفات بیان کیں جن میں تخلیق کرنا، رزق عطا کرنا، بارش نازل کرنا، بیماریوں سے صحت یاب کرنا، مصائب و آلام سے نجات بخشنا ، سرکش و نافرمان لوگوں کو سزا دینے کی صفات شامل تھیں۔ ان انبیاء اور بزرگانِ دین کے بعد آنے والے لوگوں نے غلطی سے اللہ تعالیٰ کی ان صفات اور اس کے مظاہر کو بھی خداؤں میں شامل کر لیا اور پھر ان کے بت بنا کر ان کی پرستش شروع کر دی جیسا کہ زردشت نے آگ کو خداوند تعالیٰ کی ذات کا مظہر قرار دیا مگر زردشت کے بعد ان کے ماننے والوں نے غلطی سے آگ کو خدا بنا لیا اور اس کی پرستش کرنے لگے۔ اسی طرح فاکس مولر کی تحقیق کے مطابق قدیم ہندی مذہب میں برہما، وشنو اور شیو اللہ تعالیٰ کے صفاتی نام تھے مگر بعد کے ہندو مفکروں نے ان صفات کو بھی خداؤں میں شامل کر کے ان کے بت بنا لیے اور ان کی بھی عبادت شروع کر دی۔ گویا بت پرستی اور توہم پرستی خدا پرستی کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔

عقیدۂ توحید کی عمر

سطورِ گزشتہ میں خدا کے تصور کا جو جائزہ پیش کیا گیا ہے اس کی رو سے عقیدۂ توحید کی عمر چھ ہزار سال ثابت ہوتی ہے یعنی آج سے چھ ہزار سال قبل تک انسان خدائے واحد کی پرستش کرتا تھا۔ اس پر ایک اعتراض پیدا ہوتا ہے کہ کیا بنی نوع انسان کی عمر صرف چھ ہزار سال ہے؟ کیا اس سے پہلے روئے زمین پر انسان کا وجود نہیں تھا؟ یقیناً اس سے پہلے بھی انسان کا وجود تھا لیکن وہ دماغی اور جسمانی دونوں لحاظ سے اس قابل نہ تھا کہ کوئی نظریہ قائم کر سکتا۔ علم الانسانیات کے ماہرین نے اب تک جو تحقیق کی ہے اس کی رو سے آج سے پچاس ہزار سے پچیس ہزار سال قبل تک موجودہ انسانوں کے آباؤ اجداد کے وجود کا سراغ ملتا ہے بلکہ جدید ترین تحقیق کے مطابق آج سے دو لاکھ سال قبل بھی روئے زمین پر انسان موجود تھا مگر وہ انسان اپنی دماغی اور جسمانی ساخت کے لحاظ سے جانوروں سے مشابہ تھا۔ اس کی پیشانی اندر کو دھنسی ہوئی، ٹانگیں چھوٹی اور کمر کی ساخت خمیدہ تھی۔ اس کے دماغ کے سامنے کا خانہ تنگ تھا یعنی ابھی وہ دماغی اور جسمانی نشوونما کے دور سے گزر رہا تھا اور اس

اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نشانیاں قرار دیا۔ ان بزرگوں نے خداوند تعالیٰ کی متعدد صفات بیان کیں جن میں تخلیق کرنا، رزق عطا کرنا، بارش نازل کرنا، بیماریوں سے صحت یاب کرنا، مصائب وآلام سے نجات بخشنا، سرکش ونافرمان لوگوں کوسزا دینے کی صفات شامل تھیں۔ ان انبیاء اور بزرگانِ دین کے بعد آنے والے لوگوں نے غلطی سے اللہ تعالیٰ کی ان صفات اوراس کے مظاہر کو بھی خداؤں میں شامل کرلیا اور پھر ان کے بت بنا کران کی پرستش شروع کردی جیسا کہ زردشت نے آگ کو خداوند تعالیٰ کی ذات کا مظہر قرار دیا مگر زردشت کے بعدان کے ماننے والوں نے غلطی سے آگ کو خدا بنالیا اوراس کی پرستش کرنے لگے۔ اسی طرح فاکس مولر کی تحقیق کے مطابق قدیم ہندی مذہب میں برہما، وشنو اور شیو اللہ تعالیٰ کے صفاتی نام تھے مگر بعد کے ہندو مفکروں نے ان صفات کو بھی خداؤں میں شامل کر کے ان کے بت بنالیے اوران کی بھی عبادت شروع کردی۔ گویا بت پرستی اور توہم پرستی خدا پرستی کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔

عقیدۂ توحید کی عمر

سطورِ گزشتہ میں خدا کے تصور کا جو جائزہ پیش کیا گیا ہے اس کی رو سے عقیدۂ توحید کی عمر چھ ہزار سال ثابت ہوتی ہے یعنی آج سے چھ ہزار سال قبل تک انسان خدائے واحد کی پرستش کرتا تھا۔ اس پر ایک اعتراض پیدا ہوتا ہے کہ کیا بنی نوع انسان کی عمر صرف چھ ہزار سال ہے؟ کیا اس سے پہلے روئے زمین پر انسان کا وجود نہیں تھا؟ یقیناً اس سے پہلے بھی انسان کا وجود تھا لیکن وہ دماغی اور جسمانی دونوں لحاظ سے اس قابل نہ تھا کہ کوئی نظریہ قائم کرسکتا۔ علم الانسانیات کے ماہرین نے اب تک جو تحقیق کی ہے اس کی رو سے آج سے پچاس ہزار سے پچیس ہزار سال قبل تک موجودہ انسانوں کے آباؤاجداد کے وجود کا سراغ ملتا ہے بلکہ جدید ترین تحقیق کے مطابق آج سے دو لاکھ سال قبل بھی روئے زمین پر انسان موجود تھا مگر وہ انسان اپنی دماغی اور جسمانی ساخت کے لحاظ سے جانوروں سے مشابہ تھا۔ اس کی پیشانی اندر کو دھنسی ہوئی، ٹانگیں چھوٹی اور کمر کی ساخت خمیدہ تھی۔ اس کے دماغ کے سامنے کا خانہ تنگ تھا یعنی ابھی وہ دماغی اور جسمانی نشوونما کے دور سے گزر رہا تھا اوراس

میں اتنا شعور ہی پیدا نہیں ہوا تھا کہ وہ نیک و بد میں امتیاز کر سکے۔ وہ ابھی غور وفکر کرنے والے دماغ ہی سے محروم تھا۔ بعض پرانے غاروں میں ایسے انسانی ڈھانچے ملے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ اس دور کا انسان غاروں میں زندگی گزارتا تھا اور موذی جانوروں سے ڈرنے کی بجائے انہیں ہلاک کر دیتا تھا یا کھا جاتا تھا اس لیے اس کے متعلق یہ خیال کرنا کہ وہ جن جانوروں یا اشیاء سے خوف زدہ ہوتا ان کی پرستش کرنے لگتا تھا عقل سے محرومی اور تاریخ سے عدم واقفیت کی دلیل ہے کیونکہ ابھی وہ ذہنی اور دماغی لحاظ سے اس قابل تھا ہی نہیں کہ عبادت کی حقیقت کو سمجھ سکتا اور نہ اسے اتنا ادراک حاصل تھا کہ اگر طاقتور ہستیوں کی عبادت کی جائے تو وہ راضی ہو جاتی ہیں کیونکہ خود منکرینِ خدا کے بقول یہ لوگ وحشی تھے۔ زمانۂ قبل از تاریخ کے بعض غاروں سے جو آثار دریافت ہوئے ہیں ان میں اس عہد کے انسانوں کے ڈھانچے تو ملے ہیں، نوک دار پتھر بھی ملے ہیں جن سے یہ انسان اپنے دشمنوں کا مقابلہ کرتا تھا مگر ایسے کوئی آثار وشواہد نہیں ملے جن سے ثابت ہوتا ہو کہ ابتدائی عہد کے اس انسان میں دیوی دیوتاؤں یا ان کی عبادت کا تصور بھی پایا جاتا تھا۔ تاریخ ایسے دعوے کی ہرگز تائید نہیں کرتی۔

ہزاروں سال بلکہ قریباً دو لاکھ سال گزر جانے کے بعد جب اس وحشی انسان نے دماغی نشوو ارتقا کے مراحل طے کر لیے اور اس میں شعور پیدا ہوا، نیک و بد میں امتیاز کرنے کی صلاحیت نے جنم لیا تو اللہ تعالیٰ نے اس کی راہنمائی کے لیے انبیاء کو بھیجنا شروع کر دیا۔ حضرت آدمؑ پہلے انسان (ا) نہیں بلکہ پہلے نبی تھے جو بنی نوع انسان کو متمدن بنانے اور اسے ایک خالق و مالک سے روشناس کرانے کے لیے مبعوث ہوئے کیونکہ یہ بات عقلاً نادرست ہے کہ اللہ تعالیٰ بنی نوع انسان کو باشعور ہونے کے باوجود ہزاروں سال تک گمراہی میں بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیتا اور جب اس میں گمراہی اچھی طرح رچ بس جاتی اور اس کے ذہن میں جھوٹے اور مصنوعی خداؤں کا عقیدہ پختہ ہو جاتا تب وہ انبیاء کے سلسلے کا آغاز فرماتا، تاکہ گمراہ انسان غلط اور مشرکانہ عقائد ترک کر دے ایسا خیال اللہ تعالیٰ کی صفتِ انصاف سے بھی بعید ہے اس لیے، ہم یہ رائے قائم کرنے کے سوائے اور کوئی چارۂ کار نہیں

پاتے کہ جب انسان نے شعور کی منزل میں قدم رکھا اور اس میں نیک و بد کے درمیان امتیاز کرنے کی صلاحیت پیدا ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے اپنے پہلے نبی حضرت آدمؑ کو مبعوث کیا تاکہ وہ بنی نوع انسان کو تہذیب و تمدن کے اصول سکھانے کے ساتھ ساتھ اسے یہ بھی بتائیں کہ اس کا ایک خالق و مالک بھی ہے جو ساری قوتوں کا مرکز ہے اس لئے اس پر لازم ہے کہ اس کے سامنے سرِ اطاعت خم کرے۔

اب دو امور حل طلب باقی رہ جاتے ہیں، اول حضرت آدمؑ کی بعثت کب ہوئی، دوم ہماری تہذیب و تمدن کی عمر کتنی ہے۔ اس سلسلے میں سب سے مستند اور تحقیقی بیان مشہور محقق اور عالم مسٹر جان، ڈی، ڈیوس کا ہے، جنہوں نے اس موضوع پر بڑی احتیاط سے مندرجہ ذیل اعداد و شمار درج کئے ہیں۔ ان کی تحقیق کی رو سے:

حضرت آدمؑ سے حضرت نوحؑ تک ایک ہزار سال

حضرت نوحؑ سے حضرت ابراہیمؑ تک ایک ہزار سال

حضرت ابراہیمؑ سے حضرت داؤدؑ تک ایک ہزار سال

حضرت داؤدؑ سے حضرت عیسیٰؑ تک ایک ہزار سال (۲)

گویا حضرت آدمؑ سے حضرت عیسیٰؑ کی بعثت تک یہ مدت چار ہزار سال ثابت ہوتی ہے۔ حضرت عیسیٰؑ اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے درمیان چھ سو سال کا فصل ہے اور حضور اقدسؐ کی بعثت کو چودہ سو سال گزر چکے ہیں۔ گویا حضرت عیسیٰؑ کی بعثت سے اس وقت تک تقریباً دو ہزار سال اور گزر چکے ہیں۔ اس طرح حضرت آدمؑ سے آج تک جو مدت گزر چکی ہے اس کا تخمینہ چھ ہزار سال ہوتا ہے پس ثابت ہوا کہ حضرت آدمؑ آج سے قریباً چھ ہزار سال قبل مبعوث ہوئے تھے۔

یہاں یقیناً سوال پیدا ہوگا کہ کیا انسانی تہذیب و تمدن اور عقل و شعور کی عمر چھ ہزار سال ہے؟ اور یہی دوسرا اور سب سے اہم حل طلب مسئلہ ہے۔ جب ہم ماہرین آثار قدیمہ کی آراء کی طرف رجوع کرتے ہیں اور محققین کی تحقیقات کا مطالعہ کرتے ہیں تو مندرجہ ذیل نتائج ہمارے سامنے آتے ہیں۔

(1) فرانس کے ایک فاضل محقق ''لوسیوسینولیس'' نے فرانسیسی زبان میں قدیم اقوام اوران کی تہذیب وتمدن کے بارے میں ایک محققانہ کتاب لکھی تھی۔ایران کے ممتاز عالم مرزا محمد علی خاں ذکاء الملک نے اس کتاب کا فارسی میں ''تاریخِ مللِ قدیمہ'' کے نام سے ترجمہ کیا۔ یہ فرانسیسی محقق قدیم اقوام کی تاریخ تہذیب وتمدن پر طویل ریسرچ کے بعد جس نتیجہ پر پہنچا وہ یہ ہے:

> ''قدیم اقوام میں سے کچھ قومیں آج سے پانچ چھ ہزار سال قبل تہذیب و تمدن سے آراستہ ہوئیں اوراسی زمانے سے ان کی تاریخ کا بھی سراغ لگتا ہے۔بعض قومیں اس مدت کے بعد متمدن دور میں داخل ہوئیں۔ گویا جس عہد سے ہم تاریخی واقعات کا سراغ پاتے ہیں اس کی عمر پانچ یا چھ ہزار سال سے زیادہ نہیں''۔(تاریخِ مللِ قدیمہ۔فارسی ترجمہ مرزا محمد علی خان)

(2) آثارِ قدیمہ کے ماہرین نے انسان کی متمدن زندگی کا کھوج لگاتے ہوئے عراق کا ایک قدیم ترین شہر دریافت کیا ہے جس کا نام جارمو (Jarmo) ہے۔ یہاں ایسے کھنڈرات ملے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ اس دور کے لوگوں کو مکانوں کی چھت ڈالنا آ گیا تھا۔اس شہر کی عمر چھ ہزار سال کے قریب قرار پاتی ہے۔(۳)

اقوام عالم کی تہذیبوں کے بارے میں جو تحقیق کی گئی ہے اور جسے "Pears Cyclopaedia" کے مرتبین نے قابل اعتنا اور مستند قرار دیا اس کی رو سے ان تہذیبوں کی مندرجہ ذیل عمریں ثابت ہوتی ہیں۔

آریائی تہذیب کی عمر	چار ہزار چار سو سال
یونان کی تہذیب کی عمر	چار ہزار آٹھ سو سال
چین کی تہذیب کی عمر	چار ہزار آٹھ سو سال
مصر کی تہذیب کی عمر	پانچ ہزار سال
ایران کی تہذیب کی عمر	چھ ہزار سال

عراق کی تہذیب کی عمر   چھ ہزار سال ☆

ان اعداد و شمار کی روشنی میں دنیا کی قدیم ترین تہذیب کی عمر چھ ہزار سال ثابت ہوتی ہے اور یہ تہذیب عراق کی ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ حضرت آدمؑ کی بعثت بھی عراق میں ہوئی اور یہیں سے ہجرت کر کے آپؑ اس سرزمین پر تشریف لے گئے جو آج مکہ کے مقدس نام سے موسوم ہے۔ یہاں انہوں نے بیت اللہ تعمیر کیا خدا کا سب سے پہلا گھر جس کی بنیادوں پر بعد میں حضرت ابراہیمؑ نے موجودہ بیت اللہ (خانہ کعبہ) تعمیر کیا۔

جیسا کہ گزشتہ صفحات میں بیان کیا جا چکا ہے حضرت آدمؑ کی بعثت بھی آج سے چھ ہزار سال قبل ثابت ہوتی ہے یعنی حضرت آدمؑ انسان کے باشعور ہوتے ہی مبعوث کر دیئے گئے تھے اور انسان کو متمدن بنانے اور خدا کے وجود پر ایمان لانے کی تعلیم سب سے پہلے حضرت آدمؑ کے ذریعے بنی نوع انسان کو دی گئی، مگر ایک نبی کے عہد سے لے کر دوسرے نبی کے عہد تک جو درمیانی مدت گزرتی تھی اس میں خدائے واحد کا عقیدہ مسخ ہو جاتا تھا اور انسان مختلف اشیاء، مظاہر فطرت اور اپنے اسلاف کی پرستش شروع کر دیتا تھا۔ ان مشرکانہ عقائد کی اصلاح کے لئے انبیاء آتے اور بنی نوع انسان کو پھر خدائے واحد کی عبادت کی تعلیم دیتے۔

پس ان حقائق کی روشنی میں یہ دعویٰ غلط ثابت ہوتا ہے کہ انسان ابتدا میں سورج، چاند، خونخوار درندوں اور اپنے اسلاف کی عبادت کرتا تھا اور اسی عقیدے نے بعد میں خدا کی عبادت کا نظریہ اختیار کر لیا بلکہ اس کے برعکس یہ ثابت ہوتا ہے کہ انسانی شعور کی بیداری کے ساتھ ہی انبیاء مبعوث ہونے لگے جنہوں نے بنی نوع انسان کو خدائے واحد کی تعلیم کا تصور دیا اس تصور نے متعدد خداؤں کا روپ بعد میں اختیار کر لیا۔

اس باب کو ختم کرنے سے قبل ایک شبہ کا ازالہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔ گزشتہ سطور میں انسانی شعور اور تہذیب و شائستگی کی عمر چھ ہزار سال قرار دی گئی ہے۔ یہاں ہر سوچنے والے ذہن میں بجا طور پر سوال پیدا ہوگا کہ انسانی شعور اور تہذیب و شائستگی کی عمر اگر چھ

☆ جدید تحقیق کی رو سے آسٹریلیا میں ۲۵ ہزار سال قبل انسان مہذب ہو چکا تھا۔ (مولف)

ہزار سال تسلیم کر لی جائے تو اس سے قبل روئے زمین پر جو نسل انسانی آباد تھی کیا وہ بالکل بے شعور، غیر متمدن اور وحشی تھی اور آج سے ڈیڑھ دو لاکھ سال قبل تک روئے زمین پر کیا بے شعوری اور گمراہی کی حکومت تھی؟ اس سوال کا جواب ہمیں سیدنا حضرت علیؓ بن ابی طالب کے ایک حکیمانہ ارشاد میں مل جاتا ہے چنانچہ تاریخ فرشتہ کے مصنف نے لکھا ہے کہ ایک شخص نے حضرت علیؓ سے پوچھا کہ حضرت آدم علیہ السلام سے قبل کون تھا؟ آپؓ نے جواب دیا آدمؑ۔ اس نے پوچھا اس آدمؑ سے پہلے کون تھا؟ آپؓ نے جواب دیا آدمؑ۔ جب اس نے تیسری بار یہ سوال کیا تو آپؓ نے جواب دیا کہ اگر تو تمیں ہزار بار پوچھے گا تو میرا جواب یہی ہوگا کہ آدمؑ۔ (''تاریخ فرشتہ''۔ مقدمہ مصنف ص ا مطبوعہ منشی نول کشور)

سیدنا علیؓ بن ابی طالب کے اس ارشاد سے ہمارا استدلال یہ ہے کہ جس آدم کی نسل سے ہمارا تعلق ہے اس سے قبل ہزاروں ہزار آدم گزر چکے ہیں اور ہر آدم ایک نئی نسل اور نئی تہذیب کا بانی ہوتا تھا جس کا دور ہزاروں سال پر پھیلا ہوتا تھا۔ اس طرح انسانی تہذیب، انسانی تمدن اور انسانی افکار کی عمر صرف چھ ہزار سال قرار نہیں پاتی بلکہ یہ لاکھوں سال پر مشتمل ہے البتہ ہماری موجودہ نسل اور تہذیب کا آدمؑ آج سے قریباً چھ ہزار سال قبل گزرا تھا۔ اس کتاب کے باب ''ظہورِ آدم'' میں ان امور پر انشا اللہ کسی قدر تفصیل سے بحث کی جائے گی۔

....

حواشی:

(۱) اس موضوع پر انشاء اللہ ہم اس کتاب کے باب ''ظہورِ آدم'' میں تفصیل سے گفتگو کریں گے۔ (مصنف)

(۲) "A dictionaryof Bible" by John D. Davis

(۳) ''سائنس جرنل'' ۲۔ اپریل ۱۹۶۳ء بحوالہ Did man get mere by evolution by creation?

⌘⌘⌘

خدا کی ہستی پر اعتراضات

کچھ مدت قبل ایک کتاب "A Glance at Historical Materialism" کے نام سے شائع ہوئی تھی جس کا اردو میں ترجمہ یوں ہو سکتا ہے، ''تاریخ مادیت پر ایک نظر''۔ اس کتاب میں خدا اور مذہب پر بہت سے اعتراضات کیے گئے ہیں۔ ان اعتراضات میں سے ایک بڑا اعتراض یہ ہے کہ خدا اور مذہب کے مفروضات حکمراں اور جاگیردار طبقے نے غریب اور مزدور طبقے پر اپنی گرفت مضبوط رکھنے کے لئے گھڑ لئے ہیں۔ اس طرح اول الذکر طبقہ خدا اور مذہب کا نام لے کر غریبوں اور محنت کشوں کو خوفزدہ کرتا اور انہیں عالم آخرت کے سبز باغ دکھا کر اپنا غلام بنائے رکھتا ہے اور خدا کا تصور پیش کرنے والے اس ظلم میں حکمرانوں اور جاگیرداروں کے معاون ثابت ہوتے ہیں۔

خدا کا تصور حکمرانوں کی ایجاد ہے؟

آیئے اس اعتراض کا تاریخ کی روشنی میں جائزہ لیں۔ مذاہب عالم پر ایک طائرانہ نظر ڈالنے سے بھی یہ حقیقت عیاں ہو جاتی ہے کہ جتنے مدعیان نبوت اور مذہبی مصلح خدا اور مذہب کا تصور لے کر کھڑے ہوئے ان میں سے بیشتر کا سب سے پہلا تصادم حکمرانوں اور سرمایہ داروں سے ہوا اور ان میں سے ہر داعئ مذہب اور مصلح پر پہلا اعتراض یہی کیا گیا کہ یہ عوام کو حکمران طبقے کے خلاف بھڑکاتا ہے اور مروجہ عقائد و نظریات کی تکذیب کرتا ہے۔

حضرت آدمؑ کے بعد دنیا میں جو انبیاء مبعوث ہوئے ان میں حضرت نوحؑ قدیم ترین انبیاء میں سب سے جلیل القدر نبی تھے جن کے سب سے زیادہ واقعات تاریخ میں محفوظ ہیں۔ چنانچہ قرآن حکیم ہمیں اطلاع دیتا ہے کہ

لقد ارسلنا نوحاً الی قومه فقال یقوم اعبدوا الله مالکم من اله غیره ۔الخ (الاعراف آیت۔۵۹)

''ہم نے نوح کو ان کی قوم کی طرف رسول بنا کر بھیجا تھا اور انہوں نے اپنی قوم سے کہا کہ اے میری قوم! تم اللہ کی عبادت کرو اس کے سوائے کوئی تمہارا معبود نہیں۔ مجھے تم پر ایک بڑے خوفناک دن کے عذاب کا اندیشہ ہے (اس پر) اس کی قوم کے سرداروں نے کہا کہ اے نوح ہم تجھے صریح گمراہی میں پاتے ہیں''۔

آگے چل کر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ

ویصنع الفلك و کلمامر علیه ملامن قومه سخرومنه۔ الخ (سورہ ہود آیت نمبر ۳۸)

''جب نوح کشتی بنا رہے تھے اور ان کی قوم کے رئیسوں اور سرداروں کا کوئی گروہ ادھر سے گزرتا تو ان کا مضحکہ اڑاتا''۔

گویا دنیا کے قدیم نبی حضرت نوحؑ جن سے روئے زمین کے ایک بڑے حصے پر نسل انسانی کا از سرِ نو آغاز ہوا سب سے زیادہ اپنی قوم کے سرداروں کی مخالفت کا نشانہ بنے اور آپ کا سب سے پہلا اور آخری تصادم مال دار گروہ سے ہوا۔

اسی طرح یہ سلسلہ جاری رہا اور دنیا میں جب کوئی نبی مبعوث ہوتا اور لوگوں کو خدائے واحد کی طرف بلاتا، اس کی پرزور مخالفت کی جاتی اور اس مخالفت میں پیش پیش سرداروں، رئیسوں اور قوم کے ذی اثر لوگوں کا طبقہ ہوتا۔ حضرت نوحؑ کے بعد آپ کی نسل میں ایک عظیم المرتبت نبی حضرت ہود علیہ السلام پیدا ہوئے۔ قرآن حکیم نے ان کے جو حالات بیان کیے ہیں ان سے ثابت ہوتا ہے کہ خدا کے اس نبی کی مخالفت بھی سردارانِ قوم ہی نے کی۔ چنانچہ قرآن حکیم کی رو سے اللہ تعالیٰ نے جب حضرت ہود علیہ السلام کو ان کی

قوم کی طرف رسول بنا کر بھیجا اور انہوں نے اپنی قوم سے کہا کہ اے لوگو! تم اللہ کے سوائے اور کسی کی عبادت مت کرو کیونکہ صرف وہی معبود حقیقی ہے تو آپؑ کی قوم کے سرداروں ہی نے آپؑ کی مخالفت کی اور کہا کہ "اے ہود! تو چاہتا ہے کہ ہم ان کی عبادت ترک کر دیں جن کی ہمارے باپ دادا پرستش کیا کرتے تھے اور تیرے ایک خدا کی عبادت کریں۔ (سورہ الاعراف آیت نمبر ۷۰)

اسی طرح جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا کہ اے لوگو! اپنے ہاتھ سے تراشے ہوئے بتوں کی عبادت کرنے کی بجائے اس ہستی کی عبادت کرو جو ساری مخلوق کی خالق ہے تو آپؑ کی سب سے زیادہ مخالفت حاکم وقت نمرود اور اس کے درباری امراء ہی نے کی اور آپؑ کو ہلاک کرنے کی غرض سے آگ میں پھینک دیا۔

جب حضرت شعیب علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا کہ اے لوگو! اللہ کی عبادت کرو جس کے سوائے کوئی معبود نہیں اور ماپ تول میں کمی نہ کیا کرو تو قوم کے سرداروں ہی نے حضرت شعیب علیہ السلام کی مخالفت کی اور کہا کہ "اے شعیب! ہم تجھے اور تیری پیروی کرنے والوں کو ملک سے نکال دیں گے۔ اگر تو ہمارے عقائد کی طرف واپس نہ آیا"۔ (سورہ الاعراف آیت نمبر ۸۸)

جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کے دربار میں جا کر اسے خدائے واحد کا پیغام دیا اور مطالبہ کیا کہ بنی اسرائیل پر ظلم وستم بند کر دو اور انہیں میرے ساتھ جانے کی اجازت دو تو حاکم مصر فرعون اور اس کے امراء قارون وہامان ہی نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ایذا پہنچانے حتیٰ کہ گرفتار کر کے آپؑ کو قتل کر ڈالنے کے لئے اپنے لشکروں کے ساتھ آپؑ کا تعاقب کیا۔

یونان کے روحانی پیشوا سقراطؒ نے جب معبودانِ باطلہ کی بجائے خدائے واحد کا تصور پیش کیا تو حاکم وقت اور اس کے بااثر حاشیہ برداروں ہی نے سقراط پر الزام لگایا کہ یہ نوجوانوں کے عقائد بگاڑ رہا ہے اور مملکت کے آئین کو پامال کر رہا ہے چنانچہ اسی جرم بے گناہی میں اس مردِ خداشناس کو زہر کا پیالہ پلا کر موت کی نیند سلا دیا گیا۔

جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے قوم کو دین حق کی طرف بلایا اور زمین پر آسمانی بادشاہت کا اعلان کیا تو آپؑ سے سب سے زیادہ خطرہ قوم کے اکابر اور حاکم وقت ہی نے محسوس کیا اور انہی کے مشورے سے آپؑ کو صلیب دے کر ہلاک کرنے کی ناکام کوشش کی گئی۔

آخر میں جب ہادیٔ برحق حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قریش مکہ کو بے جان بتوں کی پرستش کرنے کی بجائے خدائے قادر وتوانا کی عبادت کرنے کی تلقین فرمائی تو یہ مکہ کے رئیس اور سرمایہ دار ہی تھے جنہوں نے حضور ؐاقدس کی اس حد تک مخالفت کی کہ آپؐ کے قتل کے درپے ہو گئے اور آپؐ کو جلاوطن ہونے پر مجبور کر دیا۔ دولت کے نشے میں مخمور مکہ کے ایک رئیس نے یہ کہہ کر حضور ؐاقدس کی غربت پر طنز کیا کہ:

''جسے سفر کے لئے گدھی بھی میسر نہیں کیا خدا کو اس کے سوائے رسول بنانے کے لئے کوئی اور نہیں ملتا تھا''۔ (النبی الخاتم از مولانا مناظر احسن گیلانی)

تاریخ کے ان مسلمہ حقائق کی روشنی میں کوئی نافہم یا متعصب شخص ہی اس اعتراض کی تائید کرے گا کہ خدا اور مذہب کا تصور بادشاہوں اور جاگیرداروں کے ایماء پر پیش کیا گیا اور اس کا مقصد غریبوں اور مظلوموں پر حکمران طبقے کی گرفت مضبوط رکھنا ہے۔ بانیان مذاہب کے اس پورے سلسلے میں کہیں ایسا نہیں ہوا کہ خدائے واحد اور مذہب کا تصور پیش کرنے والوں کی غربا اور محنت کش طبقے نے بھی مخالفت کی ہو اور یہ اعتراض کیا ہو کہ اللہ کے دین کی طرف دعوت دینے والا یہ شخص تو بادشاہ وقت یا امیروں اور جاگیرداروں کا ایجنٹ ہے اور ان کے مفادات کے لئے کام کر رہا ہے۔ اگر حکمران اور جاگیردار خدا اور مذہب کا تصور پیش کرنے والوں کو غریبوں اور مظلوموں کے استحصال کے لئے استعمال کرتے تو یہ طبقہ کبھی ان کی حمایت نہ کرتا جب کہ ہم دیکھتے ہیں کہ انبیاء کی دعوت پر لبیک سب سے پہلے ہمیشہ مظلوم طبقے ہی نے کہی۔ چنانچہ حضرت نوح علیہ السلام کے بارے میں قرآن حکیم بیان کرتا ہے کہ قوم کے سردار حضرت نوحؑ سے کہا کرتے تھے کہ ''ہم دیکھتے ہیں کہ تمہارے ساتھ تو وہی لوگ ہیں جو ہم میں سے رذیل اور موٹی عقل کے ہیں''۔ (سورہ ہود۔ آیت نمبر ۲۷)

پھر فرماتا ہے کہ (حضرت) ''صالح پر جولوگ ایمان لائے وہ کمزور اور غریب تھے''۔(سورہ الاعراف آیت نمبر ۷۵)

اسی طرح حضرت مسیحؑ ناصری نے غریبوں اور کچلے ہوئے لوگوں کو بشارت دی کہ ''خداوند کا روح مجھ پر ہے اس لئے کہ اس نے مجھے غریبوں کو خوشخبری دینے کے لئے مسح کیا ہے۔اس نے بھیجا ہے کہ قیدیوں کو رہائی (دوں) اور کچلے ہوؤں کو آزاد کروں''۔(لوقا کی انجیل باب نمبر ۱۴)

جب حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بادشاہ روم ہرقل کو تبلیغی خط روانہ کیا اور اس کے دربار میں یہ خط پڑھا گیا تو اس نے ابوسفیان کو جو ان دنوں تجارت کے سلسلے میں ''ایلیا'' میں مقیم تھا اپنے حضور طلب کیا اور حقیقتِ حال معلوم کرنے کے لئے اس سے متعدد سوالات کیے جن میں سے ایک سوال یہ تھا کہ ''یہ بتاؤ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر ایمان لانے والوں میں غرباء اور مساکین زیادہ ہیں یا امراء اور بڑے لوگ''۔ابوسفیان نے جواب دیا کہ ''اس کے ماننے والوں میں غریب اور حقیر لوگ زیادہ ہیں''۔(تاریخ ابن کثیر)۔حضرت مسیحؑ ناصری کو جن لوگوں نے ابتداء میں قبول کیا اور سب سے پہلے آپؑ کی آواز پر لبیک کہی ان میں ایک یا دو کے سوائے کوئی جاگیردار، رئیس قوم، اور سردار شامل نہیں تھا۔کچھ مفلوک الحال مچھیرے اور غریب دھوبی تھے جو آپؑ پر ایمان لائے اور آپؑ کی نبوت کی تصدیق کی۔

ان حقائق کی روشنی میں یہ دعویٰ غلط ثابت ہوتا ہے کہ خدا اور مذہب کا تصور اس لئے پیش کیا گیا تھا کہ بادشاہ اور جاگیردار مظلوم اور غریب طبقے کو استحصال کا نشانہ بناسکیں۔ حقیقت اس کے برعکس ہے۔خدا اور مذہب کا تصور پیش کرنے والی مقدس ہستیوں کو تو سب سے پہلے غریبوں اور مظلوموں نے قبول کیا، خدا کے ان فرستادوں نے حق وانصاف کو سربلند فرمایا اور غریبوں اور مظلوموں کو نہ صرف ظالم حکمرانوں اور جابر امراء کے استحصال سے نجات دلائی بلکہ ان مظلوموں کی خاطر سینہ سپر ہو گئے تاریخ تو یہی کہتی ہے۔

خدا کا تصور بے عملی پیدا کرتا ہے؟

منکرین خدا، اللہ تعالیٰ اور مذہب پر ایک اعتراض یہ کرتے ہیں کہ ان کے پیش کردہ تصورات سے انسان میں بے عملی کی کیفیات جنم لیتی ہیں، وہ خدا کی تقدیر پر قناعت کر کے بیٹھ جاتا ہے اس طرح مذہب غرباء کو صبر و شکر کی تلقین کر کے انہیں ظالم حکمرانوں اور سرمایہ داروں کے مظالم کے مقابلے میں جدوجہد کرنے سے باز رکھتا ہے۔

اگر مذاہب عالم اور بانیان مذاہب کی جدوجہد کی تاریخ محفوظ نہ ہوتی تو شاید ان اعتراضات کو درست تسلیم کر لیا جاتا مگر اب جبکہ ادیان عالم کی تاریخ کا ایک ایک واقعہ محفوظ ہے اور ایک ایسی کتاب موجود ہے جس کا دعویٰ ہے کہ اس میں قیامت تک ایک نقطے کی تبدیلی نہیں ہو سکتی تو ان اعتراضات کی کوئی حیثیت باقی نہیں رہتی۔ تاریخ شہادت دیتی ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر محمد عربی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک جتنے انبیاء معبوث ہوئے ان سب نے بنی نوع انسان کو اللہ تعالیٰ کی ہستی پر ایمان لانے کے بعد جس امر کی سب سے زیادہ تلقین کی وہ عمل اور جدوجہد ہے۔ خود ان انبیاء کی مقدس زندگیاں عمل اور پیہم عمل کے بے مثال مرقعے ہیں۔ مذہب بے عمل راہبوں، تارک الدنیا جوگیوں اور خانقاہ نشیں صوفیوں کے تصورات کا نام نہیں۔ بدقسمتی سے مغرب میں کلیسیائی نظام اور مشرق میں ہندو جوگیوں اور بعض نام نہاد مسلمان صوفیوں کے تصورات کو منکرین خدا نے مذہب قرار دے دیا ہے۔ اگر وہ باریک بینی سے مذہب کی تاریخ کا مطالعہ کرتے اور انقلابات عالم کا جائزہ لیتے تو اس قسم کے اعتراضات کبھی پیدا نہ ہوتے۔

ہندوستان کا قدیم روحانی پیشوا مہاتما گوتم بدھ ایک ہندو یوگی سے سوال کرتا ہے کہ "آپ اپنے جسم کو سخت دکھوں میں ڈال کر بقول خود نجات حاصل کر چکے ہیں۔ میں بھی مدت دراز سے ان پہاڑوں میں سرگرداں ہوں اور آپ ہی کی طرح ریاضتیں کر رہا ہوں مگر مجھے تو اس سے کچھ حاصل نہیں ہوا۔ میں آپ سے دریافت کرتا ہوں کہ کیا قلیل کھانا کھانے، ننگے رہنے، دنیا کو ترک کر دینے اور خود کو تکلیف دینے سے نجات حاصل ہوتی ہے؟ مہاراج!

زمانہ جو صدمات ہمیں پہنچاتا ہے کیا وہ کم ہیں کہ ہم اور صدمات جمع کر کے اپنی زندگی کو غم و اندوہ کی آماجگاہ بنالیں۔ اگر کم کھانے یا فاقے کرنے سے نجات حاصل ہو سکتی ہے تو گھاس پات، مردار، ہڈیاں اور اسی قسم کی گھٹیا چیزیں کھانے والے جانوروں کو ہم سے کہیں زیادہ روحانی اور نجات یافتہ ہونا چاہئے۔ اگر جسمانی تکلیف برداشت کرنے اور غم زدہ رہنے سے نجات مل سکتی ہے تو بیلوں، گدھوں اور اسی قسم کے دوسرے جانوروں کو تو روحانی لحاظ سے بہت بلند ہونا چاہئے جن کو ان کے مالکوں سے سخت اذیتیں پہنچتی ہیں''۔

مہاتما بدھ ہندو یوگی سے مناظرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

''مہاراج! جس بدن کے ساتھ آپ اتنی دشمنی کر رہے ہیں یہی تو روح کو منزل کی طرف لے جانے کا ذریعہ ہے۔ یہ بدن تو ایک قیام گاہ ہے جس میں ہماری روح مقیم ہے' یہ صانع کی صنعت گری کا ایک عمدہ نمونہ ہے' اس صنعت کو دیکھ کر آپ کو اس کے بنانے والے کی حمد کرنا چاہیے اور اس کے عطا کیے ہوئے اس جسم کی حفاظت کرنی چاہئے''۔

ایک روز مہاتما بدھ نے اپنی بہن کو درس حیات دیتے ہوئے کہا:

''عمل ہی وہ چیز ہے جو فقیر کو تخت شاہی پر بٹھا دیتا ہے اور بادشاہ کو فقیر بنا دیتا ہے۔ عمل ہی پستی کو بلندی اور بلندی کو پستی میں بدل دیتا ہے۔ اگر تم نیک اعمال سرانجام دیتی ہو تو آئندہ زندگی میں اپنے آپ کو اس سے کہیں زیادہ نیک پاؤ گی۔ تمہارا دکھ اور غم خود تمہارا پیدا کردہ ہے۔ تمہاری زندگی اور موت جو کچھ ہے سب تمہارے اعمال کا نتیجہ ہے، اپنے نفع و نقصان دونوں کے ہم خود ذمہ دار ہیں۔ نیک اعمال سے نجات حاصل ہوتی ہے۔ جو شخص اپنے پیروں پر خود کلہاڑی مارتا ہے قدرت اسے معاف نہیں کرتی۔ مقدس کتابوں میں بیان کیا گیا ہے کہ ہم جو کچھ نظر آ رہے ہیں اپنے اعمال کا نتیجہ ہیں۔ ہم وہی کاٹ رہے ہیں جو بو چکے ہیں ہمارے موجودہ عمل ہی ہماری آئندہ سرنوشت ہے۔ اگر ہم اپنی دنیاوی زندگی میں اعمال بد کی بیخ کنی کر دیں اور نیکی کی تخم ریزی کر کے پوری استقامت اور ارادے کی پختگی سے اس تخم کی آبیاری کریں تو ہماری موت زندگی بن جائے گی''۔ (''دی لائٹ آف ایشیا'' مؤلفہ ایڈن آرنلڈ سے ماخوذ)

ہمارے خیال میں ہندوستان کے اس قدیم روحانی پیشوا اور مذہب کے داعی نے زندگی کا جو درس دیا ہے دنیا کا بڑے سے بڑا مادہ پرست عمل کی اس سے بہتر منطق تلقین نہیں کر سکتا۔ مہاتما بدھ ہماری ساری زندگی کو عمل کا ایک سفر مسلسل قرار دیتے ہیں۔ وہ صرف مجرد عمل کی تلقین نہیں کرتے بلکہ حسن عمل کا پیغام دیتے ہیں۔ کیا اب بھی کہا جائے گا کہ مذہب اور خدا کا تصور پیش کرنے والے عمل سے فرار کا درس دیتے ہیں؟

غلامی قوموں کو ذہنی و فکری اور عملی لحاظ سے مفلوج کر دیتی ہے۔ غلام قوم بعض دفعہ غیرت وحمیت سے محروم ہو جاتی ہے۔ عزت نفس کا تصور اس کے ذہنوں سے معدوم ہو جاتا ہے۔ اسی لئے خدا اور مذہب کا تصور پیش کرنے والے تمام بانیان مذاہب نے غلامی کے خلاف جہاد کیا' وہ غلامی خواہ بتوں کی ہو یا انسانوں کی۔ بنو اسرائیل کو فراعین مصر نے صدیوں سے غلام بنا رکھا تھا' وہ ان پر ہر قسم کا انسانیت سوز سلوک روا رکھتے تھے۔ اس طویل غلامی نے بنو اسرائیل کے قوائے عمل مفلوج کر دیئے تھے اور سب سے بڑا المیہ یہ تھا کہ وہ اپنی اس حالت پر قانع ہو گئے تھے۔ سلسلۂ ابراہیمی کے جلیل القدر نبی حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کو للکارا۔ آپؑ نے سال ہا سال کی جدوجہد سے بنو اسرائیل کے جذبۂ حمیت وغیرت کو بیدار کیا' انہیں منظم کیا اور بنو اسرائیل کا یہ سارا دور جہد وعمل کی ناقابل فراموش داستان ہے۔ یہیں حضرت موسیٰؑ کو وہ شریعت دی گئی جس کا ایک ایک لفظ عمل اور مسلسل عمل کی دستاویز ہے۔ کوہ طور پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جو مقدس الواح عطا کی گئیں ان میں لکھا ہے کہ:

''بنو اسرائیل سے کہہ کہ میں خداوند تمہارا خدا ہوں تم ملک مصر کے سے کام جس میں تم رہتے تھے نہ کرنا اور ملک کنعان جیسے کام جہاں میں تمہیں لیے جا رہا ہوں نہ کرنا اور نہ ان کی رسموں پر چلنا۔ تم میرے حکموں پر عمل کرنا اور میرے آئین کو مان کر ان پر چلنا.....
جن پر اگر کوئی عمل کرے تو وہ ان ہی کی بدولت جیتا رہے گا۔ اور جب تم اپنی زمین کی پیداوار کی فصل کاٹو تو اپنے کھیت کے کونے کونے تک پورا پورا نہ کاٹنا اور نہ کٹائی کی گری پڑی بالوں کو چن لینا اور نہ تو اپنے انگورستان کا دانہ دانہ توڑ لینا اور نہ اپنے انگورستان کے گرے ہوئے

دانوں کو جمع کرنا۔ ان کو غریبوں اور مسافروں کے لئے چھوڑ دینا۔ میں خداوند تمہارا خدا ہوں۔ تم چوری نہ کرنا اور نہ دغا دینا اور نہ ایک دوسرے سے جھوٹ بولنا اور تم میرا نام لے کر جھوٹی قسم نہ کھانا.... تو اپنے پڑوسی پر ظلم نہ کرنا نہ اسے لوٹنا۔ مزدور کی مزدوری تیرے پاس ساری رات صبح تک نہ رہنے پائے..... تم فیصلے میں ناراستی نہ کرنا نہ تو غریب آدمی کی رعایت کرنا اور نہ بڑے آدمی کا لحاظ بلکہ راستی کے ساتھ اپنے ہمسائے کا انصاف کرنا....... نہ جادو منتر کرنا نہ شگون نکالنا..... اگر کوئی پردیسی تیرے ساتھ تمہارے ملک میں بودوباش کرتا ہو تو تم اسے آزار نہ پہنچانا بلکہ جو پردیسی تمہارے ساتھ رہتا ہو اسے دیسی کی مانند سمجھنا بلکہ اس سے اپنی مانند محبت کرنا.... تم انصاف اور پیمائش اور وزن اور پیمانے میں ناراستی نہ کرنا۔

اگر تم میری شریعت پر چلو اور میرے حکموں کو مانو اور ان پر عمل کرو..... تم اپنے دشمنوں کا پیچھا کرو گے اور وہ تمہارے آگے آگے تلوار سے مارے جائیں گے اور تمہارے پانچ آدمی سو کو رگیدیں گے اور تمہارے سو آدمی دس ہزار کو کھدیڑیں گے اور تمہارے دشمن تلوار سے تمہارے آگے آگے مارے جائیں گے''۔ (کتاب مقدس، عہد نامۂ قدیم باب احبار)

خدا اور مذہب کا تصور پیش کرنے والے اس مقدس نبی نے اپنی قوم کے سامنے جو تعلیم پیش کی اس کی رو سے لوگوں کو بدکاریوں سے روکا گیا، اللہ تعالیٰ کے احکام پر ایمان لا کر ان پر عمل کرنے کی ہدایت کی گئی، دوسروں کی محنت پر تکیہ کرنے کی بجائے خود محنت کرنے، زمین جوتنے، فصل بونے اور فصل کاٹنے کی تلقین کی گئی، اس فصل میں سے غرباء و مساکین کا حصہ مقرر کیا گیا، ہمسایوں سے حسن سلوک کرنے کی ہدایت کی گئی، مزدور کو محنت کرنے اور کام لینے والے کو محنت کش کا حق جلد سے جلد ادا کرنے کی تاکید کی گئی۔ ماپ تول کے پیمانے درست رکھنے کا حکم دیا گیا، جادو ٹونے اور شگون لینے یعنی توہمات کو لغو قرار دیا گیا، غیر ملکیوں کے ساتھ بھی اپنے بھائیوں جیسا سلوک کرنے کی تلقین کی گئی، انصاف کرتے وقت امیر اور غریب، چھوٹے اور بڑے میں امتیاز روا رکھنے سے سختی کے ساتھ روکا گیا، دشمن سے جنگ کے وقت ثبات و پامردی دکھانے کی تاکید کی گئی اور عزم و ہمت میں بلندی و

استقامت پیدا کرنے کے لئے بشارت دی گئی کہ تم اپنے سے بیس گنا دشمن کو تہہ وتیغ کر کے اس پر فتح پاؤ گے۔ کیا یہ تعلیم اور یہ تصورات قوموں میں بے عملی پیدا کرتے ہیں؟ انہیں گوشہ نشینی سکھاتے ہیں؟ یا انسان کو عمل اور مسلسل عمل کا درس دیتے ہیں۔ عمل بھی ایسا جو بنی نوع انسان کی زندگی کو امن وراحت کا گہوارہ بنادے۔ ہر ذی فہم اور منصف مزاج خود اس کا فیصلہ کر سکتا ہے۔

دین موسوی کے بعد اسلام وہ دین کامل ہے جس نے عمل کا بلند ترین تصور پیش کیا۔ توہمات، ترکِ دنیا، بے عملی اور بدعملی کے سارے بت پاش پاش کر دیئے اور ایک ایسے پاکیزہ معاشرہ کا تصور دیا جس کا ہر فرد فعال اور متحرک نظر آئے۔ خود رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مقدس زندگی جہد وعمل اور ثبات واستقلال کا بے مثال مرقع ہے۔ آپؐ نے خدائے واحد کا پیغام اس کے بندوں تک پہنچانے کے لئے جن حالات میں اپنے مقدس مشن کا آغاز کیا وہ انتہائی نامساعد اور حوصلہ شکن تھے۔ ابتدا میں آپؐ کے گھر کے چند افراد کے سوائے کوئی آپؐ کا حامی ومددگار نہ تھا۔ آپؐ کا دامن زر وجواہر سے بھی خالی تھا، سرداری اور ظاہری وجاہت میں سے کوئی چیز آپؐ کے پاس نہ تھی۔ مکہ کے سردار آپؐ کے مخالف تھے اور آپؐ کے وجود کو اپنے لئے چیلنج سمجھتے تھے۔ قدم قدم پر مخالفتوں کے پہاڑ آپؐ کی راہ میں حائل تھے مگر مخالفتوں کے یہ طوفان حضورؐ کی راہِ عمل کو مسدود نہ کر سکے۔ آپؐ نے مخالفت کی شدید آندھیوں میں حق کا چراغ روشن رکھا اور مکہ سے طائف تک خدا کے دین کی منادی کی۔ اس راہ میں آپؐ کا مضحکہ اڑایا گیا، دل آزار فقرے کسے گئے، پتھر برسائے گئے حتیٰ کہ آپؐ لہولہان ہو کر فرش خاک پر گر پڑے مگر آپ کے عزم بلند اور عمل پیہم میں ذرہ برابر کمی نہ آئی۔ آپؐ کو آپؐ کے متبعین کے ساتھ ایک دو دن یا ایک دو ماہ نہیں بلکہ مسلسل تین سال تک ایک گھاٹی میں محصور کر دیا گیا جہاں کھانے پینے کی کوئی چیز باہر سے نہیں پہنچتی تھی۔ آپؐ اور آپؐ کے ساتھی پتے کھا کھا کر اور درختوں کی جڑوں کو کوٹ کوٹ کر اور ان کا پانی پی پی کر زندگی گزارتے رہے مگر یہ مصائب بھی حضورؐ کے پائے عمل میں معمولی سی لغزش پیدا نہ کر سکے۔ آپؐ نے اپنے محبوب وطن کو خیر باد کہہ دیا۔ نہایت پر خطر اور مخدوش سفر اختیار کیا

جس میں آپؐ کے ایک رفیق (حضرت ابوبکر صدیقؓ) کے سوائے اور کوئی آپؐ کے ساتھ نہ تھا۔ وطن سے سینکڑوں میل دور جا کر ایک نئی دنیا آباد کی۔ یہ نئی دنیا بھی نئے نئے مصائب و آلام کی آماجگاہ ثابت ہوئی اور آپؐ کے دشمنوں نے یہاں بھی آپؐ کو چین نہ لینے دیا مگر حضورؐ اقدس نے اپنے عمل کا سفر جاری رکھا اور جب تک خدا کا دین سارے عرب میں نہ پھیل گیا اور آپؐ نے خدا اور اس کے بندوں سے اس کی شہادت نہ لے لی کہ اس پیکرِ عزم و عمل نے فرض رسالت کو کما حقہ ادا کر دیا ہے یا نہیں؟ اس وقت تک اپنی بساط عمل کو نہ لپیٹا بلکہ زندگی کے آخری لمحے تک حرکت و عمل کا سفر جاری رکھا۔

تاریخ کی یہ ایسی صداقتیں ہیں جن کا کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا۔ حضورؐ کی متحرک اور فعال زندگی کی طرح آپؐ پر نازل ہونے والی شریعت بھی حرکت و عمل کا درس دیتی ہے اور قرآن حکیم میں قریباً دو سو مقامات پر بنی نوع انسان کو عمل کی تلقین فرمائی گئی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:۔

لیس للانسان الا ما سعیٰo (سورہ النجم آیت نمبر ۳۹) ''انسان کو اتنا ہی حاصل ہوتا ہے جتنی اس نے کوشش کی ہو''۔

و اعدو الھم ما استطعتم من قوۃ و من رباط الخیل ترھبون به عدو اللہ و عدو کم (سورہ الانفال آیت نمبر ۶۰) ''تم سے جہاں تک ہو سکے اپنی قوت بڑھاؤ اور اپنے گھوڑوں کو جنگ کے لئے تیار رکھو تا کہ ان کے ذریعے تم اپنے دشمن پر رعب ڈال سکو جو اللہ کے بھی دشمن ہیں اور تمہارے بھی''۔

ولا تھنو ولا تحزنوا و انتم الاعلون ان کنتم مومنین o (سورہ آل عمران آیت نمبر ۱۳۹) ''اپنے آپ کو ذلیل خیال مت کرو اور نہ رنجیدہ ہو تم ہی سب پر غالب آؤ گے اگر تم صاحب ایمان ہو''۔

والذین امنوا و عملو الصلحت لنکفرن عنھم سیاتھمo (سورہ العنکبوت آیت نمبر ۷) ''اور جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک اعمال سرانجام دیئے ہم ان کی بدیاں ان سے دور کر دیں گے''۔

والذین امنوا و عملو الصلحت لندخلنهم فی الصالحین o (سورہ العنکبوت آیت نمبر۹) ''اور جولوگ ایمان لائے اور نیک عمل کئے ہم انہیں اچھے لوگوں کے گروہ میں داخل کریں گے''۔

و جاھدوا فی اللہ حق جھادہ o (سورہ حج آیت نمبر۷۸) ''اور اللہ کی راہ میں ایسی کوشش کرو کہ اس کا حق ادا ہو جائے''۔

و الذین جاھدوا فینالنھدینھم سبلنا o (سورہ العنکبوت آیت نمبر۶۹) ''اور جولوگ ہماری طرف آنے کی کوشش کرتے ہیں ہم انہیں ضرور ایسے راستے دکھائیں گے جو ہماری طرف آتے ہیں''۔

فلا تطع الکافرین و جاھدھم بہ جھادا کبیرا o (سورہ الفرقان آیت نمبر۵۲) ''پس تو کافروں کی پیروی نہ کر اور اس (کتاب الٰہی) کے ذریعے ان سے جہاد عظیم کر''۔

وجاھدوا باموالھم و انفسھم فی سبیل اللہ o (سورہ انفال آیت نمبر ۷۲) ''اور اللہ کے راستے میں کوشش کرو اپنے مالوں اور جانوں سے''۔

خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ:۔

احب الاعمال الی اللہ تعالیٰ ادومھا و ان قل (بخاری ومسلم بحوالہ جامع الصغیر للسیوطیؒ جلد نمبر۱) ''اللہ تعالیٰ کو اعمال میں سب سے زیادہ وہ عمل پسند ہے جو مستقل مزاجی سے انجام دیا جائے خواہ تھوڑا ہی ہو''۔

غرض یہ کہ حضورؐ اقدس کا ارشاد (حدیث) ہو یا قرآن حکیم کی آیات ان میں سے کوئی حدیث یا کوئی آیت ایسی نہیں جس میں خدائے واحد کے ماننے والوں اور اسلام کی پیروی کرنے والوں کو خانقاہ نشینی، ترکِ دنیا یا اوہام پرستی کی تعلیم دی گئی ہو بلکہ ہر جگہ اور ہر مقام پر مسلمانوں کو ہدایت کی گئی ہے کہ کوشش کرو، جدوجہد کرو اپنی جانوں کے ذریعے سے بھی، اپنے اموال کے ذریعے سے بھی تاکہ دین حق تمام ادیان پر غالب آجائے اور دنیا سے بت پرستی، ظلم، ناانصافی اور معاشی ومعاشرتی ناہمواریوں کا خاتمہ ہو جائے۔

مذاہب عالم میں اسلام کو یہ انفرادیت حاصل ہے کہ اس نے ساری دنیا کو مخاطب کیا ہے اور ایک ایسا دریائے فیض جاری کر دیا ہے جس سے ہر قوم، ملک اور ہر زمانے کے لوگ فیض یاب ہو سکتے ہیں۔ تلقینِ عمل کے سلسلے میں بھی اسلام نے بعض مقامات پر ایسے اصول بیان فرمائے ہیں جن کے مخاطب صرف مسلمان نہیں بلکہ جو قوم اس اصول پر عمل کرے گی عروس کامیابی سے ہم آغوش ہو گی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ قرآن حکیم میں فرماتا ہے:

ان اللہ لا یغیر ما بقوم حتیٰ یغیروا ما بانفسھم ○ (سورہ الرعد آیت نمبر۱۱)

''اللہ تعالیٰ اس وقت تک کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنے اندر تبدیلی پیدا نہ کرے''۔

اس آیتِ کریمہ میں عمل کا وہ حیات بخش اور انقلاب آفریں درس دیا گیا ہے جو کتنے ہی ضخیم دفتروں پر بھاری ہے۔ ان چند الفاظ میں حرکت و عمل اور جدوجہد کی پوری تاریخ سمو دی گئی ہے اور عمل کا ایسا جامع فلسفہ پیش کر دیا گیا ہے جس سے بہتر فلسفہ دنیا کی کسی کتابِ عمرانیات میں نہیں مل سکتا۔ اس ارشاد ربانی میں مذہب کے حوالے سے یہ حقیقت عالمِ انسانیت کے ذہن نشین کی گئی ہے کہ خواہ دنیا کی کوئی قوم اور کسی عقیدے کے ماننے والے ہوں ان میں اس وقت تک بہتری اور ترقی کے آثار پیدا نہیں ہو سکتے جب تک وہ خود کمر ہمت نہ باندھیں، اور عمل کی صحیح سمت متعین کر کے اپنی ساری توانائیاں حصول مقصد پر صرف نہ کر دیں۔ اس ارشاد ربانی کے بعد کون کہہ سکتا ہے کہ خدا کا تصور قناعت اور توکل کا درس دے کر خدا پرستوں کو جہد و عمل سے کنارا کشی کی راہ دکھاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو جو ضابطۂ حیات عطا فرمایا اس میں دن کے طلوع ہونے سے لے کر رات کی تاریکی پھیل جانے تک سارا دن بلکہ رات کا ایک حصہ بھی عمل اور صرف عمل سے عبارت ہے۔ مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ صبح صادق ہوتے ہی اپنے بستروں سے اٹھ کھڑے ہو۔ موسم خواہ کتنا ہی سرد اور یخ بستہ ہو اپنے ہاتھ پیر اور چہرے کو اچھی طرح دھو کر مسجد میں جاؤ اور ایک امام کے پیچھے صف بستہ ہو کر نماز ادا کرو۔ یہ عمل تھوڑے تھوڑے وقفے سے دن میں پانچ مرتبہ دہرانے کی ہدایت فرمائی۔ سال میں ایک ماہ کے روزے رکھ کر نفس

کی عملی تربیت کو ہر مسلمان کے لئے لازم قرار دیا گیا۔ عمر بھر میں ایک بار سیکڑوں اور ہزاروں میل کا سفر کر کے حج بیت اللہ کو فرض کر دیا گیا۔ جس دور میں آمد و رفت کے وسائل نہایت محدود تھے اور لوگ قافلوں کی صورت میں سفر کرتے تھے اس وقت حج بیت اللہ کا فریضہ ادا کرنا کتنی بڑی جدوجہد تھی؟ اس کا اندازہ موجودہ دور کے لوگ کر ہی نہیں سکتے۔ یہ تمام عبادات عمل اور حسنِ عمل کا ایک ایسا سلسلہ ہیں جو شعور کی منزل میں قدم رکھنے کے وقت سے لے کر اس خاکدانِ عالم سے رخصت ہوتے وقت تک مسلسل جاری رہتا ہے۔ خدا کا تصور پیش کرنے والے بانیانِ مذاہب عبادات میں بھی انسان کی بنیادی ضروریات کو نظر انداز نہیں ہونے دیتے۔ چنانچہ باری تعالیٰ فرماتا ہے کہ:۔

یا یھا الذین امنوا اذا نودی للصلوۃ من یوم الجمعۃ فاسعوا الی ذکر اللہ وذروا البیع o (سورہ الجمعہ آیت نمبر ۹) ''اے ایمان والو! جب تمہیں جمعہ کے دن نماز کے لئے بلایا جائے تو ذکر الٰہی کے لئے جلدی کیا کرو اور خرید و فروخت ترک کر دیا کرو''۔

پھر فرمایا کہ جب نماز ختم ہو جائے تو:۔

فانتشروا فی الارض و ابتغوا من فضل اللہ o (سورہ الجمعہ آیت نمبر ۱۰) ''اللہ کا فضل (رزق) تلاش کرنے کے لئے زمین میں پھیل جایا کرو'' (یعنی زندگی کی مادی جدوجہد میں حصہ لیا کرو)۔

ہم نہیں سمجھتے کہ دنیا کے کسی نظام میں روحانی اور مادی دونوں پہلوؤں کو اس طرح شانہ بشانہ رکھ کر پوری انسانی زندگی کو عرصہ گاہِ عمل بنا دیا گیا ہو۔

صبر کا مفہوم؟

اب رہ گیا منکرین خدا کا یہ اعتراض کہ خدا اور مذہب کا تصور ظالم حکمرانوں اور جابر سرداروں کے ظلم اور استحصال کے خلاف جدوجہد کرنے کی بجائے صبر و شکر اور قناعت کی تعلیم دیتا ہے اس طرح یہ تصور ظالموں اور جابروں کے استحصالی نظام میں ان کا دست و بازو ثابت ہوتا ہے۔ دراصل یہ اعتراض عربی زبان سے عدم واقفیت اور عدم تدبر کی بنا پر پیدا ہوتا

ہے۔ یہ درست ہے کہ اسلام اپنے متبعین کو صبر کی تلقین کرتا ہے مثلاً فرمایا کہ ''ان اللہ مع الصابرین ''یعنی اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے مگر عربی میں صبر کے معنی ہیں کسی مقصد کے حصول کے لئے پوری استقامت سے جدوجہد اور کوشش کرنا اور اس راہ میں آنے والے مصائب کو ہمت کے ساتھ برداشت کرنا۔ چنانچہ لغاتِ عربی کے ائمہ اور ماہرین نے صبر کے مندرجہ ذیل معانی بیان کیے ہیں:

ثابت قدمی کے ساتھ مدد چاہنا، (لسان العرب۔ زیر لفظ صبر) جرات دکھانا۔ استقامت اختیار کرنا۔ ثابت قدم رہنا۔ (مفرداتِ امام راغبؒ اصفہانی)

ان معانی سے یہ مفہوم کہیں پیدا نہیں ہوتا کہ ظلم اور جبر کے سامنے ہتھیار ڈال دو۔ جن لوگوں نے صبر کے لفظ کو یہ معنی پہنائے وہ خود اس کے ذمہ دار ہیں جس کی ان کے پاس کوئی دلیل نہیں۔ اگر خدا اور مذہب کا تصور پیش کرنے والے ظلم وستم کے مقابلے میں صبر کرنے اور سپر ڈالنے کی تعلیم دیتے تو انبیاء اور ان کے جانشین کبھی قوی کے مقابلے میں کمزور کی حمایت نہ کرتے جبکہ ہم دیکھتے ہیں کہ خدا کا تصور پیش کرنے والے روحانی پیشواؤں نے ہمیشہ کمزوروں اور مظلوموں کی حمایت اور امداد کی۔

خدا کا تصور اور مظلوم کی حمایت

چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مشہور واقعہ ہے کہ ایک دن آپؑ نے دیکھا کہ فرعون کی قوم کا ایک شخص ایک کمزور اسرائیلی کو مار رہا ہے۔ جب اسرائیلی نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اپنی امداد کے لئے بلایا تو آپؑ بلا تامل اس کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے آگے بڑھے اور اسے فرعونی کے ظلم سے نجات دی۔ اسے بچانے کی کوشش میں قوم فرعون کا یہ ظالم شخص اتفاقی طور پر آپؑ کے ہاتھ سے مارا گیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اس حقیقت سے واقف تھے کہ حکومت فرعونیوں کی ہے اور اسرائیلی ان کے غلام ہیں اور آپؑ کی مداخلت آپؑ کے حق میں نہایت خطرناک ثابت ہوگی مگر مظلوم کی امداد اور حمایت کی خاطر آپؑ نے اپنی جان کو خطرے میں ڈالنا گوارا کر لیا لیکن مظلوم کی امداد سے دست کشی گوارا نہ کی۔ (۱)

مگر جب دوسرے روز حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کے اسی فرد کو جس کی اس سے قبل آپؑ امداد کر چکے تھے ایک دوسرے شخص سے لڑتے دیکھا اور محسوس کیا کہ اب یہ ظلم کر رہا ہے تو آپؑ نے اس کی کوئی مدد نہ کی بلکہ جب اس نے آپؑ کو اپنا ساتھ دینے کے لئے بلایا تو آپؑ نے فرمایا کہ "بلاشبہ تو کھلے کھلے گمراہوں میں سے ہے"۔ (سورہ القصص) صرف یہی نہیں بلکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس کو پکڑ کر سزا دینے کا بھی ارادہ کیا کیونکہ یہ ظلم کر رہا تھا۔ اسی واقعہ کی وجہ سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مصر سے نکلنا پڑا اور آپؑ مدین تشریف لے گئے۔ "عہد نامہ قدیم" کے بیان کے مطابق مدین میں حضرت موسیٰؑ ایک کنویں کے قریب بیٹھے تھے کہ آپ نے سات لڑکیوں کو دیکھا جو کنویں پر آئیں اور پانی بھر بھر کر حوض میں ڈالنے لگیں تاکہ اپنے جانوروں کو پلا سکیں۔ اتنے میں مدین کے بہت سے چرواہے آ گئے اور انہوں نے ان لڑکیوں اور ان کے جانوروں کو کنویں پر سے بھگا دیا، اور اپنے جانوروں کو پانی پلانا شروع کر دیا، کمزور لڑکیاں اپنے جانوروں کو لے کر سہمی ہوئی ایک طرف کھڑی ہو گئیں۔ یہ دیکھ کر حضرت موسیٰ علیہ السلام اٹھے اور آپؑ نے ان چرواہوں کو پیچھے ہٹا کر ان لڑکیوں کے جانوروں کو پانی پلوا دیا جو کنویں پر ان چرواہوں سے پہلے آئی تھیں۔ (عہد نامہ قدیم خروج) حالانکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اس ملک میں نووارد تھے، یہاں آپؑ کی کوئی جماعت اور جمعیت نہ تھی نہ یہاں آپؑ کو کوئی اثر و رسوخ حاصل تھا مگر قرآن حکیم کے بیان کے مطابق جب آپؑ نے ان لڑکیوں کو دیکھا کہ یہ چرواہوں کے خوف سے پیچھے کھڑی ہوئی ہیں تو آپؑ نے ان سے پوچھا کہ تمہیں کیا مشکل درپیش ہے۔ لڑکیوں نے جواب دیا کہ جب تک یہ چرواہے اپنے جانوروں کو پانی نہ پلا لیں اس وقت تک ہم اپنے جانوروں کو پانی نہیں پلا سکتیں اور ہمارا باپ ضعیف ہے (سورہ القصص)۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس بات کی قطعاً پروا نہ کی کہ ان کی اس مداخلت کے نتیجے میں انہیں نقصان بھی پہنچ سکتا ہے کیونکہ آپؑ نووارد ہونے کے علاوہ تنہا بھی تھے۔ آپؑ نے ایک

---

(۱) (اللہ تعالیٰ نے یہ واقعہ قرآن حکیم کی سورہ القصص میں بیان کیا ہے۔ بائبل کے باب خروج میں بھی اس واقعہ کا تذکرہ ہے)

ضعیف اور بے یارومددگار شخص کی لڑکیوں کی امداد کی اور انہیں طاقت ور گروہ کی ناانصافی کا نشانہ بننے سے بچا کر اپنی مظلوم دوستی کا ثبوت دیا۔

اب اسلام کی طرف آیئے جو خدائے واحد کی پرستش کی دعوت دینے والا، سب سے بڑا اور آخری دین ہے۔ ابومحمد عبدالملک ابن ہشام نے اپنی شہرہ آفاق کتاب سیرت میں حضورؐ کی مکی زندگی کا ایک واقعہ بیان کیا ہے (مورخ ابن ہشام لکھتے ہیں کہ ایک روز ایک سوداگر اونٹوں کا گلہ لے کر مکہ آیا۔ قریش کے مشہور سردار ابوجہل نے بھی اس سے کچھ اونٹ خریدے مگر ان کی قیمت اس وقت ادا نہ کی۔ مدتِ مقررہ گزر جانے کے بعد سوداگر بار بار تقاضے کرتا رہا مگر ابوجہل ٹال مٹول سے کام لیتا رہا۔ آخر مجبور ہو کر سوداگر ایک روز خانۂ کعبہ میں آیا جہاں سرداران قریش جمع تھے۔ اس نے ان سرداروں کو سارا ماجرا سنایا اور کہا کہ آپ لوگوں میں کوئی ایسا شخص ہے جو ابوالحکم (یہ ابوجہل کی کنیت تھی) سے میرے اونٹوں کی قیمت مجھے دلوادے یا اپنے پاس سے ادا کردے اور بعد میں اس سے وصول کر لے؟ اتفاق سے اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی خانۂ کعبہ کے ایک گوشے میں تشریف فرما تھے۔ اکابرِ قریش نے حضورؐ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ اس شخص کے پاس جاؤ یہ ابوالحکم سے تمہاری رقم وصول کرادے گا۔ سرداران مکہ نے یہ بات از راہِ تمسخر کہی تھی کیونکہ وہ جانتے تھے کہ ابوجہل حضورؐ کا سخت ترین دشمن ہے اور وہ کبھی آپؐ کی بات نہیں مانے گا۔ چنانچہ تاجر آپؐ کے پاس آیا اور ابوجہل سے اپنی رقم دلوانے کی درخواست کی۔ حضورؐ بلا تامل اس کے ساتھ روانہ ہو گئے۔ ابوجہل کے دروازے پر دستک دی۔ ابوجہل باہر نکلا آپؐ نے اس سے فرمایا کہ تم نے اس تاجر سے اونٹ خریدے تھے اس کی قیمت کیوں ادا نہیں کی۔ (سیرت ابن ہشام)

ایک پردیسی اور بے یارومددگار تاجر کا حق دلوانے کے لئے حضورؐ کا ایک جابر سردار کے پاس بے خوف وخطر جانا اور اس سے باز پرس کرنا یہ ایسا واقعہ تھا جس نے ابوجہل کے دل ودماغ پر غیر معمولی اثر کیا، حضورؐ کی عظمتِ کردار اور جرات سے وہ اتنا مرعوب ہوا کہ مورخ ابن ہشام کے بیان کے مطابق اس نے حضورؐ سے کہا کہ ذرا ٹھہر جایئے میں ابھی

اس کی قیمت ادا کیے دیتا ہوں، یہ کہہ کر اندر گیا اور رقم لا کر سوداگر کو دے دی۔

حضرت عمروؓ بن العاص مصر کے گورنر تھے۔ان کے بیٹے نے ایک بے گناہ مصری کو کوڑے سے مارا۔مصری مدینہ آیا اور بارگاہ خلافت میں حاضر ہو کر اس زیادتی کی شکایت کی۔امیر المومنین عمرؓ نے اسی وقت مصر کے گورنر حضرت عمروؓ بن العاص کے نام فرمان جاری کیا کہ اپنے بیٹے کو لے کر فوراً حاضر ہو۔جب گورنر مصر اپنے فرزند کے ساتھ مدینہ پہنچے اور حضرت عمرؓ نے تحقیق کے بعد مصری کی شکایت کو درست پایا تو کوڑا مصری کے ہاتھ میں دیا اور فرمایا کہ جس زور سے اس نے تجھے مارا تھا اتنے ہی زور سے اس پر کوڑے برسا۔خدا کے پرستار عمرؓ نے حق وانصاف کے معاملے میں ذرہ برابر رعایت نہ کی اور مظلوم کی حمایت کرتے ہوئے ظالم کو مظلوم کے ہاتھ سے سزا دینے کا حکم جاری کر دیا حالانکہ ظالم ایک بہت قوی باپ کا بیٹا تھا جو اپنی ذاتی شجاعت کے علاوہ ایک بہت بڑے صوبے کا گورنر بھی تھا۔

''نصب الرایہ'' کے مصنف کا بیان ہے کہ امیر المومنین علیؓ بن ابی طالب کے عہدِ خلافت میں ایک مسلمان نے کسی غیر مسلم کو قتل کر دیا۔قاتل گرفتار ہو کر بارگاہِ خلافت میں پیش ہوا۔حضرت علیؓ نے مقدمے کی سماعت کی جرم ثابت ہوگیا۔آپؓ نے حکم دیا کہ قاتل کی گردن ماردی جائے۔اگرچہ ظالم مسلمان تھا اور مظلوم غیر مسلم مگر امیر المومنین حضرت علیؓ نے اس بات کی قطعاً پروانہ کی اور ظالم کے مقابلے میں مظلوم کی حمایت فرمائی۔اس موقع پر آپؓ نے یہ تاریخی الفاظ کہے تھے کہ ''جو لوگ ہماری حدودِ سلطنت میں آباد ہیں ان سب کا خون ہمارے خون کے مساوی ہے''۔

خدا اور مذہب کا تصور پیش کرنے والے اکابر کی طویل ترین تاریخ کے یہ چند واقعات ہیں جن سے منکرین خدا کا یہ دعویٰ غلط ثابت ہو جاتا ہے کہ خدا اور مذہب کا تصور ظالموں کی حمایت اور مظلوموں کا استحصال کرتا ہے اور کمزوروں کو اپنی حالت پر قناعت کرنے کا درس دے کر حقوق طلبی کی جدوجہد کا دروازہ بند کر دیتا ہے۔دنیا کے سب سے جلیل القدر نبیؐ اور خدا کے سب سے بڑے پرستارؐ نے تو حق طلب کرنے والوں کی جدوجہد کا نہ صرف راستہ کھول دیا بلکہ اس راہ میں مارے جانے والوں کو راہ حق کا شہید قرار دیا' دنیا

کے کسی نظام میں حقوق طلبی کو اس قدر محترم قرار نہیں دیا گیا۔

مشہور منکر خدا ''اسپرکن'' کہتا ہے کہ ''اینجلز کی رائے ہے کہ مذہب بنیادی طور پر سائنس کی ضد ہے اور اس کی حیثیت کسی ایسے علم کی نہیں جس سے کائنات اور اس کے موجودات پر انسان کی برتری اور قدرت ثابت ہوتی ہو بلکہ خدا اور مذہب کے تصور کی بنیاد خوف پر ہے اس میں عقل اور مشاہدے کو بالکل دخل نہیں صرف اندھی عقیدت اس میں کارفرما ہے''۔(ملخص)

دراصل یہ اعتراض چار اعتراضات پر مشتمل ہے۔ (۱) خدا اور مذہب کی بنیاد خوف پر ہے اور وہمی، مراقی اور کمزور اعصاب کے لوگ ان توہمات کا شکار ہو جاتے ہیں۔ (۲) خدا اور مذہب کے تصور میں عقل اور مشاہدے کو قطعاً دخل نہیں بلکہ اس کی بنیاد اندھی عقیدت پر ہے (۳) خدا اور مذہب کی رو سے انسان عناصر فطرت کا غلام ہے اور اسے کائنات پر کوئی قوت وقدرت اور برتری حاصل نہیں (۴) خدا کا تصور اور سائنس ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ آیئے حقائق کی روشنی میں ان اعتراضات کا جائزہ لیں۔

خدا کا تصور خوف کی پیداوار ہے

کیا واقعی خدا اور مذہب کے تصور کی بنیاد خوف پر ہے اور کمزور اعصاب کے لوگ ان توہمات کا شکار ہو جاتے ہیں؟ اس اعتراض پر غور کرنے سے پہلے خوف کا مفہوم متعین کرنا ضروری ہے۔ اگر خوف سے منکرین خدا کی مراد خدا کا خوف ہے تو یقیناً اسلام نے جس خدا کا تصور پیش کیا ہے اس میں صرف اس ہستی سے ڈرنے کی تعلیم دی گئی ہے جو اس کائنات کا خالق و مالک ہے اور جس نے نظام کائنات کو چلانے کے لئے کچھ قوانین مقرر کیے ہیں۔ یہ ڈر اور خوف انہی لوگوں کے لئے ہے جو ان قوانین کو توڑتے ہیں اور یہ کوئی قابل اعتراض بات نہیں۔ کیا کوئی منصف مزاج شخص خوف کے وجود سے انکار کر سکتا ہے۔ دنیا کا ہر ملک اپنی سرحدوں کی حفاظت کے لئے فوج رکھتا ہے، معاشرے میں امن وامان قائم رکھنے کے لئے پولیس متعین کرتا ہے، مجرموں کو سزا دینے کے لئے عدالتیں قائم کرتا ہے۔ اگر

دنیا میں خوف کا وجود نہیں ہے تو پھر ان تکلفات، انتظامات اور تیاریوں کی کیا ضرورت ہے؟
اس سے ثابت ہوتا ہے کہ خوف انسانی زندگی کے ساتھ ہے۔ ہر ملک کو خطرہ ہوتا ہے کہ دوسرا ملک اس پر حملہ نہ کردے۔ اس لئے وہ اپنی فوجی طاقت بڑھاتا ہے اور ملک کو دفاعی لحاظ سے زیادہ سے زیادہ مستحکم کرتا ہے۔ ہر معاشرے میں ایسے لوگ موجود ہوتے ہیں جن سے دوسروں کی جان و مال اور عزت و آبرو کے غارت ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ لوگوں کو خوف و خطر سے محفوظ رکھنے کے لئے پولیس متعین کی جاتی ہے۔ مجرموں کو مجرمانہ حرکات سے باز رکھنے اور ان کے دل میں سزا کا خوف پیدا کرنے کے لئے عدالتیں قائم کی جاتی ہیں۔ اگر ایسا نہ ہو تو دنیا کا امن و امان درہم برہم ہو جائے۔ گویا خوف ہماری مادی زندگی میں ایک ثابت شدہ حقیقت ہے۔ ہماری دنیا کے اس مادی نظام کی طرح مذہب نے ایک روحانی نظام پیش کیا ہے۔ دنیاوی نظام میں فوج اور پولیس کا خوف ہوتا ہے، عدالتوں کے ذریعے دی جانے والی سزا کا خوف ہوتا ہے اور یہ خوف لوگوں کو بہت سے جرائم سے باز رکھتا ہے۔ روحانی نظام میں صرف ایک خوف ہوتا ہے اور وہ ہے خدائے واحد کا خوف۔ جس طرح دنیوی نظام میں امن پسند اور قانون کا احترام کرنے والوں کو فوج، پولیس اور عدالتوں سے کوئی خوف نہیں آتا اسی طرح روحانی نظام میں اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ قوانین کی پابندی کرنے والوں کو بھی کوئی خوف نہیں رہتا۔ ان کے دلوں میں اللہ تعالیٰ کی محبت پیدا ہو جاتی ہے اور اس محبت کی وجہ سے وہ ایسے جرائم کا ارتکاب کرتے ہی نہیں جن سے خدا کا غضب ان پر بھڑکے اور ان کے دلوں میں عذاب کا خوف پیدا ہو۔

مفکر اینجلز کہتا ہے کہ خدا کا تصور دوزخ کے عذاب سے ڈرا کر اور جنت کی نعمتوں کا لالچ دے کر خدا کی ہستی کو منواتا ہے۔ ہم اس اعتراض کو درست تسلیم کرتے ہیں اور اس پر معذرت خواہانہ رویہ اختیار نہیں کرتے۔ بلاشبہ خدا دوزخ کے عذاب سے ڈراتا ہے بالکل اسی طرح جس طرح دنیا کے ہر ملک کا قانون خلافِ قانون اقدامات و حرکات کرنے والوں کو سزا سے ڈراتا ہے۔ خدا جنت کی نعمتوں کا وعدہ کرتا ہے بالکل اسی طرح جس طرح دنیوی نظاموں میں قانون کی پابندی کرنے والوں اور اپنے فرائض کو احسن طریقے سے سرانجام

دینے والوں کو انعامات دیئے جاتے ہیں۔ اس میں نہ کوئی بات قابل اعتراض ہے اور نہ تعجب انگیز۔ یہ حقیقت ایک بار پھر ذہن نشین کر لینی چاہئے کہ خدا عذاب دوزخ سے انہی لوگوں کو ڈراتا ہے جو اس کے قوانین کو توڑتے ہیں۔ اپنے قوانین کی پابندی کرنے والوں کو وہ خوفزدہ نہیں کرتا بلکہ انہیں سکون و اطمینان عطا کرتا اور انعامات سے نوازنے کا وعدہ کرتا ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم میں ارشاد ہوتا ہے کہ:۔

ان الذین قالوا ربنا اللّٰہ ثم استقاموا فلا خوف علیھم ولا ھم یحزنون o (سورہ الاحقاف آیت نمبر ۱۳) ''اور جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ اللہ ہمارا رب ہے، اور وہ اس عقیدے پر مضبوطی سے قائم ہو جاتے ہیں انہیں نہ کوئی خوف ہوتا ہے اور نہ غم''۔

ومن یسلم وجھه الی الله و ھو محسن فقد استمسک بالعروۃ الوثقیٰ o (سورہ لقمن آیت نمبر ۲۲) ''اور جو شخص اپنی توجہ کا مرکز اللہ کو بنا لیتا ہے اور اس میں مخلص ہوتا ہے تو وہ ایک مضبوط کڑے کو پکڑ لیتا ہے۔ یاد رکھو جو لوگ اللہ کو دوست رکھتے ہیں ان پر نہ کوئی خوف طاری ہوتا ہے اور نہ وہ غمگین ہوتے ہیں''۔

قرآن کریم کی متذکرہ بالا آیات نے منکرین خدا کے دعوے کو باطل قرار دے دیا اور فیصلہ کر دیا کہ اللہ تعالیٰ کی ہستی پر صدق دل سے ایمان لانے اور اس عقیدے پر مضبوطی سے قائم رہنے والے نہ صرف ہر قسم کے خوف اور رنج و غم سے بے نیاز ہو جاتے ہیں بلکہ ان کے ہاتھ میں ایک مضبوط اور کبھی نہ ٹوٹنے والا کڑا آ جاتا ہے جسے پکڑ کر وہ ایک مستحکم اور ناقابل شکست حصار میں آ جاتے ہیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ اسلام کے خدا نے اپنی ہستی پر ایمان لانے والوں کو ایک اور بشارت دی کہ:۔

وعداللہ الذین امنوا منکم و عملوا الصلحت لیستخلفنھم فی الارض کما استخلف الذین من قبلھم ولیمکنن لھم دینھم الذی ارتضیٰ لھم ولیبدلنھم من بعد خوفھم امنا o (سورہ النور آیت نمبر ۵۵) یعنی ''اللہ تعالیٰ وعدہ کرتا ہے ان لوگوں سے جو ایمان لائے اور نیک اعمال سرانجام دیئے، کہ وہ ان میں سے زمین پر اپنے نائب (حاکم) مقرر کرے گا جس طرح اس نے پچھلی امتوں میں سے اپنے

نائب مقرر کیے تھے جن کے لئے وہ دین کو قوت دے گا اور خوف کو امن سے بدل دے گا۔"

گویا اللہ تعالیٰ کی ہستی پر صدق دل سے ایمان لانے کے نتیجے میں صرف ایمان لانے والا ہی خوف سے نجات نہیں پاجاتا بلکہ اسے ایسی قوت مل جاتی ہے کہ وہ دوسروں کو بھی خوف سے نجات دے دیتا ہے اور بدامنی، انتشار اور خوف وخطر کو امن وراحت سے بدل دیتا ہے۔

اب اس اعتراض کے دوسرے حصے کی طرف آیئے کہ وہمی، مراقی اور کمزور اعصاب کے لوگ خدا اور مذہب کے تصورات کا شکار ہوتے ہیں۔ ہمارے خیال میں اس سے زیادہ جاہلانہ اعتراض خدا کے وجود پر آج تک نہیں کیا گیا۔ جن ہستیوں نے خدا کا تصور پیش کیا ان کی زندگی کے واقعات کھلی ہوئی کتاب کی طرح ہمارے سامنے ہیں۔ تاریخ شہادت دیتی ہے کہ خدا کا تصور پیش کرنے والے اور انہیں قبول کرنے والے اعصابی لحاظ سے اتنے قوی تھے کہ دنیا کی بڑی سے بڑی قوت نے انہیں مرعوب کرنے کی کوشش کی مگر ان کے پائے استقلال میں ذرہ برابر لغزش پیدا نہ ہوئی۔ کیا نمرود، فرعون، ہامان، قارون اور ابوجہل معمولی لوگ تھے؟ ان کی جلالت وقوت سے کون واقف نہیں۔ اگر خدا کا تصور پیش کرنے والی ہستیاں حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ اور حضرت خالد بن ولیدؓ کمزور اعصاب کے مالک ہوتے تو ان مخالف طاقتوں کے سامنے ایک دن بھی نہ ٹھہر سکتے اور اعصابی لحاظ سے کمزور ہونے کی وجہ سے پہلی ہی یورش میں سپر انداز ہو جاتے مگر ہم دیکھتے ہیں کہ نمرود نے جو اپنے وقت کا بڑا طاقتور بادشاہ تھا حضرت ابراہیمؑ کو خدائے واحد کا تصور پیش کرنے سے باز رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی حتیٰ کہ آپؑ کو دہکتی ہوئی آگ میں پھینک دیا مگر حضرت ابراہیمؑ کے اعصاب اتنے قوی تھے کہ آپؑ نے آگ کے شعلوں کو پرکاہ کے برابر بھی وقعت نہ دی اور نہایت استقلال و پامردی سے آگ میں پھینکا جانا قبول کر لیا لیکن معبودان باطل کے سامنے سر اطاعت خم کرنا گوارا نہ کیا۔ کیا کمزور اعصاب کے لوگ ایسی استقامت دکھا سکتے ہیں؟ حضرت موسیٰؑ نے فرعون جیسے جابر اور طاقتور بادشاہ کو

للکارا اور بھرے دربار میں تن تنہا اس کی جھوٹی خدائی کو چیلنج کیا۔ کمزور اعصاب کے لوگ کیا اس جرات اور بے خوفی کا مظاہرہ کر سکتے ہیں؟ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یکہ وتنہا ہونے کے باوجود سردارانِ مکہ کے مصنوعی خداؤں کی خدائی کے سارے تار و پود بکھیر دیئے اور مٹھی بھر نفوس کے ساتھ قریش مکہ، یہودیانِ مدینہ اور عرب کے متحدہ لشکروں کا مقابلہ کر کے ان کے عزائم کو خاک میں ملا دیا۔ کیا کمزور اعصاب کے لوگ اپنے موقف پر اس شجاعت و مردانگی سے قائم رہ کر مخالف قوتوں پر غالب آسکتے ہیں؟ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصال کے بعد جب مکہ اور مدینہ کے علاوہ سارا عرب باغی ہو گیا، تو خدائے واحد کے پرستار سیدنا ابوبکرؓ نے جو جسمانی لحاظ سے نہایت کمزور تھے، جس بہادری، استقلال اور بے خوفی کا مظاہرہ کیا کمزور اعصاب کے لوگ کیا ایسی استقامت دکھا سکتے ہیں؟ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے تمام تذکرہ نگاروں مثلاً علامہ ابن کثیر نے (البدایہ والنہایہ میں) اور علامہ ابن حزم نے (الملل والنحل میں) لکھا ہے کہ جب جھوٹے مدعیانِ نبوت اور منکرین زکوٰۃ نے علم بغاوت بلند کر دیا اور بعض صحابہؓ نے صدیق اکبرؓ کو مشورہ دیا کہ مصلحت وقت کا تقاضا ہے کہ منکرین زکوٰۃ سے تعرض نہ کیا جائے تو حضرت ابوبکرؓ نے عجیب قوت ایمانی کا مظاہرہ کیا اور فرمایا کہ ”خدا کی قسم اونٹ کا گھٹنا باندھنے والی وہ رسی جو یہ لوگ رسولؐ اللہ کے زمانے میں دیا کرتے تھے جب تک بیت المال میں جمع نہیں کرالوں گا اس وقت تک اس تلوار کو نیام میں نہیں ڈالوں گا“۔ تاریخ گواہ ہے کہ جیسا ابوبکر صدیقؓ نے کہا تھا ویسا کر کے دکھایا۔ کیا کمزور اعصاب کے لوگ ایسی ایمانی قوت اور اس عدیم المثال مردانگی و استقامت کا ادنیٰ سا نمونہ بھی دکھا سکتے ہیں؟ انبیاء اور ان کے خدا پرست جانشینوں کی زندگیوں کے یہ چند واقعات ہیں ورنہ خدا کا تصور پیش کرنے والوں کے قوی الاعصاب ہونے کے واقعات سے تاریخ بھری پڑی ہے۔ تاریخ کی ان مسلمہ شہادتوں کی روشنی میں منکرین خدا کا یہ دعویٰ باطل ثابت ہو جاتا ہے کہ خدا اور مذہب کے توہمات میں کمزور اعصاب کے لوگ مبتلا ہو جاتے ہیں۔ تاریخ کہتی ہے کہ روئے زمین پر سب سے قوی اعصاب کے مالک وہی لوگ پیدا ہوئے جو خدا کی ہستی پر ایمان رکھتے تھے۔

خدا کا تصور اندھی عقیدت پر مبنی ہے؟

مغربی مفکر ''اینجلز'' اور اس کے ہم خیال مفکرین کا خدا کی ہستی پر دوسرا اعتراض یہ ہے کہ اس تصور کی بنیاد اندھی عقیدت پر ہے عقل اور مشاہدے کا اس میں بالکل دخل نہیں' لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے۔ قرآن حکیم متعدد مقامات پر جن کی تعداد سات سو سے بھی کچھ زیادہ ہے ہمیں دعوت فکر وتدبر دیتا ہے۔ وہ کائنات اور اس کی اشیاء کا مشاہدہ کرنے کی تلقین کرتا ہے خداوند تعالےٰ اپنے وجود کی بنیاد کسی اندھی عقیدت پر نہیں رکھتا بلکہ واقعات، مثالوں اور دلیلوں سے ہمارے قلب ونظر کو متاثر کرتا ہے اور عقل انسانی کو براہ راست مخاطب کرتا ہے چنانچہ فرماتا ہے:۔

انا انزلنه قرانا عربيا لعلكم تعقلون o (سورہ یوسف آیت نمبر۲) ''اس قرآن کو ہم نے عربی زبان میں نازل کیا ہے تاکہ (اے اہل عرب! جو اس کے سب سے پہلے مخاطب ہو) تم غور وفکر کر سکو۔''

افلا يتدبرون القران ام على قلوب اقفالها o (سورہ محمد آیت نمبر ۲۴) ''تو کیا یہ لوگ قرآن میں غور نہیں کرتے یا ان کے دلوں پر قفل لگے ہوئے ہیں''۔

قرآن حکیم کی ان دو آیات میں اللہ تعالیٰ دعوت دیتا ہے کہ اے لوگو! تم اندھا دھند مخالفت نہ کرو بلکہ عقل وتدبر سے کام لو اور میری آیات پر غور کرو۔ اگر خدا اور مذہب کے تصور کی بنیاد اندھی عقیدت پر ہوتی تو اللہ تعالیٰ کبھی لوگوں کو غور وفکر کرنے کی دعوت نہ دیتا بلکہ فرماتا کہ اے لوگو! تم میری ہستی پر آنکھیں بند کر کے ایمان لاؤ' اگر تم نے عقل وتدبر اور غور وفکر سے کام لیا تو تمہارے ایمان ضائع ہو جائیں گے مگر اس نے ایسا نہیں فرمایا کیونکہ اسے معلوم تھا کہ ہستی باری تعالیٰ کا عقیدہ مکڑی کے جالے کی طرح کمزور نہیں' یہ عقیدہ توہمات پر مبنی نہیں کہ غور وفکر سے اس کے تار وپود بکھر جائیں گے بلکہ اس کی بنیاد عقل وتدبر، مشاہدات اور حقائق پر ہے اس لئے انسان اس نظریے پر جتنا زیادہ غور وفکر اور تدبر کرے گا خداوند تعالیٰ کی ہستی پر اس کا یقین وایمان اتنا ہی مضبوط ہوتا چلا جائے گا اسی لئے اس نے

ایک قدم اور آگے بڑھ کر یہاں تک دعوت دی کہ:۔

افلا ینظرون الی الابل کیف خلقت o (سورہ الغاشیہ آیت نمبر ۱۷)

''کیا وہ لوگ اونٹ کو نہیں دیکھتے کہ کس طور سے پیدا کیے گئے ہیں''۔

پھر فرمایا:۔

و الی الجبال کیف نصبت o (سورہ الغاشیہ آیت نمبر ۱۹) ''اور پہاڑوں کو (نہیں دیکھتے) کہ کس طرح (زمین میں) گاڑ دیئے گئے ہیں''۔

یعنی تم لوگ اونٹ کو دیکھو، پہاڑوں پر غور کرو اور سوچو کہ ان کی پیدائش میں کیا حکمتیں ہیں؟ جب تم غور وفکر کرو گے تو تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ اللہ تعالیٰ نے پہاڑوں کو پیدا کر کے تمہاری حفاظت کا سامان مہیا کر دیا۔ ان کے ذریعے اس نے تمہاری زمین کا توازن قائم کر دیا ہے' انہیں پانی کا ذریعہ بنایا ہے' ان میں اس نے تمہارے لئے بے شمار نباتات، ادویہ، حیوانات اور معدنیات کو محفوظ کر دیا ہے جو تمہاری صحت و زندگی کے لئے ضروری ہیں۔ تم اونٹ کی جسمانی ساخت پر غور کرو اور سوچو کہ اللہ تعالیٰ نے اسے ریگستان میں پیدا کر کے اس کی زندگی اور بقا کا انتظام بھی فرما دیا مثلاً اس کے پیروں کے تلووں کو نرم بنایا تا کہ یہ ریت میں آسانی اور تیزی سے سفر کر سکے' اس کے پیٹ میں پانی کا وافر ذخیرہ کرنے کی گنجائش پیدا کر دی تا کہ بے آب وگیاہ علاقے میں جہاں میلوں تک پانی کا ایک قطرہ میسر نہیں آتا یہ باہر سے پانی حاصل کئے بغیر دنوں بلکہ ہفتوں سفر کر سکے اور اپنے پیٹ کے ذخیرے سے پانی حاصل کر کے زندہ رہ سکے' حالانکہ دنیا کے دوسرے جانوروں کو یہ خصوصیات نہیں دی گئیں۔ یہ ثبوت ہے اس امر کا کہ ایک ایسی ہستی موجود ہے جس نے ہر چیز کو حق وحکمت کے ساتھ پیدا کیا ہے اور اس کے ماحول کے مطابق اس کی جملہ ضروریات کا خیال رکھا ہے۔ فرمایا کہ ان چیزوں یعنی پہاڑوں اور اونٹ کو دیکھ کر اپنے آپ سے سوال کرو کہ کیا تم یہ اشیا پیدا کرنے پر قادر ہو۔ غور وفکر کے بعد تمہاری عقل تمہیں یہ جواب دے گی کہ تم یہ چیزیں پیدا کرنے پر قادر نہیں ہو سکتے۔ کتنا رحیم وکریم اور حکیم وخبیر ہے وہ خدا جس نے تمہاری پیدائش سے پہلے ہی یہ اشیاء تمہارے لئے مہیا کر دیں تا کہ تم ان سے نفع حاصل کر

سکو پس یہ سوچ کر تمہارا دل خود شہادت دے گا کہ اس کائنات کا ایک خالق ضرور ہے اور تم اس پر ایمان لے آؤ گے۔ کیا مشاہدے، تدبر وفکر اور عقل کو استعمال کرنے کی اس سے بہتر اور کوئی مثال ہو سکتی ہے؟

انسان کو غور وفکر کی دعوت دینے کے بعد اللہ تعالیٰ اپنے وحدہ لاشریک ہونے کے دلائل بیان کرتا ہے اور مثالیں دے کر سمجھاتا ہے کہ اس کائنات میں یا اس سے باہر اللہ کے سوائے اور کوئی معبود نہیں اور اس کے لئے وہ یہ دلیل دیتا ہے کہ:۔

لو کان فیھما الھتہ الا اللہ لفسدتا فسبحن اللہ رب العرش عما یصفون o (سورہ الانبیاء آیت نمبر۲۲) ''اگر اللہ تعالیٰ کے سوائے زمین وآسمان کی تخلیق میں کچھ اور خالق بھی شریک ہوتے تو یہ (زمین وآسمان) تباہ ہو جاتے' اللہ تعالیٰ جو عرش کا مالک ہے ان عیوب سے پاک ہے جو یہ لوگ بیان کرتے ہیں''۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ متعدد خداؤں کے عقیدے کو باطل ثابت کرنے کے لئے یہ دلیل دیتا ہے کہ اگر اس نظام کائنات کے خالق ایک سے زیادہ ہوتے تو لازمی طور پر ان میں کبھی نہ کبھی اختلاف پیدا ہوتا اور اختلاف کی صورت میں وہ آپس میں متصادم ہوتے۔ جب ان میں اختلاف وتصادم رونما ہوتا تو اس کا نتیجہ یہ نکلتا کہ یہ نظام کائنات تباہ ہو جاتا۔ اس کائنات کا روز اول سے ایک مقررہ قاعدہ کے مطابق جاری رہنا اور اس میں کوئی نقص پیدا نہ ہونا اس امر کا ثبوت ہے کہ اس کا صرف اور صرف ایک خالق ہے جس کی خالقیت میں کوئی شریک نہیں۔

امیر المومنین سیدنا حضرت علیؓ بن ابی طالب نے اپنے فرزند اکبر حضرت امام حسنؓ کے نام اپنے وصیت نامے میں خدا کے وحدہ لاشریک ہونے کے بارے میں دلائل دیتے ہوئے قرآن حکیم کی اسی آیت سے روشنی حاصل کی ہے اور اسی چراغ سے اپنی فکر کا چراغ روشن کیا ہے۔ آپؓ نے کتنی حکیمانہ اور ایمان افروز بات کہی ہے جس کی بنیاد ایک روشن دلیل پر ہے۔ سیدنا علیؓ اپنے فرزند کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ۔

''اے میرے بیٹے! اگر تیرے رب کی ربوبیت اور اس کے کاموں میں

کوئی اور بھی شریک ہوتا تو اس کی طرف سے بھی رسول بھیجے جاتے' اس کی بھی حکومت ہوتی اور اس کی سلطنت کے بھی آثار و اخبار کا نشان ہوتا' اس کے افعال اور اس کی صفات مشاہدے میں آتیں مگر ایسا نہیں' صرف ایک ہی خدا ہے اور خود اس کا بھی اپنے بارے میں یہی ارشاد ہے''۔ (نہج البلاغہ۔ مرتبہ السید شریف الرضی)

کیا اب بھی کہا جائے گا کہ خدا کا تصور اندھی عقیدت پر مبنی ہے اور یہ تصور پیش کرنے والے مشاہدے اور عقل و فکر کو دعوت نہیں دیتے؟

اللہ تعالیٰ اپنی ہستی کا ثبوت دیتے ہوئے ایک اور لطیف نکتہ اور محکم دلیل بیان کرتا ہے فرماتا ہے کہ:۔

بدیع السمٰوٰت والارض o (سورہ الانعام آیت نمبر ۱۰۱) ''وہ (اللہ) زمین و آسمان کا موجد ہے''۔

یعنی اللہ تعالیٰ نے اس کائنات اور اس کی جملہ اشیا کو اس حالت میں تخلیق کیا کہ اس سے پہلے کسی اور کی بنائی ہوئی چیزیں موجود نہ تھیں' یعنی اس کے سامنے کوئی نمونہ نہیں تھا جسے دیکھ کر اس نے یہ نظام شمسی اور اس میں پائی جانے والی چیزیں پیدا کر دی ہوں بلکہ اس نے اس کائنات کو کسی نمونے کے بغیر پیدا کیا ہے۔ یہ ثبوت ہے اس امر کا کہ وہ خالق بھی ہے، موجد بھی ہے اور اس خالقیت میں اس نے کسی سے مدد یا سہارا نہیں لیا۔ اس طرح اللہ تعالیٰ ہمیں بیک وقت مشاہدہ، تدبر اور دلیل تینوں طریقوں سے کام لے کر اپنی ہستی پر غور کرنے کی دعوت دیتا ہے پھر فرماتا ہے کہ:۔

ولا تجد لسنتنا تحویلا o (سورہ بنی اسرائیل آیت نمبر ۷۷) ''اور تو ہماری سنت یعنی طریق کار میں کوئی تبدیلی اور تضاد نہیں پائے گا''۔

اللہ تعالیٰ اس دلیل کے ذریعے ہمیں ایک بلیغ نکتے کی طرف متوجہ کرتا ہے اور وہ یہ ہے کہ جس ہستی نے اس کائنات کو پیدا کیا ہے وہ اتنی علیم و خبیر ہے کہ اس نے اس نظام شمسی اور اس سے پیدا ہونے والے نتائج کا قبل از وقت اندازہ کر لیا تھا اور اس کا علم اتنا

کامل ہے کہ اس نے اس کائنات کو تخلیق کرتے وقت اس کی تمام ضروریات کا خیال رکھا اوراس کے لئے ایسے قواعد مقرر فرما دیئے جن میں اسے کبھی کسی قسم کی تبدیلی پیدا کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔سورج کا ایک مقررہ سمت سے طلوع ہو کر ایک مقررہ سمت میں غروب ہونا، موسموں کا تغیر وتبدل، آگ، ہوا، پانی اور مٹی کے خواص، زمین، چاند اور سیاروں کے اپنے اپنے راستے اوران کے باہمی فاصلے' ان میں سے ہر شے ایک مقررہ قاعدے کے مطابق کام کر رہی ہے۔اگر یہ نظام کسی ناقص علم والی ہستی کا تخلیق کردہ ہوتا تو اس میں آئے دن تبدیلیاں کرنی پڑتیں اوران تبدیلیوں کی وجہ سے ایک طرف تو اس ہستی میں نقائص ثابت ہوتے اور دوسری طرف اس نظام میں ابتری پیدا ہو جاتی مگر ابتدائے آفرینش سے لے کر آج تک اللہ تعالیٰ کو اس نظام میں کسی تبدیلی کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ یہ ثبوت ہے اس امر کا کہ اس کائنات کا خالق کامل علم والا ہے۔ یہ دلیل دے کر اللہ تعالیٰ ہماری عقل وفکر اور مشاہدے دونوں کے ذریعے سے ہمیں اپنی ہستی کا ادراک عطا فرماتا ہے۔ وہ یہ عقیدہ اندھی عقیدت یا ڈر اور لالچ کے تحت ہم پر مسلط نہیں کرتا۔آگے چل کر اپنی ہستی اوراس کے ہر اعتبار سے کامل واکمل ہونے کے مزید دلائل دیتے ہوئے فرماتا ہے کہ:۔

انا کل شیءٍ خلقنه بقدر ٥ (سورہ القمر آیت نمبر ۴۹) ''ہم نے ہر چیز کو ایک انداز کے مطابق تخلیق کیا ہے'' اور و خلق کل شیءٍ فقدره تقديرا ٥ (سورہ الفرقان آیت نمبر ۲) ''اوراس نے ہر چیز کو پیدا کیا اوراس کا الگ الگ اندازہ مقرر کیا''۔

یعنی اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کو پیدا کرتے وقت اس کے الگ الگ خواص مقرر فرمائے اور اپنے کامل علم غیب کی بنا پر اس میں ایسی طاقتیں رکھیں کہ وہ ہر زمانے کی ضروریات کو پورا کرتی ہیں۔مثلاً اسے علم تھا کہ ایک زمانہ آئے گا جب انسان سفر اور ذرائع رسل ورسائل کے لئے نئی نئی سواریاں ایجاد کرے گا۔ان سواریوں کی ضرورت کے لئے اس نے زمین میں ایسے سیال مادے پیدا کر دیئے جو ریل، موٹر، بحری جہازوں اور ہوائی جہازوں میں استعمال ہوتے ہیں۔اس نے زمین میں ایسی گیسیں پیدا کر دیں جو روشنی،

کھانے تیار کرنے اور مکانوں کو گرم رکھنے کے لئے آگ کا کام دیتی ہیں۔ اس نے زمین میں ایسی دھاتیں پیدا کر دیں جن کی ترقی یافتہ دور کے انسان کو ضرورت پیش آنے والی تھی۔
اس نے یہ اشیاء ایسے صحیح اندازے سے پیدا کیں کہ جب تک یہ دنیا قائم ہے مختلف معدنی اشیاء کے یہ ذخائر اس کے لئے کافی ہوں گے اور جب یہ ذخائر ختم ہونے لگیں گے تو وہ انسان کو ایسے دوسرے طریقے سکھا دے گا جو اس کمی کو پورا کر دیں گے اور انسان کی ضروریات کے لئے کافی ہوں گے کیونکہ وہ فرماتا ہے کہ:۔

لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم ۞ (سورہ التین آیت نمبر ۴) ''ہم نے انسان کو بہترین طریق پر پیدا کیا''۔

ایک اور جگہ فرمایا کہ ''اللہ تعالیٰ بہترین پیدا کرنے والا ہے''۔ یعنی خدا تعالیٰ نے انسان کو اعلیٰ درجے کی دماغی اور جسمانی صلاحیتیں دے کر پیدا کیا ہے، اس میں تدبر و تعقل کے ایسے مادے رکھے ہیں کہ وہ اپنے ماحول اور اپنی ضروریات کے مطابق غور و فکر کر کے تلاش و تحقیق کے نئے راستے نکالتا اور ان کے ذریعے سے اپنے عہد کے مسائل پر قابو پا لیتا ہے، اس لئے جیسے جیسے انسانی آبادی اور اس کے مسائل میں اضافہ ہوتا جائے گا، انسان اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ اعلیٰ صلاحیتوں سے کام لے کر ان مسائل کو حل کرنے کے ذرائع اختیار کرتا جائے گا جن میں نئی نئی صنعتوں، نئے نئے سائنسی آلات اور عمل کے لئے نئے نئے میدان شامل ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم نے انسان کو بہترین طریق پر پیدا کیا ہے۔
یہ دلیل دے کر اس کائنات کا خالق انسان کو اپنی ہستی کا عرفان عطا کرتا ہے اور اسے سمجھاتا ہے کہ اگر اس کا کوئی خالق نہیں اور اس کا علم کامل نہیں تو پھر وہ کون ہے جس نے انسان کو اس کے ماحول اور ضروریات کے مطابق اعلیٰ درجے کی جسمانی اور دماغی صلاحیتیں دے کر پیدا کیا اور زمین و آسمان میں ایسی اشیاء کے ذخائر رکھ دیئے جن کو استعمال کر کے وہ اپنے مسائل اور اپنی مشکلات پر قابو پا لیتا ہے۔ انسان کو مشاہدے اور غور و فکر کی دعوت دیتے ہوئے ایک اور مقام پر فرمایا کہ:۔

ان فی خلق السموات و الارض واختلاف الیل و النهار والفلک

التی تجری فی البحر بما ینفع الناس و ما انزل اللہ من السماء من ماء فاحیا بہ الارض بعد موتھا و بث فیھا من کل دابتہ و تصریف الریح و السحاب المسخر بین السماء و الارض لایت لقوم یعقلون ٥ (سورہ البقرہ آیت نمبر ١٦٤)

''آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے میں اور رات اور دن کے یکے بعد دیگرے آنے میں اور جہازوں میں جو لوگوں کے لئے نفع بخش چیزیں لے کر چلتے ہیں اور بارش کے پانی میں جسے اللہ تعالیٰ نے آسمان سے برسایا اور اس کے ذریعے زمین کو مردہ ہونے کے بعد زندہ کیا اور اس میں انواع و اقسام کے حیوانات پھیلا دیئے اور ہواؤں کے ادھر ادھر رخ تبدیل کرنے میں اور بادلوں میں جو زمین اور آسمان کے درمیان مسخر ہیں بلاشبہ اس قوم کے لئے بہت سے دلائل موجود ہیں جو عقل سلیم رکھتی ہے''۔

ان آیات میں اللہ تعالیٰ پھر زمین و آسمان اور اس کے موجودات کے مشاہدے کی دعوت دیتا ہے' ان پر غور و فکر کی تحریک و تلقین کرتا ہے' وہ خالصتہً براہِ راست انسانی عقل کو خطاب کرتا ہے گویا وہ اپنی ہستی پر اندھا دھند اور سوچے سمجھے بغیر ایمان لانے کا حکم نہیں دیتا۔ پس ان آیات قرآنی کی روشنی میں جو یہاں بطور نمونہ پیش کی گئی ہیں منکرینِ خدا کا یہ دعویٰ باطل ثابت ہوتا ہے کہ خدا اور مذہب کے عقیدے کی بنیاد اندھی عقیدت پر ہے اور اس میں غور و فکر اور مشاہدے کا بالکل دخل نہیں۔

خدا کا تصور اور اقتدارِ کائنات

مفکر اینجلز اور اس کے ہم خیال مفکر خدا اور مذہب کے تصور پر ایک بڑا اعتراض یہ کرتے ہیں کہ ''ان تصورات سے عناصر فطرت کے سامنے انسان کی بے بسی ظاہر ہوتی ہے اور یہ نظریات اس کائنات اور اس کے موجودات پر انسان کی قدرت اور برتری ثابت نہیں کرتے بلکہ انسان کو عناصر فطرت کا غلام بنا دیتے ہیں''۔ لیکن اسلام جس خدا کا تصور پیش کرتا ہے' جس طرح وہ خود قادر و توانا ہے اسی طرح اس نے انسان کو بھی بہت سی طاقتیں اور قدرتیں دے کر پیدا کیا ہے اور ان قدرتوں اور طاقتوں کے ذریعے وہ عناصر فطرت پر

اقتدار حاصل کر لیتا ہے۔قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنا نائب قرار دے کر اس کی حیرت انگیز قوتوں کا انکشاف واعلان فرمادیا ہے۔ارشاد ہوا:۔

انی جاعل فی الارض خلیفه o (سورہ البقرہ آیت نمبر ۳۰) ''میں (بنی آدم کو) زمین میں اپنا نائب بناؤں گا''۔

اگر تھوڑے سے بھی تدبر سے کام لیا جائے تو ہر منصف مزاج کو اس حقیقت کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ اللہ تعالیٰ نے ان چند الفاظ میں انسان کی جدوجہد، اس کی حیرت انگیز جسمانی، علمی اور دماغی قوتوں اور اقتدار وحکومت کی پوری تاریخ سمودی ہے۔ہم اپنی مادی زندگی میں آئے دن مشاہدہ کرتے ہیں کہ جب ایک شخص کو کسی حاکم کا نائب مقرر کیا جاتا ہے تو اس نائب میں نیابت کے تمام اوصاف وکمالات کو پیش نظر رکھ کر یہ منصب دیا جاتا ہے۔گورنر، بادشاہ یا صدر مملکت کا نائب ہوتا ہے' جب تک اس میں وہ طاقتیں، کمالات اور اختیارات نہ ہوں جو بادشاہ یا صدر مملکت کی نیابت کے لئے ضروری ہیں اس وقت تک وہ فرائض نیابت سرانجام نہیں دے سکتا۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ''میں انسان کو زمین میں اپنا نائب بناؤں گا''۔اس ارشاد ربانی میں واضح اشارہ موجود ہے کہ انسان کو وہ تمام خصوصیات، کمالات اور اقتدار واختیار بھی دیا جائے گا جو اللہ تعالیٰ کی نیابت کرنے کے لئے ضروری ہے کیونکہ اس کے بغیر وہ خدا کے فرائض نیابت سرانجام نہیں دے سکتا۔ایک اور جگہ ارشاد فرمایا:

لما خلقت بیدی o (سورہ ص آیت نمبر ۷۵) ''جس (آدم) کو میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے تخلیق کیا''۔

اللہ تعالیٰ نے اس کائنات اور اس کی ہر چیز کو اپنی تخلیق قرار دیا ہے مگر کسی چیز کی تخلیق کے بارے میں یہ نہیں فرمایا کہ میں نے اسے دونوں ہاتھوں سے پیدا کیا۔یہ الفاظ صرف آدم کے متعلق استعمال فرمائے' اس میں یہی بلیغ نکتہ ہے کہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے بہت سے کمالات کا جامع بنایا ہے' دونوں ہاتھوں سے پیدا کرنے کا یہی مفہوم ہے کہ اس میں تمام اعلیٰ درجے کی صفات ودیعت کردی ہیں' چونکہ اسے روئے زمین پر اللہ تعالیٰ کی نیابت کرنا تھی اس لئے اس میں صفات الٰہی بھی پیدا کردی گئیں۔مثلاً خدا رازق ہے' اس نے

انسان میں بھی یہ صفت رکھ دی کہ وہ دوسروں کو رزق دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ رحیم و کریم ہے اس نے انسان میں بھی رحم کا مادہ رکھ دیا۔ اللہ تعالیٰ عفو و کرم کا بحر بیکراں ہے اس نے انسان میں بھی دوسروں کو معاف کر دینے کی صفت ودیعت فرمائی۔ اللہ تعالیٰ خالق ہے اس نے انسان میں بھی تخلیق کی صفت رکھ دی۔ اللہ تعالیٰ موجد ہے اس نے انسان کو بھی ایجاد و اختراع کرنے والا ذہن عطا فرمایا۔ اللہ تعالیٰ منتظم ہے اس نے انسان کو بھی انتظامی صلاحیتوں سے نوازا۔ اللہ تعالیٰ حاکم ہے اس نے انسان میں بھی حکومت و اقتدار کی صلاحیتیں پیدا کر دیں۔ غرض وہ تمام کمالات جو اللہ تعالیٰ میں موجود ہیں ان میں سے بہت سے انسان میں پائے جاتے ہیں۔ فرق اتنا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے کمالات اس کے ذاتی اور ہر نقص سے پاک ہیں مگر انسان کے کمالات اس کے ذاتی نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ ہیں اور نقص سے پاک نہیں۔ چونکہ انسان کو ایک محدود زمانے اور محدود کائنات میں فرض نیابت ادا کرنا تھا اس لئے اس کے یہ کمالات بھی محدود ہیں۔ غرض انسان کو زمین پر اپنا نائب قرار دے کر اللہ تعالیٰ نے انسان کی قوت و اقتدار کی طرف اشارہ کر دیا۔ پھر قرآن حکیم میں اس کے اقتدار اور عناصر فطرت پر اس کے غلبے کی ان الفاظ میں نشان دہی فرمائی کہ:۔

و سخر لکم ما فی السموات و ما فی الارض جمیعا منه ○ (سورہ الجاثیہ آیت نمبر ۱۳) ''اور زمین و آسمان میں جتنی اشیاء ہیں ان سب کو انسان کے لئے مسخر کر دیا گیا ہے''۔ دوسری جگہ فرمایا کہ ''ہم نے سورج اور چاند کو انسان کے لئے مسخر کر دیا''۔ ان دونوں آیات سے ثابت ہوتا ہے کہ عناصر فطرت اور اس کائنات پر انسان کو برتری اور غلبہ و اقتدار حاصل ہے وہ ان چیزوں کا غلام اور تابع فرمان نہیں جیسا کہ منکرین خدا کہتے ہیں ایک اور جگہ فرمایا کہ:۔

الله الذی سخر لکم البحر لتجری الفلک فیه بامره و لتبتغوا من فضله و لعلکم تشکرون ○ (سورہ الجاثیہ آیت نمبر ۱۲) ''اللہ ہی ہے جس نے سمندر کو تمہارے لئے مسخر کر دیا تا کہ اس کے حکم سے اس میں جہاز چلیں، اور تا کہ تم اپنا رزق تلاش کرو اور شکر گزار بنو''۔

دوسری جگہ ارشاد ہوا کہ:۔

ولقد کرمنا بنی ادم و حملنھم فی البر و البحر ورزقنھم من الطیبت و فضلنھم علی کثیر ممن خلقنا تفضیلاO (سورہ بنی اسرائیل آیت نمبر ۷۰) ''اور ہم نے اولادِ آدم کو بڑی عزت دی اور اس کے لئے خشکی اور پانی میں سواریوں کا انتظام کیا اور اسے نفیس اور پاکیزہ چیزیں عطا کیں اور ہم نے اسے بہت سی مخلوق پر فوقیت دی''۔

ان تمام آیات کریمہ میں اس کائنات اور اس کے موجودات پر انسان کی فضیلت اور غلبہ واقتدار کا بار بار اعلان کیا جارہا ہے۔اسے موجودات عالم میں سب سے افضل ومعزز قرار دیا گیا ہے ظاہر ہے کہ منکرین خدا کے بقول مذہب کی رو سے اگر انسان عناصر فطرت کا غلام ہے تو اسے موجودات عالم پر کوئی فضیلت اور شرف حاصل نہیں ہونا چاہئے' مگر خداوند تعالیٰ بار بار اعلان فرمارہا ہے کہ انسان اس کائنات میں میرا نائب ہے، وہ ساری کائنات میں سب سے محترم ومعزز ہے،اس کے لئے سورج اور چاند کو قابل تسخیر بنادیا گیا ہے، دریاؤں اور سمندروں کو اس کے تابع فرمان کردیا گیا ہے، زمین وآسمان کے درمیان جو کچھ ہے اس سب کو بنی آدم کی خدمت پر متعین کردیا گیا ہے، یعنی اس میں ایسی صلاحیتیں پیدا کر دی گئی ہیں کہ وہ حسب ضرورت سورج سے توانائی حاصل کرکے اسے اپنی ضروریات کے لئے استعمال کرے گا، چاند پر پہنچ کر وہاں کے مستور رازوں سے نقاب اٹھائے گا، زمین کی پرتیں کھول کھول کر اس کے پوشیدہ اسرار معلوم کرے گا اور اس میں پائی جانے والی چیزوں سے فائدہ اٹھائے گا، سمندروں اور دریاؤں پر فرماں روائی کرے گا اور اپنی منشا کے مطابق انہیں جس طرح چاہے گا استعمال کرے گا۔کیا اس کائنات اور عناصر فطرت پر انسان کے غلبہ واقتدار کا اس سے زیادہ واضح اعلان ہوسکتا ہے؟ ان حقائق کی روشنی میں منکرین خدا کا یہ دعویٰ بھی باطل ہوجاتا ہے کہ خدا اور مذہب کا تصور انسان کو اس کائنات پر کوئی غلبہ واقتدار عطا نہیں کرتا بلکہ عناصر فطرت کا غلام بنا دیتا ہے۔حقائق اس کے خلاف شہادت دیتے ہیں۔منکرین خدا کا سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ خدا اور مذہب کا تصور سائنس کی ضد ہے۔چونکہ یہ ایک مستقل موضوع ہے اس لئے ہم اس اعتراض پر انشاء اللہ ایک الگ باب

میں تفصیل سے اظہار خیال کریں گے۔

خدا اپنے بندوں کو دُکھ کیوں دیتا ہے؟

منکرینِ خدا ہستیٔ باری تعالیٰ پر جو اعتراضات کرتے ہیں ان میں سے ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ اگر خدا موجود ہے اور وہ رحمان و رحیم بھی ہے تو پھر اپنے بندوں کو دُکھ کیوں دیتا ہے' ان پر تکالیف کیوں آتی ہیں' وہ مصائب و آلام میں کیوں گرفتار ہوتے ہیں؟؟؟ سو پہلی بات تو یہ یاد رکھنا چاہئے کہ دُکھ دو قسم کے ہوتے ہیں ایک وہ جو انسان اپنی حماقتوں' اپنی غلطیوں اور اپنی بے اعتدالیوں کے ہاتھوں خود پیدا کرتا ہے۔ دوسرے دکھ وہ ہوتے ہیں جو انسان کے اپنے پیدا کردہ نہیں ہوتے بلکہ قانونِ قدرت کے مطابق اسے پہنچتے ہیں۔ جو دکھ انسان کی اپنی کوتاہیوں اور غلطیوں کی وجہ سے اس پر وارد ہوتے ہیں ان کی طرف اللہ تعالیٰ اس آیت مقدسہ میں اشارہ فرماتا ہے: "**وما اصابکم من مصیبة فبما کسبت ایدیکم الخ**" (یعنی جو دکھ تمہیں پہنچتے ہیں' جو مصائب و آلام تم پر آتے ہیں ان میں سے اکثر تمہارے اپنے ہاتھوں کی کمائی ہوتے ہیں۔ (گویا خدا تعالیٰ تمہیں ان دُکھوں میں نہیں ڈالتا۔) (الشوریٰ آیت ۳۰) اب اس کی تھوڑی سی تفصیل:۔

اللہ تعالیٰ نے ہر شخص کو عقل و فہم دے کر پیدا کیا ہے' بھلے برے اور نیک و بد میں امتیاز کرنے کی صلاحیت عطا فرما کر دنیا میں بھیجا ہے' علم و حکمت کے دروازے اپنے بندوں پر کھول دیئے ہیں' پیدائش سے لے کر موت تک پیش آنے والے مراحلِ حیات سے انہیں آگاہ فرما دیا ہے۔ انہیں بتا دیا ہے کہ اگر تم آگ میں ہاتھ ڈالو گے تو جل جاؤ گے' مضرِ صحت اشیاء استعمال کرو گے تو بیمار ہو جاؤ گے' حفظانِ صحت کے اصولوں کی خلاف ورزی کرو گے تو جسم و جاں دونوں کو خود آزار میں ڈالو گے۔ اپنی بیویوں کے پاس ضرور جاؤ لیکن اگر اعتدال اور احتیاط کا دامن چھوڑ دو گے تو خود بھی نقصان اٹھاؤ گے' شریکِ حیات بھی نقصان اٹھائے گی اور پیدا ہونے والا بچہ بھی نقصِ اعضا اور بیماریوں کی "سوغات" لے کر شکمِ مادر سے نکلے گا۔ اگر اپنے جذبات کو قابو میں نہیں رکھو گے' غیظ و غضب کے عالم میں ہوش و حواس کھو بیٹھو

گے تو دوسروں کی جان بھی لو گے اور اپنی جان بھی کھو گے اور ایک نہیں کئی خاندانوں پر مصائب و آلام کے پہاڑ ٹوٹ پڑیں گے۔

گویا خدا تعالیٰ نے انسان کو ہلاکت اور تباہی و بربادی کے حوالے ہرگز نہیں کیا بلکہ ہلاکت و بربادی سے بچنے کی بار بار تاکید فرمائی اور وہ تمام طریقے بتا دیئے جنہیں اختیار کر کے وہ پرامن، پرسکون اور کامیاب و کامراں زندگی گزار سکتا ہے۔ اس کے بعد بھی اگر وہ احتیاط نہیں کرتا، اعتدال کا دامن چھوڑ دیتا ہے، اپنے جذبات پر قابو نہیں پاتا اور ہلاکت کے راستے پر خود چل پڑتا ہے تو خداوند تعالیٰ پر الزام کیسے عائد کیا جا سکتا ہے؟ پس ثابت ہوا کہ ہمیں جتنے دُکھ پہنچتے ہیں ان میں سے بہت سے دکھوں کے ہم خود ذمہ دار ہوتے ہیں۔ خداوند تعالیٰ ہرگز ذمہ دار نہیں ہوتا بلکہ جیسا کہ وہ خود فرماتا ہے: وما اصابکم من مصیبة فبما کسبت ایدیکم الخ ''آخر میں فرمایا کہ وہ تو تمہاری بہت سی کوتاہیوں کو معاف بھی کر دیتا ہے''۔ (الشوریٰ آیت ۳۰) یعنی ہمارے غلط اقدامات و حرکات کے بدنتائج سے ہمیں بچا بھی لیتا ہے۔

یہ تو وہ دکھ اور مصائب ہیں جن کا تعلق ہمارے ارادے سے ہے اور جن کے ہم خود ذمہ دار ٹھہرتے ہیں لیکن بہت سے مصائب و آلام اور دکھ ایسے بھی ہیں جن میں ہمارے ارادے کا دخل نہیں ہوتا۔ مثال کے طور پر متعدی بیماریاں پھیل جاتی ہیں، زلزلے آتے ہیں، کوہ آتش فشاں پھٹ پڑتے ہیں، طوفانِ بادوباراں آ جاتے ہیں، سیلاب بلاخیز اُمنڈ آتے ہیں، آبادیاں کی آبادیاں صفحۂ ہستی سے نیست و نابود ہو جاتی ہیں، تمیں تمیں ہزار اور پچاس پچاس ہزار افراد لقمہ اجل بن جاتے ہیں اور جو موت کے منہ میں جانے سے بچ جاتے ہیں ان میں سے سینکڑوں اور ہزاروں ایسی تکالیف میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ اس سے تو موت ہی بھلی۔ اسی طرح چنگیز اور ہلاکو جیسے ظالم اور سفاک سلاطین حملہ آور ہوتے ہیں اور شہروں کو کھنڈر بنا کر چلے جاتے ہیں ...... اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ اس وقت اللہ تعالیٰ کی رحمانیت اور رحیمیت جوش میں کیوں نہیں آتی۔ یہ حادثات اور مصائب و آلام تو انسان خود پیدا نہیں کرتا، آخر ان کا ذمہ دار کون ہے؟

سو یاد رکھنا چاہئے کہ یہ مصائب و آلام بھی بہت حد تک خود انسان کے اپنے پیدا کردہ ہوتے ہیں اور ان کی طرف اللہ تعالیٰ اس آیت مقدسہ میں اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ ''الم یروا کم اھلکنا من قبلھم من قرن مکنھم فی الارض الخ'' (یعنی کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ ان سے پہلے ہم کتنی ہی قوموں کو ہلاک کر چکے ہیں جنہیں ہم نے دنیا میں ایسی قوت دی تھی جو تم کو نہیں دی اور ہم نے ان پر موسلا دھار بارشیں برسائی تھیں اور ایسی نہریں جاری کر دی تھیں جو ان کے قبضے میں تھیں پھر ہم نے انہیں ان کے گناہوں اور (ظلم) کی وجہ سے ہلاک کر دیا......) (الانعام آیت ۶)

اس سے معلوم ہوا کہ جب کوئی قوم اپنی نافرمانی، سرکشی اور گناہوں کے ارتکاب میں حد سے گزر جاتی ہے، بار بار کی تنبیہ کے باوجود ظلم و عصیاں میں بڑھتی ہی چلی جاتی ہے اور اللہ تعالیٰ اپنے علم غیب کی بنا پر دیکھ لیتا ہے کہ اب مستقبل میں اس کے سنورنے اور سدھرنے کا قطعاً امکان نہیں تو وہ اسے زلزلوں، سیلابوں، مہلک اور تباہ کن بیماریوں یا جابر و سفاک سلاطین کے ذریعے پکڑ لیتا ہے تاکہ دوسروں کو عبرت حاصل ہو۔ یہ مصائب و آلام، یہ عبرت ناک بربادی خود اس قوم کی اپنی پیدا کردہ ہوتی ہے خدا تعالیٰ تو اس کا ذمہ دار نہیں۔

دکھوں، تکلیفوں اور مصائب و آلام کی ایک قسم وہ ہے جو بلاشبہ کسی صورت میں انسان کی اپنی پیدا کردہ نہیں ہوتی بلکہ یہ مصائب و آلام قانونِ قدرت کے تحت آتے ہیں چنانچہ اللہ تعالیٰ ان مصائب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ ''ولنبلونکم بشیء من الخوف والجوع و نقص من الاموال والانفس والثمرات الخ'' (یعنی ہم کسی حد تک تمہاری آزمائش کریں گے خوف کے ذریعے سے بھوک کے ذریعے سے، مالوں، جانوں اور فصلوں میں کمی کے ذریعے سے (ان حالات میں بھی) صبر کرنے والوں کو خوشخبری دے دیجئے کہ جب ان پر کوئی مصیبت آئے تو گھبراتے نہیں بلکہ (اگر کچھ) کہتے ہیں تو یہ کہ ہم تو اللہ تعالیٰ کے ہیں اور اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔ (البقرہ آیت ۱۵۵ و ۱۵۶) گویا اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی بتا دیا کہ وہ اپنے بندوں کی مختلف طریقوں سے آزمائش کرے گا، اس کے یہ بندے قحط سالی میں مبتلا کئے جائیں گے،

مہلک بیماریاں ان کے درمیان پھیلیں گی' ان پر جنگیں مسلط کی جائیں گی جس کے نتیجے میں ہر طرف خوف طاری ہو جائے گا' امن واماں تباہ ہو جائے گا' خود وہ اور ان کے عزیز واقارب قتل کئے جائیں گے۔ فرماتا ہے کہ یہ اس لئے ہوگا تاکہ لوگوں کی آزمائش کی جائے اور اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو ظاہر کر دے جو انتہائی ناخوشگوار حالات میں بھی ثابت قدم رہے' اس طرح یہ لوگ دوسروں خصوصاً کمزور ایمان والوں کے لئے قابل تقلید نمونہ بن جائیں۔

اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ صرف یہ دیکھنے کے لئے کہ اللہ تعالیٰ کے کتنے بندے سخت نامساعد حالات میں بھی ثابت قدم رہتے ہیں وہ انہیں ہولناک تباہی میں ڈال دیتا ہے' ہرگز ایسا نہیں وہ تو عالم الغیب ہے اسے تو معلوم ہے کہ اس کا کون سا بندہ کتنے پانی میں ہے اور کس مقام پر کھڑا ہوا ہے ــــ بلکہ یہاں مطلب یہ ہے کہ دنیا میں جو ناخوشگوار واقعات پیش آتے ہیں وہ قوانین قدرت کے تحت پیش آتے ہیں اور یہ اس کے بندوں کے لئے آزمائش کا ذریعہ بھی بن جاتے ہیں اور بس' اس سے زیادہ اور کچھ نہیں۔ اب سوال پیدا ہوگا کہ قانونِ قدرت کے تحت رونما ہونے والے یہ واقعات پیش ہی کیوں آتے ہیں؟ سو معلوم ہونا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کی ہر چیز کی ایک عمر مقرر فرمائی ہے جسے وہ ''اجل'' اور ''قدر'' (اندازے) کے الفاظ سے موسوم کرتا ہے چنانچہ فرماتا ہے کہ ''انا کل شیء خلقنه بقدر'' (یعنی ہم نے ہر چیز کو ایک (مقررہ) اندازے پر پیدا کیا ہے۔ القمر آیت ۴۹) پھر فرمایا کہ ''لکل امة اجل'' (یعنی ہر قوم کے لئے ایک مدت عمر مقرر کر دی گئی ہے۔ سورہ یونس آیت ۴۹) گویا زمین وآسمان اور ان میں پائی جانے والی ہر چیز کی ایک میعاد مقرر ہے اس کے مطابق وہ اپنی عمر گزار کر فنا ہو جاتی ہے۔ فنا کا یہ عمل مختلف طریقوں سے ظاہر اور مکمل ہوتا ہے جس میں زلزلے' طوفان' بیماریاں' سیلاب اور حادثات وغیرہ شامل ہیں جس کے نتیجے میں آبادیاں' اشیاء اور انسان فنا سے ہمکنار ہو جاتے ہیں۔ اس میں کوئی اعتراض کی بات نہیں کیونکہ کیا انسان' کیا حیوان کیا دیگر مخلوقات سب کا انجام فنا ہی ہے اور فنا کے لئے کوئی نہ کوئی ذریعہ اور طریقہ تو ہونا چاہئے۔

مصائب وآلام کی ایک قسم اور ہے۔ مثال کے طور پر ٹرین دریا میں جا گری'

مسافر بردار طیارہ کسی فنی نقص کی وجہ سے تباہ ہو گیا' بس کا ٹائی راڈ کھل گیا' جہاز سمندر میں ڈوب گیا۔ اس طرح سیکڑوں افراد اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے اور ان کے عزیزوں پر دکھوں اور مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ اس کی ذمہ داری کیا خدا تعالیٰ پر عائد نہیں ہوتی کہ وہ اس کائنات کا خالق ہے؟ یہ اعتراض بھی نادانی کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ بسیں' ریلیں' جہاز خدا نے تو نہیں بنائے' انسانوں نے بنائے۔ اصل اعتراض تو ان پر عائد ہوتا ہے کہ انہوں نے سفر اور نقل و حمل کے یہ ذرائع ایجاد کرتے وقت یہ حقیقت کیوں پیش نظر نہیں رکھی کہ یہ چیزیں حادثات کا شکار بھی ہو سکتی ہیں۔ انہوں نے قبل از وقت اس کا تدارک کیوں نہیں کیا بلکہ ہزاروں ہزار حادثے دیکھنے کے بعد بھی تدارک نہیں کر سکے۔ انہوں نے ایسی ایجادات کیوں ڈیزائن نہیں کیں جو حادثات سے محفوظ رہتیں پس اس کے ذمہ دار تو خود وہ ہیں نہ کہ اللہ تعالیٰ۔

اعتراض کیا جاتا ہے کہ چار پانچ سال کا ایک بچہ بستر علالت پر پڑا ایڑیاں رگڑ رہا ہے' اس کے بستر کے پاس کھڑے اس کے عزیز و اقارب اسے حسرت و یاس سے تک رہے ہیں مگر کچھ نہیں کر سکتے اور وہ سسک سسک کر مر جاتا ہے اس طرح بچے کی جان بھی گئی اور اس کے گھر والے بھی یکے بعد دیگرے دو مصیبتوں میں مبتلا ہو گئے' پہلے اس کی طویل اور انتہائی تکلیف دہ بیماری اور پھر اس کی بے کسی و بے بسی کی موت؟ یہاں اعتراض کرنے والوں سے سوال کیا جا سکتا ہے کہ ان کے اس اعتراض کو چار پانچ سال کے بچے ہی تک کیوں محدود رکھا جائے؟ چار پانچ سال کا معصوم بچہ ہو یا بیس بائیس سال کا جوانِ رعنا' ادھیڑ عمر کا شخص ہو یا سن رسیدہ بزرگ' جو شخص بھی بیمار ہو کر فوت ہوتا ہے اس کی بیماری اور پھر موت اس کے اہل خانہ کے لئے مصائب و آلام کی وجہ بن جاتی ہے کیا اس سے یہ لازم نہیں آئے گا کہ اس لئے نہ کسی کو بیمار پڑنا چاہئے نہ فوت ہونا چاہئے یعنی ہمیشہ زندہ رہنا چاہئے۔ سوچئے کوئی معقولیت ہے اس اعتراض میں؟

گویا خداوند تعالیٰ کی ہستی کے یہ منکر اس طرح دراصل کہنا یہ چاہتے ہیں کہ ٹھیک ہے! ہم اپنی ہلاکت کے سامان خود پیدا کرتے ہیں لیکن کیا اللہ تعالیٰ ہمیں ایسے قدم اٹھانے

سے روک نہیں سکتا تھا جن کے نتیجے میں مصائب و آلام ہمارا مقدر بن جاتے ہیں؟ منکرینِ خدا کے اس اعتراض سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان لوگوں نے اللہ تعالیٰ کی ہستی پر اعتراضات کرنے اور کرتے چلے جانے کی قسم کھا رکھی ہے اور کج بحثی کو اپنا شعار بنالیا ہے، شاید ایسے ہی لوگوں کے بارے میں ہمارے ایک شاعر نے کہا تھا کہ ؎

کوئی یہ شکوہ سرایانِ "جور" سے پوچھے
وفا بھی حسن ہی کرتا تو آپ کیا کرتے؟ (۱)

اگر سارے کام خدا ہی کو کرنے تھے تو ہمیں کس مرض کی دوا کے لئے پیدا کیا گیا؟ پھر تو یہ ہونا چاہئے تھا کہ ادھر ہمارے سر میں درد ہوا اور اُدھر آسمان سے فرشتے نے اُتر کر ہمارا درد دور کر دیا ــــ یا ہمارے جسم کو اس طرح تخلیق کیا جاتا کہ ہمیں کوئی مرض لاحق ہی نہ ہوتا۔ سوچئے اگر ایسا ہوتا تو نہ طبی تحقیق کی ضرورت پیش آتی، نہ انسانی جسم اور اس کے اعضا کا علم معرضِ اظہار میں آتا، نہ جڑی بوٹیوں پر تحقیق ہوتی، نہ کتابوں اور رسالوں کا وجود ہوتا، نہ سرجری کے تصور سے کوئی واقف ہوتا، نہ دنیا میں میڈیکل کالج ہوتے، نہ حکیم اور ڈاکٹر ہوتے، نہ دوائیں تیار ہوتیں، نہ دواخانے قائم ہوتے بلکہ علم و فن کا وجود ہی نہ ہوتا اور دنیا جہالت اور بے علمی کا گہوارہ بن کر رہ جاتی۔

اعتراض کیا جاسکتا ہے کہ دنیا میں قتل و غارت کا طوفان کیوں برپا ہے؟ معصوم اور عفت مآب عورتوں کی عصمت دری کیوں ہوتی ہے؟ خدا نے ایسے انسان کیوں نہ پیدا کئے جو اس قسم کے جذبات سے ماورا ہوتے، نہ وہ جذبات سے مغلوب ہوتے اور نہ دنیا میں جسموں اور عزتوں کا قتل ہوتا؟ کاش ان لوگوں کو معلوم ہوتا کہ جس خدا کی ہستی کا یہ انکار کرتے ہیں وہ صاحبِ حکمت و دانش بھی ہے بلکہ تمام تر حکمت و دانش کا سرچشمہ ہے۔ اسے روئے زمین پر فرشتے نہیں انسان پیدا کرنے تھے، اگر وہ ایسے انسان پیدا کرتا جن کے دل و دماغ جذبات سے محروم ہوتے تو آج دنیا میں زندگی کا وجود ہی نہ ہوتا کیونکہ یہ جذبات ہی ہیں جن سے مغلوب ہو کر مرد عورت کی طرف راغب ہوتا ہے اور عورت مرد کی طرف راغب

---

(۱) سیماب اکبر آبادی

ہوتی ہے۔اللہ تعالیٰ نے دونوں کے چہروں اور جسموں میں ایسی کشش پیدا کر دی ہے کہ ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر اور ان کے قریب ہو کر دل و دماغ میں جذبات کا طوفان اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔اس طرح ایک طرف وہ جنسی تسکین حاصل کرتے ہیں اور دوسری طرف نسلِ انسانی کی افزائش کا سلسلہ بھی جاری رہتا ہے۔اس کے ساتھ ساتھ وہ خدا جس نے مرد وعورت کے چہروں اور جسموں میں ایک دوسرے کے لئے کشش پیدا کی اور دونوں کے دل و دماغ میں جذبات پیدا کئے اسی خدا نے دونوں کو ہدایت بھی فرمادی کہ تم ان جذبات کی تسکین کے لئے وہ راستے اختیار نہ کرنا جو گھوڑے اور گدھے اختیار کرتے ہیں، کتے اور بلے اختیار کرتے ہیں کیونکہ تم اشرف المخلوقات ہو، اس کائنات کا خلاصہ اور جوہر ہو، تہذیب نفس اور تہذیب کائنات کے لئے پیدا کئے گئے ہو اس لئے تم جذبات کی تسکین کے لئے وہ راستے اختیار کرنا جو میں (اللہ) تمہارے لئے مقرر کر رہا ہوں۔اس کے بعد اس نے دونوں کو جذبات پر قابو پانے کے طریقے بتا دیئے کہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ایک دوسرے کی طرف مت دیکھا کرو، فرمایا "قل للمومنین یغضوا من ابصارهم الخ" (یعنی مومنوں سے فرمادیجئے کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھا کریں۔النور آیت ۳۰) پھر فرمایا کہ: "وقل للمومنٰت یغضضن من ابصار هن" (یعنی اے رسول) فرمادیجئے مومن عورتوں سے کہ وہ (بھی) اپنی نگاہیں نیچی رکھا کریں......النور آیت ۳۱) مزید فرمایا کہ غیر محرم عورت کے قریب ہونے حتیٰ کہ اس کی آواز سننے سے بھی اپنے کان بند رکھا کرو، سوائے کسی خاص ضرورت یا مجبوری کے۔ایک اور مقام پر فرمایا کہ "یا یها النبی قل لازواجک و بناتک و نساء المومنین الخ" (یعنی اے میرے نبی! اپنی بیویوں، اپنی بیٹیوں اور مومنوں کی عورتوں سے کہہ دیجئے کہ جب وہ گھروں سے باہر نکلیں تو اپنی بڑی چادروں کو سروں پر سے گزار کر سینوں پر لے آیا کریں۔الاحزاب آیت ۵۹)۔آگے چل کر مزید وضاحت کر دی کہ "ولا یبدین زینتهن الخ" یعنی مومن عورتوں سے (بھی) کہہ دیجئے کہ وہ اپنی زینت کو (غیر مردوں پر) ظاہر نہ کیا کریں......اور اپنے پیروں کو زمین پر زور سے نہ ماریں کہ ان کی پوشیدہ زینت ظاہر ہو جائے۔(النور آیت ۳۱) مختصر یہ کہ مردوں اور عورتوں دونوں کو ایسے

راستے اختیار کرنے سے روک دیا گیا جو جنسی جذبات میں اشتعال پیدا کرنے کا موجب ہوتے ہیں اوران کی جسمانی قربت کوشادی کے ذریعے محدود کردیا۔

اب اگر ایک شخص خواہ وہ مرد ہو یا عورت احکام خداوندی کی خلاف ورزی کرتا ہے، قانونِ قدرت کوتوڑتا ہے، شہوانی جذبات سے مغلوب ہوکراس فعل کا ارتکاب کرتا ہے جسے حرام قرار دیا گیا ہے اوراس کے نتیجے میں ناجائز بچہ پیدا ہوجاتا ہے، پھر دونوں قانون یا معاشرے کی گرفت میں آجاتے ہیں نتیجہ یہ کہ طرح طرح کی پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں، غیرت کے جذبات سے مغلوب ہوکر طرفین کے عزیز واقارب ایک دوسرے سے برسر پیکار ہوجاتے ہیں، انسانی جانوں کا اتلاف ہوتا ہے اور ایک نہیں کئی خاندان معاشرتی اور معاشی ناہمواریوں اوردُکھوں کا شکار ہوجاتے ہیں تو یہ قصور کس کا ہے؟ کیا اللہ تعالیٰ پراس کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے یا ان بدبخت مردوں اورعورتوں پر جو اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوئے قوانین کی خلاف ورزی کرتے ہیں؟ عقلِ سلیم خوداس کا فیصلہ کرسکتی ہے۔

آپ نے دیکھا کہ جذبات کے سرکش گھوڑے کوشترِ بے مہار کی طرح آزاد چھوڑ دینے کا کیا نتیجہ نکلا؟ پس جذبات اپنی ذات میں برے پیدانہیں کیے گئے، ان کا استعمال انہیں اچھا یا برا بنادیتا ہے اورظاہر ہے کہ ان کا استعمال خود ہمارے اختیار میں ہے اس طرح اپنے جسم اور جان کودکھوں میں ڈالنے کے ہم خود ذمہ دار قرار پاتے ہیں نہ کہ اللہ تعالیٰ۔

ان لوگوں کی عقل وفہم پر حیرت ہوتی ہے جو یہ اعتراض کرتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ کو جو قادرِ مطلق بھی ہے، معلوم تھا کہ دنیا میں جو حادثات پیش آتے ہیں ان کا شکار ہونے والے لوگوں میں بے قصور بھی شامل ہوتے ہیں تو وہ انہیں بچاتا کیوں نہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یقیناً وہ انہیں بچاسکتا تھا مگر وہ قادرِ مطلق ہونے کے ساتھ ساتھ منصف و عادل بھی ہے، صرف عادل ہی نہیں بلکہ عادل حقیقی۔ اگر وہ ایک یا چند افراد کو بچالیتا تو جانب دار ٹھہرتا، انصاف کا تقاضا تھا کہ وہ سب سے یکساں سلوک کرتا، گویا جو شخص بھی مصیبت سے دوچار ہونے لگتا وہ فوراً اسے بچانے کے لئے آجاتا۔ اس صورت میں تو سارا نظام کائنات ہی درہم برہم ہوجاتا کیونکہ جب لوگوں پر کوئی مصیبت ہی نہ آتی، کسی کو کوئی تکلیف ہی نہ

راستے اختیار کرنے سے روک دیا گیا جو جنسی جذبات میں اشتعال پیدا کرنے کا موجب ہوتے ہیں اور ان کی جسمانی قربت کو شادی کے ذریعے محدود کر دیا۔

اب اگر ایک شخص خواہ وہ مرد ہو یا عورت احکام خداوندی کی خلاف ورزی کرتا ہے' قانونِ قدرت کو توڑتا ہے' شہوانی جذبات سے مغلوب ہو کر اس فعل کا ارتکاب کرتا ہے جسے حرام قرار دیا گیا ہے اور اس کے نتیجے میں ناجائز بچہ پیدا ہو جاتا ہے' پھر دونوں قانون یا معاشرے کی گرفت میں آ جاتے ہیں نتیجہ یہ کہ طرح طرح کی پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں' غیرت کے جذبات سے مغلوب ہو کر طرفین کے عزیز و اقارب ایک دوسرے سے برسر پیکار ہو جاتے ہیں' انسانی جانوں کا اتلاف ہوتا ہے اور ایک نہیں کئی خاندان معاشرتی اور معاشی ناہمواریوں اور دُکھوں کا شکار ہو جاتے ہیں تو یہ قصور کس کا ہے؟ کیا اللہ تعالیٰ پر اس کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے یا ان بد بخت مردوں اور عورتوں پر جو اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوئے قوانین کی خلاف ورزی کرتے ہیں؟ عقلِ سلیم خود اس کا فیصلہ کر سکتی ہے۔

آپ نے دیکھا کہ جذبات کے سرکش گھوڑے کو شترِ بے مہار کی طرح آزاد چھوڑ دینے کا کیا نتیجہ نکلا؟ پس جذبات اپنی ذات میں برے پیدا نہیں کئے گئے' ان کا استعمال انہیں اچھا یا برا بنا دیتا ہے اور ظاہر ہے کہ ان کا استعمال خود ہمارے اختیار میں ہے اس طرح اپنے جسم اور جان کو دکھوں میں ڈالنے کے ہم خود ذمہ دار قرار پاتے ہیں نہ کہ اللہ تعالیٰ۔

ان لوگوں کی عقل و فہم پر حیرت ہوتی ہے جو یہ اعتراض کرتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ کو جو قادرِ مطلق بھی ہے' معلوم تھا کہ دنیا میں جو حادثات پیش آتے ہیں ان کا شکار ہونے والے لوگوں میں بے قصور بھی شامل ہوتے ہیں تو وہ انہیں بچاتا کیوں نہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یقیناً وہ انہیں بچا سکتا تھا مگر وہ قادرِ مطلق ہونے کے ساتھ ساتھ منصف و عادل بھی ہے' صرف عادل ہی نہیں بلکہ عادل حقیقی۔ اگر وہ ایک یا چند افراد کو بچا لیتا تو جانب دار ٹھہرتا' انصاف کا تقاضا تھا کہ وہ سب سے یکساں سلوک کرتا' گویا جو شخص بھی مصیبت سے دوچار ہونے لگتا وہ فوراً اسے بچانے کے لئے آ جاتا۔ اس صورت میں تو سارا نظام کائنات ہی درہم برہم ہو جاتا کیونکہ جب لوگوں پر کوئی مصیبت ہی نہ آتی' کسی کو کوئی تکلیف ہی نہ

ہوتی 'نہ بھوک کی' نہ پیاس کی' تو اس کے تدارک کے لئے ذرائع اور وسائل بھی تلاش نہ کئے جاتے' بھوک پیاس کے تدارک کے لئے نہ کھیتی باڑی ہوتی نہ مزدوری نہ کوئی اور کام کاج' کوئی کسی پر ظلم نہ کرتا' کوئی کسی کا حق نہ مارتا کیونکہ اللہ تعالیٰ انہیں ایسا کرنے سے روک دیتا۔ نتیجہ یہ کہ نہ عدالتوں کی ضرورت پیش آتی' نہ قانون کی تدوین ہوتی نہ انصاف کے ضابطے تحریر کئے جاتے' نہ قانون کی کتابیں چھپتیں' نہ لا کالج قائم ہوتے' نہ پولیس کی ضرورت ہوتی نہ جیلوں کی' نہ فوج کی ضرورت ہوتی نہ اسلحہ کی' کیوں کہ برائی کا وجود ہی نہ ہوتا' سرکشی' نافرمانی' ہوسِ اقتدار کے تصور سے کوئی واقف ہی نہ ہوتا' پھر نہ دوزخ کی ضرورت ہوتی نہ جنت کا وجود ہوتا کیوں کہ دوزخ تو سرکشوں' نافرمانوں اور گناہگاروں کو سزا دینے کے لئے ضروری ہے اسی طرح جنت ان لوگوں کے لئے ہوتی ہے جو نیک اعمال سرانجام دینے کی وجہ سے انعامات کے مستحق ہوتے ہیں۔ جب ناپسندیدہ اور برے جذبات پر قابو پا کر کوئی نیکی کا سزاوار ہی نہیں ہوگا تو کیسی جنت اور کس کے لئے؟ آپ نے دیکھا کہ اللہ تعالیٰ کے اس نظام پر بے بنیاد اعتراضات کرنے کا کیا نتیجہ نکلا؟ دنیا علم' عمل' افکار' جذبات' ترقی' تمدن' غرض ہر چیز سے محروم ہو گئی پس ثابت ہو گیا کہ یہی نظام درست' معقول اور عین مطابق انصاف ہے جو اللہ تعالیٰ نے قائم فرمایا ہے اس کے علاوہ ہر نظام ناقص اور ناقابل عمل ہے۔

خلاصۂ گفتگو یہ کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو بے مقصد پیدا نہیں کیا۔ اسے دنیا میں اپنا نائب اور خلیفہ بنایا' اس کائنات کو نکھارنے اور سنوارنے کی ذمہ داری اس کے سپرد کی اس لئے غیر معمولی صلاحیتیں دے کر اسے دنیا میں بھیجا۔ اسے بہت سے اختیارات دیئے کے ساتھ ساتھ اس پر بہت سی پابندیاں بھی عائد کر دیں تاکہ وہ ان اختیارات کا غلط اور ناجائز استعمال نہ کرے۔ اسے بتا دیا کہ اگر اس نے اپنی حدود سے تجاوز کیا تو خداوند تعالیٰ کی طرف سے اس کی گرفت کی جائے گی' یہ گرفت مختلف طریقوں سے ہوگی' زلزلوں سے' سیلابوں سے اور بیماریوں وغیرہ سے تاکہ غلط رو انسان اپنی غلط روی سے باز آ جائیں اور دوسروں کو بھی عبرت حاصل ہو۔ یہ کوئی قابل اعتراض یا انوکھی بات نہیں۔ والدین اپنے نافرمان بچے کو سزا

دیتے ہیں' استاد اپنے شریر شاگرد کو سزا دیتا ہے' عدالتیں مجرموں کو سزا دیتی ہیں تاکہ معاشرہ بے راہ روی کی نذر نہ ہو جائے۔ پس اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے بندوں پر سزائیں نافذ کرنے میں یہی حکمت ہے۔ رہ گیا یہ سوال کہ بعض دفعہ بظاہر بے گناہ لوگ بھی گرفت میں کیوں آ جاتے ہیں؟ سو معلوم ہونا چاہئے کہ یہ گرفت خداوند تعالیٰ کی طرف سے نہیں ہوتی نہ بطور سزا ہوتی ہے بلکہ قانونِ قدرت کے تحت ہوتی ہے جس سے کافر اور مومن' گناہگار اور بے گناہ کوئی مستثنیٰ نہیں' جس طرح بیمار کافر بھی ہوتے ہیں اور مومن بھی' مصیبت گناہگاروں پر بھی آتی ہے اور بے گناہوں پر بھی' موت خطا کاروں پر بھی وارد ہوتی ہے اور خطاؤں سے محفوظ لوگوں پر بھی' اسی کا نام قانونِ قدرت ہے۔

منکرین خدا کا سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ خدا اور مذہب کا تصور سائنس کی ضد ہے چونکہ یہ ایک مستقل موضوع ہے اس لئے ہم اس اعتراض پر انشاء اللہ ایک الگ باب میں تفصیل سے اظہار خیال کریں گے۔

⌘⌘⌘

خدا کی ہستی کے عقلی دلائل

خدا عقلی دلائل کا محتاج نہیں

خداوند تعالیٰ کی ہستی اس سے بالاتر ہے کہ ہم اپنی عقل کے ذریعے اس کا احاطہ کریں نہ وہ اس امر کی محتاج ہے کہ ہم اسے عقل کی کسوٹی پر پرکھ کر دیکھیں کہ وہ ہے بھی یا نہیں؟ ہم اسے اپنی عقل کے محدود دائرے میں لانے کی کوشش کریں یا نہ کریں وہ تو ہمیشہ سے موجود ہے اور ہمیشہ موجود رہے گا لیکن چونکہ یہ مادی ترقی کا دور ہے' عقلیت اس دور میں ہر دعوے کا پیمانہ ہے اس لئے صرف ایسے لوگوں کے اعتراضات کا جواب دینے کے لئے جو خدا کے وجود کو عقلاً تسلیم نہیں کرتے ضروری ہے کہ ہستی باری تعالیٰ کے وجود پر عقلی دلائل پیش کئے جائیں تاکہ منکرینِ خدا یہ نہ کہہ سکیں کہ خدا کا تصور اتنا کمزور ہے کہ اگر اسے عقل کی کسوٹی پر پرکھا جائے تو اس کے تاروپود بکھر جاتے ہیں لیکن یہاں ایک بصیرت افروز نکتہ ضرور پیشِ نظر رکھنا چاہئے جو ایک جلیل القدر عارف باللہ نے بڑے خوبصورت انداز سے پیش کیا ہے کہ عقل دلائل کے ذریعے اتنا تو ثابت کر سکتی ہے کہ اس کائنات کا ایک خالق ہونا چاہئے لیکن وہ یہ ثابت نہیں کر سکتی کہ واقعی وہ ہے بھی اور یہ کہ اس کی کیا صفات ہیں۔ ''ہے'' اور ''ہونا چاہیے'' میں بڑا فرق ہے۔ ''ہونا چاہیے'' ایک احتمال اور امکان کی طرف اشارہ کرتا ہے اور ''ہے'' یقین کا مقام ہے۔ (۱) یقین کا یہ مقام کہ خدا ہے صرف عقل سے نہیں بلکہ اس روشنی سے ملتا ہے جو انبیائے کرام نے ہمیں عطا کی اور جس کی کرنیں قرآن حکیم سے پھوٹتی ہیں۔

گویا عقل ہماری اس حد تک رہنمائی کرتی ہے کہ اس کائنات کا ایک خالق ہونا چاہئے لیکن وہ خالق کس شان اور مرتبے کا ہے اس نے اس کائنات کو کس غرض سے پیدا کیا؟ اس کائنات میں پائی جانے والی اشیاء خصوصاً بنی نوع انسان سے اس کا تعلق کس نوعیت کا ہے؟ وہ کب تک رہے گا؟ کیا اس کائنات کے ساتھ نعوذ باللہ وہ بھی ختم ہو جائے گا۔ کیا وہ ایسی اور دنیائیں بھی پیدا کر سکتا ہے؟ کیا اس نے اس دنیا کی زندگی کے بعد انسان کے لئے کوئی اور زندگی بھی رکھی ہے؟ اگر رکھی ہے تو وہاں اس سے کیا معاملہ کیا جائے گا؟ اس نے اس کائنات کو جس مّادے سے پیدا کیا' آیا وہ اس کا بھی خالق ہے؟ یا مّادہ اسی کی طرح قدیم ہے؟ یہ اور اس قسم کے سیکڑوں سوالات ایسے ہیں جن کا عقل صحیح جواب نہیں دے سکتی۔ ان سوالات کا جواب معلوم کرنے کے لئے ہمیں روحانی روشنی کی ضرورت ہے جو اللہ کے مقدس بندوں اور اس کی مقدس کتاب (قرآن حکیم) ہی سے مل سکتی ہے۔

جن لوگوں نے ان سوالات کا جواب صرف عقل سے دینا چاہا وہ صحیح نتیجے تک نہ پہنچ سکے اور گمراہ ہو گئے۔ مثال کے طور پر خدا اور مّادے پر بحث کرتے ہوئے یونان کے بعض فلاسفروں مثلاً انکس مندر (Anaximander) اور ہر قلیطس (Heraclitus) اور ہندوستان کے آریہ سماجی مفکر پنڈت دیانند سرسوتی نے یہ نظریہ پیش کیا کہ مّادہ خدا کی طرح قدیم ہے اسے خدا نے پیدا نہیں کیا خدا کا کام صرف اتنا ہے کہ اس نے اس مّادے کو ترکیب دے کر اس سے یہ کائنات اور اس میں پائی جانے والی موجودات تخلیق کر دیں۔ گویا خدا مادے کا خالق نہیں ہے اس کی حیثیت صرف ایک ایسے معمار کی ہے جس کے سامنے سامانِ تعمیرات موجود ہے وہ اسے استعمال کر کے عمارت تعمیر کر دیتا ہے۔

ظاہر ہے کہ اس نظریئے کے پیچھے خدائی روشنی نہیں ہے اور یہ مجرد عقل کا فیصلہ ہے اسی لئے نہایت کمزور اور مضحکہ خیز ہے۔ اگر اس دعوے کو تسلیم کر لیا جائے تو خدا کو کارِ خدائی سے ہی رخصت مل جاتی ہے اور مادے پر اس کی کوئی برتری ثابت نہیں ہوتی کیونکہ جب مّادہ بھی خدا کی طرح قدیم ہے تو خدا کو اس پر کیا فضیلت حاصل ہوئی؟ پھر تو دونوں ہم عمر ٹھہرے' دونوں ہمیشہ سے ہیں' چونکہ خدا مادے کا خالق نہیں اس لئے لازم آئے گا کہ وہ اس

کے خواص سے بھی حقیقی طور پر واقف نہیں۔اس طرح اس کا علم بھی ناقص ٹھہرے گا۔ مادے کو قدیم مان لینے سے یہ بھی لازم آئے گا کہ خدا مادے کا محتاج ہے کیونکہ اگر مادہ موجود نہ ہوتا تو خدا یہ کارخانۂ عالم پیدا نہیں کرسکتا تھا۔اس صورت میں اس کی خدائی کا بھی ظہور نہ ہوتا اور نعوذ باللہ وہ بے بس ہو کر رہ جاتا۔

خدا کو مادے کا خالق تسلیم نہ کرنے کی صورت میں ایک بڑی خرابی اور پیدا ہوگی اور وہ یہ کہ خدا کو موجودات سے اپنی اطاعت کرانے کا کوئی حق حاصل نہ ہو سکے گا کیونکہ جب یہ مادہ جس سے اس نے اس کائنات کو پیدا کیا اس کا تخلیق کردہ نہیں بلکہ (نعوذ باللہ) اس نے اس پر بزور قبضہ کر لیا تو اسے کیا حق حاصل ہے کہ اس مادے سے پیدا شدہ اشیا سے اپنے احکام کی تعمیل کرائے کیونکہ اصلاً یہ نہ اس کی ملکیت ہیں اور نہ بنیادی طور پر وہ ان کا خالق ہے۔

یہ نتیجہ ہے صرف عقل کے ذریعے خدا کو تلاش کرنے کا لیکن جب ہم مذہب کی طرف رجوع کرتے ہیں، انبیائے کرام کے ارشادات کو اپنا رہنما بناتے ہیں اور قرآن حکیم سے روشنی حاصل کرتے ہیں تو ہمیں اس بے بنیاد نظریئے بلکہ مفروضے میں قطعاً معقولیت نظر نہیں آتی اور خدا اپنی لامحدود طاقتوں کے ساتھ جلوہ گر ہوتا ہے جن کی رو سے وہ اس کائنات کا مکمل طور پر خالق ہے وہ مادے کا بھی خالق ہے، جب چاہے اس کائنات اور مادے کو فنا کرسکتا ہے اور نیا مادہ پیدا کر کے اس سے ہزاروں کائناتیں تخلیق کرسکتا ہے۔ پس صرف عقل سے ہم خدا کی حقیقی صفات اور اس کا عرفان حاصل کرنے میں ہرگز کامیاب نہیں ہو سکتے اس کے لئے مذہب اور قرآن کی روشنی کی ضرورت ہے۔ مجرد عقل صرف خدا کے وجود کے امکان تک ہماری رہنمائی کرسکتی ہے۔

اس ضروری تمہید اور بنیادی نکتے کے بعد اب ہم اصل موضوع کی طرف آتے ہیں یعنی ''خدا کی ہستی کے عقلی دلائل''۔ یہ عقلی دلائل پیش کرتے ہوئے بھی ہم نے قرآن کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا اور ان دلائل کا اختتام ''انبیاء کی شہادت'' اور قرآن حکیم کے ارشادات پر کیا ہے۔

خدا اپنی صفات سے پہچانا جاتا ہے

''اگر کوئی شخص اپنے ذہن میں دس اشرفیوں کا تصور کر لے تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ یہ دسوں اشرفیاں اس کی مٹھی میں آ جائیں گی'' —— یہ مقولہ گیارہویں صدی عیسوی کے ایک مغربی مفکر گونیلو (Guanilo) کا ہے جسے خدا تعالیٰ کے منکرین کا امام اور سرخیل قرار دیا جاتا ہے۔ خدا تعالیٰ کے اس منکر نے اس تمثیل سے یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ جس طرح دس اشرفیوں کو تصور میں لا کر تصور کرنیوالا خالی ہاتھ ہی رہتا ہے اسی طرح خدا کے وجود کا عقیدہ رکھنے والے محض خام خیالی اور تصوراتی دنیا میں کھوئے رہتے ہیں۔ وہ یہ تاثر دینا چاہتا ہے کہ خدا ایک تصوراتی شے ہے جس کا خارج میں کہیں وجود نہیں اور وہ ہمیں کہیں نظر نہیں آتا۔ مفکر گونیلو کی طرح بعض دوسرے منکرینِ خدا بھی کہتے ہیں کہ خدا پرستوں کا خدا حواسِ خمسہ میں سے کسی حس کے ذریعے محسوس نہیں ہوتا یعنی آنکھ، ناک، کان، ہاتھ اور ذائقہ ان میں سے احساس کا کوئی ذریعہ خدا کے وجود کی شہادت نہیں دیتا پس ثابت ہوا کہ اس کا وجود سراسر واہمہ ہے۔

خداوند تعالیٰ کے وجود کے منکرین نے اپنے دعوے کے ثبوت میں اب تک جتنے دلائل پیش کئے ہیں ان میں یہ دلیل سب سے کمزور اور حد درجہ مضحکہ خیز ہے کیونکہ اگر ہر چیز کا وجود ثابت کرنے کے لئے اس کا نظر آنا ہی ضروری قرار دیا جائے تو پھر بے شمار چیزوں کے وجود کا انکار کرنا پڑے گا اور اس کائنات کا سارا نظام ہی فرضی قرار پائے گا۔ مثال کے طور پر ہمیں عقل نظر نہیں آتی، غصہ نظر نہیں آتا، خوشی نظر نہیں آتی اور سب سے بڑھ کر جان نظر نہیں آتی، وہ جان جس کی بدولت نہ صرف انسان اور حیوان حرکت و عمل میں مصروف ہیں بلکہ اس کائنات کی رونق اور رنگا رنگی اپنے شباب پر ہے۔ کیا کوئی معمولی عقل و فہم کا شخص بھی عقل، غصہ، خوشی اور جان کے وجود کا انکار کر سکتا ہے؟ کیونکہ ان میں سے کوئی ایک چیز بھی نظر نہیں آتی مگر اس کے باوجود کہ یہ چیزیں ہمارے عینی مشاہدے میں نہیں آتیں خداوند تعالیٰ کے منکرین ان سب چیزوں کے وجود کا اقرار کرتے ہیں پس تسلیم کرنا پڑے گا کہ کسی شے کے وجود کے ثبوت کے لئے اس کا نظر آنا ضروری نہیں بلکہ بعض علامات سے ہم اس چیز کے

وجود پر یقین کر لیتے ہیں۔ مثال کے طور پر جب ہمیں دور کسی جگہ سے صرف دھواں اٹھتا نظر آتا ہے تو ہم یقین کر لیتے ہیں کہ یہاں آگ جل رہی ہے حالانکہ ہمیں آگ یا اس کے شعلے نظر نہیں آتے۔ ایک شخص کے چہرے پر مسرت کی لہریں اور ہونٹوں پر تبسم دیکھ کر ہم یقین کر لیتے ہیں کہ اس شخص پر خوشی کی کیفیت طاری ہے حالانکہ ہمیں خوشی نظر نہیں آتی۔ جب ہم کسی شخص کی پیشانی پر بل، آنکھیں سرخ اور اس کی زبان سے سخت و درشت کلمات ادا ہوتے دیکھتے ہیں تو یقین کر لیتے ہیں کہ یہ شخص غصے کی حالت میں ہے حالانکہ ہمیں غصہ نظر نہیں آتا۔ کسی شخص سے معقول بات یا دانشمندانہ مقولہ سن کر ہم یقین کر لیتے ہیں کہ یہ شخص بڑا صاحب عقل ہے حالانکہ ہمیں عقل نظر نہیں آتی۔ اس سے ثابت ہوا کہ دنیا میں بہت سی اشیاء ایسی ہیں جن کے وجود کے ثبوت کے لئے ان کا نظر آنا ضروری نہیں بلکہ ناممکن بھی ہے مگر اس کے باوجود ہم صرف اس لئے ان کا وجود تسلیم کرتے ہیں کہ بعض علامات ان کے وجود کا پتا دیتی ہیں۔ یہی وہ مستحکم دلیل ہے جو اللہ تعالیٰ کے وجود کو روزِ روشن کی طرح ثابت کرتی ہے اور عقل انسانی کو یہ سوچنے پر مائل ہونا پڑتا ہے کہ سورج میں روشنی، آگ میں حرارت، پانی میں زندگی بخشنے کی طاقت اور ادویہ میں شفا کی تاثیر کیسے پیدا ہو گئی؟ عقل سلیم اس کا یہی جواب دیتی ہے کہ ایک ایسی صاحب حکمت ہستی موجود ہے جس نے اس کائنات کے مختلف اجزا تخلیق کئے اور پھر ان میں ایسے خواص رکھے کہ وہ باہم ترکیب پا کر ایک نئی صورت اختیار کر لیتے ہیں اور یہ نئی صورت اس زمین پر زندگی کے ظہور اور اس کے نشوونما کا باعث بنتی ہے۔ گایوں، بکریوں، بھینسوں اور اونٹنیوں کا خشک دانہ یا چارا کھانا اور اس سے ان کے جسم میں دودھ پیدا ہونا، شہد کی مکھیوں کا پھولوں پر بیٹھ کر رس چوسنا اور پھر اس سے شہد بنا کر اپنے چھتے میں ذخیرہ کرنا، سورج کی گرمی سے پانی کے بخارات کا اٹھنا اور ان بخارات کا ہواؤں کے دوش پر بادلوں کی صورت میں زمین کے مختلف حصوں پر جا کر برسنا اور فصلوں کو سیراب کرنا، ایک ننھے سے بیج کا زمین میں جا کر پھوٹنا اور پھر اس کا تناور درخت بن جانا، ہمارے معدے میں غذا کا جانا اور پھر ہضم ہو کر مختلف صورتیں اختیار کرتے ہوئے خون میں تبدیل ہو جانا اور خون کا دل کی طرف منتقل ہو جانا اور دل کا خون کو سارے جسم میں پہنچانا،

آنکھ کے مختلف پردے، ان کی بناوٹ اور ان سے اشیاء کو دیکھنے کی حیرت انگیز طاقت ـــــ آخر یہ سب کچھ کیسے عمل میں آتا ہے۔ کائنات کی مختلف اشیاء کا وجود، ان کی مختلف تاثیریں اور انسانوں اور حیوانوں کے جسم کے باریک در باریک اور پیچیدہ نظام ثابت کرتے ہیں کہ کوئی ہستی ہے، جس نے یہ کائنات تخلیق کی اور اس کی مختلف اشیاء میں مختلف خاصیتیں پیدا کیں ورنہ صرف بے جان مادہ جب تک اسے حرکت نہ دی جائے دوسرے الفاظ میں جب تک اس کا حرکت دینے والا موجود نہ ہو کبھی حرکت میں نہیں آ سکتا۔ پس اس کائنات کی اشیاء میں حرکت اور پھر اس کی حرکت و عمل میں ایک خاص ترکیب و توازن ہی ثابت کرتا ہے کہ اس کائنات کا ایک خالق ضرور ہے جو ہمیں نظر نہیں آتا مگر اپنی بے شمار علامات سے خود اپنے وجود کا ثبوت دیتا ہے۔ یہی وہ عارفانہ حقیقت ہے جو ہماری زبان کے عظیم مفکر اور فلسفی شاعر غالبؔ کے دل پر القا ہوئی۔ غالبؔ کی طرح صحیح خطوط پر سوچنے والا ہر صاحبِ عقل جب موجوداتِ عالم پر نظر ڈالتا ہے تو اس کے ذہن میں یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ یہ صبح کا سہانا منظر، یہ روح کو بالیدگی عطا کرنے والی بادِ صبا، قلب و نظر کو تازگی اور فرحت بخشنے والے یہ گل و لالہ، وادیوں اور کوہساروں پر برسنے والا یہ ابر بہار، دلوں میں گھر کر جانے والے یہ حسین چہرے، خوبصورت جسموں کا یہ پرکشش تناسب اعضاء ـــــ آخر یہ سب کیا ہے؟ کیوں ہے؟ کیسے ہے؟ انہیں کس نے پیدا کیا ہے؟ غور و فکر کرنے کے بعد آخر کار اس کا ذہن اسے ایک ہی جواب دیتا ہے کہ ان تمام موجودات اور حسن و رعنائی کا ایک خالق ضرور ہے۔ مرزا غالبؔ نے انسانی ذہن کی اسی تلاش و جستجو، غور و فکر اور اندرونی آواز کا اپنے ان حکیمانہ اشعار میں اظہارِ خیال کیا ہے:

یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں — غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے
شکنِ زلف عنبریں کیوں ہے — نگہہِ چشم سرمہ سا کیا ہے
سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں — ابر کیا چیز ہے؟ ہوا کیا ہے
جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے (۲)

جن مّادہ پرست مفکرین نے اس بنا پر خدا کا انکار کر دیا کہ وہ نظر نہیں آتا دراصل ان سے ایک بنیادی غلطی سرزد ہوگئی اور وہ یہ کہ انہوں نے خدا کو بھی مادی شکل میں دیکھنا چاہا۔ وہ اس حقیقت کو نہ سمجھ سکے کہ خدا تعالیٰ مادی شے نہیں کہ اس کا وجود انہیں ظاہری آنکھوں سے نظر آتا یا قوتِ لامسہ سے وہ اسے محسوس کرتے۔ خدا تو جسمانی قید سے آزاد اور پاک ومنزہ وجود ہے۔ اس کا کوئی جسم نہیں وہ ایک غیر مرئی اور غیر مادی ہستی ہے اور مادی شے ایک غیر مادی شے کو کیسے دیکھ سکتی ہے؟ اس لئے عقلاً بھی ان کا یہ استدلال نہایت کمزور ہے۔ خدا کے ان مّادہ پرست منکرین نے اس پہلو پر بھی غور نہ کیا کہ اگر خدا تعالیٰ انسانی شکل یا کسی اور صورت میں نظر آتا تو اس سے لازم آتا کہ وہ مادی شے ہے اور مادے کے لئے فنا لازم ہے۔ مادی اشیاء میں تغیر ہوتا رہتا ہے، وہ ایک دوسرے کی محتاج ہوتی ہیں اور ایک کے بغیر دوسری کا وجود قائم نہیں رہ سکتا، پس اگر خدا بھی مادی صورت میں ظاہر ہوتا اور اس کی تخلیق مادے سے ہوتی تو اس میں بھی تغیر وتبدل ہوتا، وہ بھی زوال پذیر ہوتا، وہ بھی اپنی بقا کے لئے دوسرے مادی اجزا کا محتاج ہوتا اور مادی ہونے کی وجہ سے ایک دن وہ بھی فنا ہو جاتا اور خدا کا فنا ہو جانا اس لحاظ سے خلافِ عقل ہے کہ جب اس کائنات کا خالق اور منتظم ہی فنا ہو جائے تو یہ کائنات اور اس کا نظام کیسے قائم رہ سکتا ہے اور آخری بات یہ کہ اگر خدا کا وجود بھی مادی ہوتا اور وہ بھی نظر آتا تو جسمانی لحاظ سے خالق اور مخلوق میں کوئی فرق باقی نہ رہتا کیونکہ خدا کا بھی جسم ہوتا اور کائنات کی دوسری اشیا کا بھی؟ اس صورت میں خدا تعالیٰ کی صفت یکتائی برقرار نہ رہتی گویا اسے دوسرے موجودات پر جسمانی لحاظ سے کوئی برتری حاصل نہ رہتی۔

جن لوگوں کو عقل وفکر کے ساتھ ساتھ روحانی بصیرت بھی عطا ہوئی ہے وہ اس لطیف نکتے سے ضرور لطف اندوز ہوں گے کہ اگر خدا تعالیٰ کا جسمانی وجود ہوتا اور وہ ہمیں نظر آتا تو اس کی ہستی کو تسلیم کر لینا عقل وفہم اور بصیرت کا کوئی کمال نہ ہوتا۔ اگر ایک شخص عین دوپہر کے وقت آفتاب کو ضوفشاں دیکھ کر اس کے وجود کا اقرار کرے تو ایسے شخص کو نہ ذہین وفریس اور صاحبِ بصیرت لوگوں میں شمار کیا جائے گا اور نہ سورج کے وجود کا اقرار

کرنے والا کسی جزا یا انعام کا مستحق قرار پائے گا۔ کمالِ ایمان تو یہ ہے کہ ایک ہستی ظاہری آنکھوں سے نظر نہیں آتی مگر اس کے وجود کی بے شمار علامتیں اور نشانیاں موجود ہیں، اس کی لامحدود قدرتیں قدم قدم پر اس کے موجود ہونے کا پتا دیتی ہیں ان علامتوں اور قدرتوں کو دیکھ کر اس کی ہستی پر ایمان لانے والا ہی حقیقی معنی میں صاحب بصیرت اور دانشور کہلانے کا مستحق ہو سکتا ہے۔

نظم کائنات اور خدا کا وجود

مغرب کا ایک مفکر (۳) کہتا ہے کہ آپ گتے کے دس ٹکڑے لے لیں مگر ان میں سے ہر ٹکڑا لمبائی، چوڑائی اور موٹائی کے اعتبار سے یکساں ہو اور ان ٹکڑوں میں بال برابر بھی فرق نہ ہو۔ ان میں سے ہر ٹکڑے پر ترتیب وار ایک سے لے کر دس تک ایک ایک ہندسہ درج کر دیجئے۔ یعنی پہلے ٹکڑے پر ایک کا ہندسہ، دوسرے پر دو کا ہندسہ تیسرے پر تین کا ہندسہ، چوتھے پر چار کا اسی طرح دسویں ٹکڑے پر دس کا ہندسہ۔ پھر ان دسوں ٹکڑوں کو باہم خلط ملط کر کے اپنے کوٹ یا پتلون کی جیب میں ڈال لیجئے۔ اب آپ ان ٹکڑوں کو دیکھے بغیر اس ترتیب سے جیب میں سے نکالئے کہ پہلے نمبر ا کا ٹکڑا نکلے پھر ۲ نمبر کا پھر ۳ نمبر کا پھر ۴ کا۔ اسی طرح ترتیب وار دسوں ٹکڑے نکلتے چلے آئیں۔ اگر آپ کو عمر نوحؑ مل جائے اور آپ یہ ساری عمر اسی کوشش میں صرف کر دیں پھر بھی آپ یہ ٹکڑے اس ترتیب سے نہیں نکال سکیں گے۔ کبھی ۶ نمبر کا ٹکڑا نکل آئے گا، کبھی ۳ نمبر کا، کبھی ۹ نمبر کا، کبھی ۵ نمبر کا مگر جب آپ اپنی جیب کو کشادہ کر کے اپنا ہاتھ اور آنکھ دونوں استعمال کریں گے تو بڑی آسانی سے دسوں ٹکڑے ترتیب وار نکال کر میز پر رکھ دیں گے۔ اس سے ثابت ہوا کہ جب تک ایک دیکھنے والی آنکھ، ایک حرکت کرنے والا ہاتھ اور ایک سوچنے والا دماغ موجود نہ ہو اس وقت تک گتے کے دس ٹکڑوں میں ترتیب قائم نہیں ہو سکتی۔ غور کرنے کا مقام ہے کہ پھر اتنی بڑی کائنات میں یہ نظم و ترتیب کس طرح قائم رہ سکتی ہے جب تک ایک ترتیب کنندہ اور منتظم موجود نہ ہو۔ اس سے ثابت ہوا کہ اس کائنات کا ایک منتظم اور نگراں موجود ہے جو اس نظام

کو چلا رہا ہے اور جو اس کی نظم و ترتیب میں فرق نہیں آنے دیتا۔

کئی صدیاں گزریں کہ ایک بہت بڑا منکرِ خدا بغداد آیا اور اس نے اعلان کیا کہ یہ شہر اسلامی علوم و فنون کا گہوارہ ہے' یہاں بڑے بڑے علماء و فضلا موجود ہیں' میں انہیں چیلنج کرتا ہوں کہ وہ میرے مقابلے پر آئیں اور خدا کا وجود ثابت کریں۔ اُس دور کے ایک جید عالم اور مفکر نے منکرِ خدا کا چیلنج قبول کرلیا' مناظرے کے لئے جگہ' وقت اور تاریخ کا تعین ہو گیا۔ جب مناظرے کا دن آیا تو لوگ جوق در جوق میدان مناظرہ میں جمع ہونے لگے یہاں تک کہ وقت مقررہ آ گیا مگر مسلمان عالم مناظرے کی جگہ نہ پہنچا۔ منکرِ خدا خوش تھا اور مجمع پر طنزیہ نظریں ڈال رہا تھا' ادھر مسلمان تھے کہ شرم سے پانی پانی ہوئے جا رہے تھے کہ اتنی دیر میں ایک جانب سے نعرہ ہائے تحسین بلند ہونے لگے۔ لوگوں کی جان میں جان آئی' مسلمان مفکر مقابلے کے لئے پہنچ چکا تھا۔ مناظرہ شروع ہونے سے قبل مسلمان عالم نے تاخیر سے آنے کی معذرت کی اور منکرِ خدا سے کہا کہ دراصل مجھے اپنے گھر سے یہاں تک آنے کے لئے دریا عبور کرنا پڑتا ہے۔ آج جب میں دریا کے کنارے پہنچا تو کوئی کشتی موجود نہ تھی۔ میں کشتی کے انتظار میں کھڑا تھا کہ اچانک ایک بہت بڑا درخت خود بخود جڑ سے اکھڑ کر دریا کے کنارے آ گرا۔ پھر اس درخت کا تنا خود بخود جڑ سے الگ ہو گیا جیسے کسی نے آرے سے اسے باقی درخت سے کاٹ دیا ہو' پھر اس تنے کے ٹکڑے خود بخود ایک دوسرے سے الگ ہونے لگے' ان ٹکڑوں میں سے تختے چر چر کر آپ سے آپ گرنے لگے۔ پھر یہ تختے خود بخود ایک دوسرے کے قریب ہوتے گئے اور آپس میں پیوست ہو گئے۔ اس طرح خود بخود کشتی تیار ہو گئی۔ پھر اس کشتی نے دریا کی طرف حرکت کی اور آہستہ سے پانی میں اتر گئی یہ دیکھ کر میں جلدی سے اس میں سوار ہوا اور یہاں پہنچ گیا۔

مسلمان عالم کا یہ بیان سن کر منکرِ خدا چیخ پڑا اور اس نے مجمع کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ تم لوگ ایسے کاذب شخص کو میرے مقابلے پر لائے ہو جو تاخیر سے آنے کی شرمندگی سے بچنے کے لئے ایک جھوٹی داستان گھڑ لایا ہے۔ مسلمان عالم نے اس سے پوچھا کہ اے بھائی! اس میں کون سی بات ناقابل یقین ہے؟ منکرِ خدا نے جواب دیا کہ کبھی

ایسا ہوا ہے کہ درخت کا تنا کسی کے کاٹے بغیر خود بخود درخت سے کٹ کر الگ ہو جائے اور کسی چیرنے والے کے بغیر درخت کے تنے سے تختے خود بخود چرنے لگیں اور پھر یہ تختے کسی کشتی ساز کے بغیر خود بخود آپس میں جڑ جائیں اور کسی بنانے والے کے بغیر کشتی بن جائے۔ پھر کسی حرکت دینے والے کے بغیر وہ خود بخود حرکت میں آ کر دریا میں اتر جائے؟

منکرِ خدا کا یہ اعتراض سن کر مسلمان عالم نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ "اے عقل مند! تیرے نزدیک ایک درخت کے تنے کا کسی بڑھئی (ترکھان) کے بغیر درخت سے الگ ہونا ناممکن ہے اور اس تنے سے تختوں کا اس وقت تک چرنا بھی ناممکن ہے جب تک کوئی کاریگر موجود نہ ہو۔ تیرے خیال میں تختے بھی آپس میں اس وقت تک نہیں جڑ سکتے جب تک کشتی ساز انہیں نہ جوڑے اور نہ کشتی اس وقت تک پانی میں اُتر سکتی ہے جب تک اسے حرکت دینے والا موجود نہ ہو۔ تیری عقل پر تعجب ہے کہ ایک چھوٹی سے کشتی کو تو عالم وجود میں لانے کے لئے تو کشتی ساز کے وجود کو لازمی قرار دیتا ہے مگر اتنی بڑی کائنات کے بارے میں یہ دعویٰ کرتا ہے کہ یہ خود بخود عالم وجود میں آ گئی۔ دلیل اتنی وزنی اور ناقابل شکست تھی کہ منکرِ خدا ہستی باری تعالیٰ پر ایمان لے آیا۔ ☆

ہمیں اس سے بحث نہیں کہ اس واقعے کی تاریخی حیثیت کیا ہے لیکن اس میں جو حقائق بیان کئے گئے ہیں وہ منکرینِ خدا کو دعوتِ فکر دیتے ہیں کہ جب ایک کشتی یا لکڑی کی ایک میز اور کرسی اس وقت تک عالم وجود میں نہیں آ سکتی جب تک کہ ایک کاریگر موجود نہ ہو تو یہ زمین و آسمان، یہ سورج، چاند، یہ ستارے اور سیارے، یہ دریا اور پہاڑ، یہ نباتات و حیوانات اور یہ اشرف المخلوقات انسان خود بخود کیسے پیدا ہو گئے؟ تسلیم کرنا پڑے گا کہ ان کا بھی ایک خالق ہے جس نے انہیں نہایت احسن طریقے سے تخلیق کیا کیونکہ ہمارا مشاہدہ اور عقل دونوں شہادت دیتے ہیں کہ کوئی چیز اس وقت تک عالم وجود میں نہیں آ سکتی جب تک اس کا تخلیق کرنے والا موجود نہ ہو۔

☆ یہ واقعہ حضرت امام اعظمؒ سے منسوب کیا جاتا ہے۔ (مولف)

اس مرحلے پر منکرینِ خدا سب سے بڑا اعتراض یہ کرتے ہیں کہ اگر کوئی چیز اس وقت تک عالم وجود میں نہیں آ سکتی جب تک اس کا بنانے والا موجود نہ ہو تو خدا کا بھی ایک خالق ماننا پڑے گا آخر اسے بھی کسی نے بنایا ہوگا۔ یہ منکرینِ خدا کا آخری حملہ ہے۔ بظاہر یہ بڑا وزنی اعتراض ہے مگر درحقیقت اس میں ذرہ برابر وزن نہیں۔ پہلی بات تو یہ کہ خالق اور مخلوق، ایجاد اور موجود کا یہ سلسلہ آخر کہیں تو ختم ہونا چاہئے کیونکہ ہم اپنی مادی دنیا میں بھی دیکھتے ہیں کہ ہر چیز کا ایک آغاز ہوتا ہے اور پھر اس کا انجام۔ دریا اپنے منبع سے نکلتا ہے یہ اس کا آغاز ہے پھر کسی دوسرے دریا میں مل کر سمندر میں گر جاتا ہے یہ اس کا اختتام ہے۔ اسی طرح سمندر کی بھی ایک حد ہے جہاں جا کر یہ ختم ہو جاتا ہے۔ انسان کی پیدائش کا بھی ایک آغاز ہوتا ہے اور پھر ایک انجام۔ اسی طرح اس کائنات کی تخلیق اور اس کے خلق کرنے کا سلسلہ بھی آخر کہیں جا کر تو ختم ہوگا۔ جہاں یہ سلسلہ ختم ہوگا وہ آخری ہستی اس سارے موجودات کی خالق قرار پائے گی۔

یونان کا مشہور مفکر ارسطو اللہ تعالیٰ کے وجود پر یہی دلیل دیتا ہے وہ کہتا ہے کہ ''خدا کی اصل اور حقیقت یہ ہے کہ وہ ہر چیز کی پہلی علت اور سبب ہے اور ہر متحرک و متغیر چیز کو سب سے پہلا حرکت دینے والا ہے۔ اس کائنات میں حرکت و عمل اور تغیرات کا جو سلسلہ جاری ہے اس کا تقاضا ہے کہ اس کا کوئی محرک یعنی حرکت دینے والا ہونا چاہئے، پھر اس محرک پر دوسرا محرک ہو اسی طرح محرکوں کا یہ سلسلہ نیچے سے اوپر کی طرف چلنا چاہئے۔ آخر میں جا کر اسے ایک محرک پر ختم ہو جانا چاہئے۔ یہ محرک آخری محرک ہے جس پر کوئی دوسرا محرک نہیں ہو سکتا۔ محرکین کے اس سلسلے کو کسی آخری محرک پر اس لئے ختم کرنا لازم ہے کہ عقلاً یہ ممکن نہیں کہ کوئی چیز کہیں جا کر ختم نہ ہو۔ یہ وجود جو اس کائنات کا آخری محرک ہے ہمیشہ سے ہے اور اس پر کبھی فنا نہیں آئے گی۔ یہ کامل و اکمل اور تمام نقائص سے منزہ ہے اور اپنی ذات کے لئے کسی دوسرے وجود کا محتاج نہیں''۔ ارسطو کی یہ دلیل اتنی وزنی اور مستحکم ہے کہ کوئی عقل مند اور منصف مزاج شخص اسے رد نہیں کر سکتا۔

یہاں ایک نکتہ اور قابلِ غور ہے۔ اگر تعصب سے بالاتر ہو کر اس پر غور کیا جائے تو

اس اعتراض کی کوئی حقیقت ہی باقی نہیں رہتی کہ اس کائنات کے خالق کا بھی ایک خالق ہونا چاہئے۔ وہ نکتہ یہ ہے کہ جب سے روئے زمین پر انبیا کے ظہور کا سلسلہ شروع ہوا اس وقت سے آج تک اللہ تعالیٰ اپنے نبیوں، رسولوں اور مصلحین کے ذریعے سے مسلسل اعلان کرتا چلا آ رہا ہے کہ میں (اللہ) اس کائنات اور اس کے تمام موجودات کا خالق ہوں مجھے کسی نے پیدا نہیں کیا میں نے سب کو پیدا کیا ہے۔ اگر خدا کا بھی کوئی خالق ہوتا تو وہ بھی میدان میں آتا اور اعلان کرتا کہ ـــــ نہیں، میں اس خدا کا خالق ہوں، میں نے ہی اسے بھی اور اس ساری کائنات کو تخلیق کیا ہے مگر اللہ تعالیٰ کے سوائے آج تک کسی نے اس قسم کا دعویٰ نہیں کیا۔ اس سے ثابت ہوا کہ خدا کا کوئی خالق نہیں ورنہ وہ بھی اپنی خالقیت کا ضرور اعلان کرتا اور یہ اعلان کرنے والا آج بھی موجود ہوتا۔

خدا کا وجود فطرتِ انسانی کا تقاضا ہے

جب ایک بچہ شکمِ مادر سے نکل کر زمین پر پہلی سانس لیتا ہے تو اسے فوری طور پر ایک سرپرست اور مربی کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ ضرورت آغوش مادر پوری کر دیتی ہے۔ بچہ اپنی ماں کی آغوش میں جا کر سکون حاصل کرتا اور پرورش پاتا ہے۔ اگر اس نوزائیدہ بچے کو ماں کی گود میسر نہ آئے اور نہ کوئی دوسرا شخص اس کی پرورش اور سرپرستی قبول کرے تو یہ نومولود بچہ چند گھنٹوں کے بعد ہی کسمپرسی کی حالت میں دم توڑ دے۔ جب یہ بچہ ذرا اور بڑا ہوتا ہے تو اس کا باپ، اس کی ماں اور استاد اس کی سرپرستی کرتے اور اسے کارزارِ حیات میں اس کی ذمہ داریاں ادا کرنے کے قابل بناتے ہیں۔ اگر اس بچے کو اس کے باپ یا اس کی ماں یا استاد کی سرپرستی حاصل نہ ہو تو وہ ہرگز عملی زندگی کی ذمہ داریاں ادا کرنے کے قابل نہیں ہو سکتا۔ ایک چھوٹے سے گھرانے کا انتظام چلانے کے لئے بھی ایک سربراہ کی ضرورت ہوتی ہے جو باپ، ماں، چچا یا دادا کی صورت میں اس کنبے کے افراد کی پرورش کرتا اور ان کی جملہ ضروریات کا کفیل ہوتا ہے۔ ایک ضلع کا انتظام کرنے کے لئے ڈپٹی کمشنر کی صوبہ کا انتظام کرنے کے لئے گورنر یا وزیر اعلیٰ کی اور ملک کا انتظام کرنے کے لئے بادشاہ

صدر یا وزیر اعظم کی ضرورت ہوتی ہے اگر ضلع، صوبہ یا ملک کا کوئی سربراہ نہ ہو تو اس ملک کا سارا نظام درہم برہم ہو جائے، ہر طرف طوائف الملوکی پھیل جائے، ملک کا امن و اماں، لوگوں کی جان و مال اور عزت و آبرو غرض ہر چیز غارت ہو جائے۔

اب ایک چشم دید منظر دیکھئے جو اس کتاب کے مولف کا ذاتی مشاہدہ ہے —— شہر کے ایک چوک میں ہنگامہ برپا تھا۔ کاریں، بسیں، ٹرک، ویگنیں، موٹر سائیکلیں اور رکشائیں ایک دوسرے پر چڑھے جا رہی تھیں۔ زخمیوں کو ہسپتال لے جانے والی ایمبولینس ہارن بجا بجا کر کانوں کے پردے پھاڑے ڈال رہی تھی۔ زخمیوں کے لواحقین پچھلی گاڑی کی چھت پر کھڑے چیخ رہے تھے، منتیں کر رہے تھے کہ انہیں راستہ دیدو ورنہ ان کے زخمی عزیز مر جائیں گے —— مگر کوئی کسی کی نہ سنتا تھا کیونکہ راستے بلاک ہو چکے تھے، کوئی گاڑی نہ آگے جا سکتی تھی نہ پیچھے ہٹ سکتی تھی —— آپ کو معلوم ہے کہ یہ قیامت کیوں برپا تھی ——؟ ٹریفک کنٹرول کرنے والا کانسٹیبل کسی ضرورت سے ڈیوٹی چھوڑ کر چلا گیا تھا —— سوچئے جب ٹریفک کو کنٹرول کرنے والے منتظم کے بغیر ٹریفک کا سارا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے! تو کیا اتنی بڑی کائنات کا نظام کسی کنٹرول کرنے والی ہستی کے بغیر —— کسی منتظم اعلیٰ کے بغیر چل سکتا ہے؟؟

فوج کسی ملک کا سب سے مضبوط اور طاقتور ادارہ ہوتا ہے جو ملک کی سرحدوں کی حفاظت کرتا اور دشمن کے ناپاک ارادوں کو خاک میں ملا دیتا ہے مگر ملک کا یہ سب سے طاقتور ادارہ بھی اسی وقت طاقتور ہوتا ہے جب وہ ایک نظام سے وابستہ ہو اور اسے ایک برتر شخصیت کی سرپرستی حاصل ہو جسے جنرل، سپہ سالار یا کمانڈر انچیف کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے ورنہ بے سردار فوج آدمیوں کی ایک بھیڑ سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتی جسے معمولی دشمن بھی فنا کر سکتا ہے۔ گویا انسان اپنی پیدائش سے لے کر ترقی اور تمدن کے اعلیٰ مدارج تک پہنچنے کے لئے ایک سرپرست، نگراں اور مربی کا محتاج ہے اور یہ ہم سب کا ایسا مشاہدہ ہے جس کا کوئی ذی ہوش اور صاحبِ عقل و فہم انکار نہیں کر سکتا۔ یہی وہ مشاہدہ ہے جو فطرتِ انسانی کو دعوتِ فکر دیتا ہے اور ہمیں سوچنا پڑتا ہے کہ جب ایک بچہ اپنی بقائے

حیات اور پرورش کے لئے ایک سرپرست کا محتاج ہے' جب ایک چھوٹے سے کنبے کا انتظام کسی سرپرست اور مربی کے بغیر قائم نہیں رہ سکتا' جب ایک کارخانہ کسی منتظم کے بغیر نہیں چل سکتا' جب ایک چھوٹے سے ضلع سے لے کر بڑے سے بڑے ملک کا انتظام کرنے کے لئے ایک سربراہ کی ضرورت ہوتی ہے تو ہمارے گردو پیش پھیلی ہوئی یہ وسیع وعریض کائنات ایک سرپرست اور منتظم اعلیٰ کے بغیر کیسے قائم رہ سکتی ہے اور اس کا نظم وضبط کیونکر برقرار رہ سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب انسان نے عقل وشعور کی منزل میں قدم رکھا' اس میں غور وفکر کرنے اور سوچنے کی صلاحیت پیدا ہوئی تو اس نے ایک برتر و اعلیٰ ہستی کی ضرورت محسوس کی۔ دوسرے الفاظ میں یہ انسانی فطرت کی پکار تھی' انسانی فطرت کا تقاضا تھا کہ اس کائنات کا ایک مربی اور سرپرست ہونا چاہئے۔ فطرت انسانی کے اسی تقاضے کو اللہ تعالیٰ قرآن حکیم میں ان الفاظ میں بیان فرماتا ہے کہ:

واذاخذ ربك من بنی ادم من ظهورهم ذريتهم واشهدهم علی انفسهم الست بربكم قالوبلی شهدنا ج (سورہ الاعراف آیت نمبر ۱۷۲)

''اور جب آپ کے رب نے اولادِ آدم کی پشت سے ان کو نکالا اور ان سے انہی کے متعلق اقرار لیا کہ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں سب نے جواب دیا کہ کیوں نہیں ہم سب اس کے گواہ ہیں''۔

اس ارشادِ خداوندی کا یہ مطلب نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہر آدمی کی پیٹھ میں سے دوسرے آدمی کو نکال کر ان سب کو کسی میدان میں جمع کیا اور پھر ان سب سے پوچھا کہ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ بلکہ اللہ تعالیٰ نے یہ الفاظ بہ طور استعارہ استعمال فرمائے ہیں اور ان کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ہستی کا اقرار انسان کی فطرت میں ودیعت کر دیا گیا ہے۔ اگر اس کا ماحول ملحدانہ نہ ہو اور اس پر معاشرے یا حکومت کی طرف سے کوئی پابندی عائد کر کے اسے مجبور نہ کر دیا جائے بلکہ آزادی سے غور وفکر کا موقع دیا جائے تو اس کائنات کا مشاہدہ کر کے اس کا دل خود بخود پکار اٹھے گا کہ اس کا ایک خالق ضرور ہے۔

دنیوی ضابطے اور خدا کا وجود

دنیا کے ہر متمدن معاشرے اور ہر ترقی یافتہ ملک میں خواہ اس کی حکومت اور عوام خدا کی ہستی کے قائل ہوں یا نہ ہوں بعض اخلاقی ضابطوں پر عمل کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر چوری ہر ملک میں جرم ہے' قتل ہر ملک میں جرم ہے' کسی کی بہو بیٹی کو اغوا کر لینا ہر ملک میں جرم ہے' اشیائے خوردنی میں ملاوٹ ہر ملک میں جرم ہے' اسمگلنگ ہر ملک میں جرم ہے' رشوت لینا ہر ملک میں جرم ہے' شراب اور دوسری نشہ آور چیزوں کا استعمال بعض اشتراکی ممالک میں بھی جرم ہے' زنا بھی بہت سے اشتراکی معاشروں میں جرم ہے' مرد اور عورت کا رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو کر اس کا باضابطہ اعلان ہر ملک میں ضروری ہے۔

سوال یہ ہے کہ یہ تو وہ اخلاقی ضابطے اور قوانین ہیں جو اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیا کے ذریعے ہمیں عطا فرمائے' اور ان پر عمل پیرا ہونے کا حکم دیا۔ جو معاشرے خدا کے وجود کے منکر ہیں ان سے دریافت کیا جا سکتا ہے کہ جب وہ خدا کی ہستی پر ایمان نہیں رکھتے تو انہوں نے اس کے بنائے ہوئے قوانین کو اپنے ملکی قوانین کے طور پر کیوں قبول کر لیا۔ انہیں کس ذریعے سے معلوم ہوا کہ کون سی چیز جائز اور کون سی ناجائز ہے؟ کون سی غلط اور کون سی صحیح ہے؟ اس کا ایک ہی جواب ہے کہ انہوں نے جائز و ناجائز اور غلط اور صحیح میں امتیاز اس ہستی کے مقرر کردہ اصولوں سے کیا جس کے وہ منکر ہیں۔ یہ بالکل ایسی بات ہے کہ جس گائے کا دودھ پیا جائے اس کے وجود کا انکار کر دیا جائے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ خداوند تعالیٰ کے وجود کے منکروں کے لئے بھی اس کے سوائے اور کوئی چارۂ کار نہیں کہ وہ خداوند تعالیٰ کی عطا کردہ تعلیم کو قبول کر لیں اور اس پر عمل پیرا ہوں۔ دوسرے الفاظ میں منکرینِ خدا زبان سے تو خدا کی ہستی اور اس کے وجود کا انکار کرتے ہیں مگر اپنے عمل سے اس کے وجود کی شہادت دیتے ہیں۔ خدا کی ہستی کا یہ بہت بڑا اور ناقابلِ تردید ثبوت ہے۔

خدا کے وجود پر اقوامِ عالم کی شہادت

جس دور سے انسان کی تاریخ کا آغاز ہوتا ہے یعنی جب سے اس نے عقل وخرد

کی منزل میں قدم رکھا اسی وقت سے کسی نہ کسی رنگ میں وہ ایک ایسی ہستی پر ایمان رکھتا چلا آ رہا ہے جو اس کی تمام اُمیدوں اور آرزوؤں کا مرکز ہے، جو موت وحیات کی مالک ہے، جو اس کی محافظ و رازق ہے اور جس کی خوشنودی کی خاطر وہ اپنے رنگ میں عبادت کرتا اور قربانیاں دیتا رہا ہے۔ خدا کی ہستی پر ایمان کا یہ سلسلہ انسان کے منزلِ شعور میں قدم رکھنے کے بعد سے لے کر آج تک جاری ہے حتیٰ کہ افریقہ کے وحشی قبائل جو آج تک درختوں کے پتوں سے اپنا ستر ڈھانکتے ہیں خدا کی ہستی پر شروع سے ایمان رکھتے چلے آ رہے ہیں۔

جن سیاحوں نے افریقہ جا کر اور وہاں کے قبائل میں گھل مل کر ان کے حالات کی تحقیق کی ان کا بیان ہے کہ ایسے قبائل جو ابتدا سے آج تک اپنے قدیم تمدن پر قائم ہیں یعنی درختوں کے پتوں سے اپنا ستر ڈھانپتے ہیں اور مردہ انسانوں کا گوشت کھاتے ہیں وہ بھی خدا کی ہستی پر ایمان رکھتے ہیں۔ ان قبائل میں ''ہوٹن ٹوٹ'' قبائل افریقہ کی قدیم ترین قوم ہے جو بہت سے خداؤں کی قائل ہے اور ان سب پر ایک بڑے خدا کا وجود تسلیم کرتی ہے اور اسے سارے خداؤں کا خدا قرار دیتی ہے۔ افریقہ کی قدیم اقوام میں دوسری قابل ذکر قوم ''بانٹو'' قبیلے کی ہے جو ایک سے زیادہ خداؤں پر یقین رکھتے ہیں لیکن ان میں سب سے بڑے خدا کو وہ ''مولن جو'' کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ ''مولن جو'' ان کے عقیدے کی رو سے روئے زمین پر سب سے عظیم ہستی ہے جو زندگی، موت اور فتح وکامرانی کی مالک ہے۔ وہ ''مولن جو'' کو اس سے بہت بلند و بالا سمجھتے ہیں کہ یہ ہستی جادو ٹونے سے کسی کے قبضے میں آ سکے۔ بانٹو قبائل اس ہستی کے نہ بت بناتے ہیں اور نہ ان کی پرستش کرتے ہیں۔ افریقہ کے ایک اور قبیلے ''ذولو'' (Zulu) کا زمانۂ قدیم سے یہ عقیدہ چلا آ رہا ہے کہ دنیا کو ایک ایسی طاقت نے پیدا کیا جو ہمیں نظر نہیں آتی۔ اس طاقت کو ''ذولو'' قبیلے کے لوگ باپ کے مقدس نام سے پکارتے ہیں۔

میکسیکو اقوام عالم میں ایک ایسی قوم ہے جسے تہذیب کا بانی قرار دیا جاتا ہے اور اس کا شمار دنیا کی قدیم ترین شائستہ اقوام میں کیا جاتا ہے۔ اس قوم کا یہ عقیدہ تاریخ میں آج تک محفوظ ہے کہ اس کائنات کو ''اونا ولونا'' نے پیدا کیا۔ ''اونا ولونا'' سے پہلے کچھ نہ تھا۔

صرف ''اوناولونا'' تھا۔اس نے پہلے فضا کوتخلیق کیااور پھر سورج' چاند' ستارے اور زمین پیدا کی۔

میکسیکو یا صرف افریقہ کے وحشی قبائل ہی پر منحصر نہیں بلکہ روئے زمین کا کوئی خطہ اور متمدن دور کا کوئی زمانہ ایسا نہیں جب بنی نوع انسان نے خدا کے وجود کو کسی نہ کسی صورت میں تسلیم نہ کیا ہو۔ یہ تو ہوسکتا ہے کہ دنیا کے کسی حصے کے کچھ لوگ کچھ مدت کے لئے غلط اور خلافِ عقل عقیدہ قبول کرلیں' تھوڑی دیر کے لئے یہ بھی فرض کیا جاسکتا ہے کہ کچھ مدت کے لئے ساری دنیا کے لوگ ایک خلافِ عقل عقیدے پر ایمان لے آئیں لیکن یہ نہیں ہوسکتا کہ ایک غلط اور عقل کے خلاف عقیدے کو روئے زمین کے تمام لوگ ہر زمانے میں درست تسلیم کریں کیونکہ انسانی فطرت بحثیت مجموعی ایسے عقیدے پر قائم نہیں رہ سکتی جس کی عقل اور مشاہدہ شہادت نہ دے اور جو اس کی اندرونی آواز کے بھی خلاف ہو اور سب سے بڑھ کر یہ کہ جسے قبول کرنے کی صورت میں اسے کوئی مالی یا مادی فائدہ بھی نہ پہنچتا ہو۔ پس قدیم زمانے سے لے کر آج تک روئے زمین کے کسی نہ کسی حصے پر موجود ہزاروں لاکھوں انسانوں کا ایک ہستی کو اپنا معبود قرار دینا اس امر کا ثبوت ہے کہ خدا موجود ہے جس کے وجود پر ایمان رکھنا ہر زمانے اور دنیا کے ہر خطے کے لوگوں نے زندگی کی بنیادی ضرورت اور اپنی فطرت کی آواز قرار دیا ہے۔

بقائے نسل کا شعور اور خدا کا تصور

دنیا کے تمام مفکر، فلسفی اور سائنس داں یہ حقیقت تسلیم کرتے ہیں کہ روئے زمین پر پائی جانے والی ہر جاندار مخلوق میں اپنی نسل بڑھانے کا رُجحان پایا جاتا ہے۔ انسان تو باشعور اور متمدن ہے اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ شادی سے اس کی ایک بڑی غرض اپنی نسل کی بقا اور اپنی جائیداد کا وارث پیدا کرنا ہوتا ہے یا وہ شادی اس لئے بھی کرتا ہے کہ جب ضعیفی کا زمانہ آئے تو اس کی اُولاد اس کے لیے سہارا بن سکے لیکن گھوڑے' گدھے' گائے' بیل' بھیڑ بکریاں' پرندے اور پانی کے جانوروں حتیٰ کہ نباتات میں یہ شعور کس نے پیدا کیا کہ وہ اپنی

نسل بڑھائیں۔اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ایک مدبر ہستی موجود ہے جو ہر مخلوق کو اس کی نسل قائم رکھنے اور اسے بڑھانے پر آمادہ رکھتی ہے تا کہ اس کائنات کا نظام قائم رہ سکے۔

جب پرندوں کے انڈے دینے کا وقت آتا ہے تو وہ کسی محفوظ مقام پر تنکے جمع کرنا شروع کر دیتے ہیں تا کہ گھونسلوں میں انڈے محفوظ رہ سکیں۔سوال یہ ہے کہ انہیں کس نے بتایا کہ اب انڈے دینے کا وقت آ رہا ہے اور ان کی حفاظت کے لئے ضروری ہے کہ کسی محفوظ مقام پر تنکے جمع کئے جائیں وہ یہ انڈے کسی کھلی جگہ پر کیوں نہیں دیتے۔پھر انڈے دینے کے بعد پرندے اُن پر بیٹھ کر انہیں سیتے ہیں۔سوال یہ ہے کہ ان پرندوں کو یہ شعور کس نے عطا کیا کہ جب تک ان انڈوں پر بیٹھ کر وہ اپنے پروں سے انہیں گرمی نہیں پہنچائیں گے اس وقت تک بچے نہیں نکل سکیں گے۔بچے نکلنے کے بعد انہیں زندہ رکھنے کے لئے وہ دانے کی تلاش میں نکلتے ہیں اور اس وقت تک اپنی چونچ سے انہیں دانہ بھراتے ہیں جب تک وہ خود اڑنے اور اپنا رزق تلاش کرنے کے قابل نہیں ہو جاتے۔سوال یہ ہے کہ انہیں بچوں کے لئے دانے کی تلاش میں نکلنے کے لئے کس نے آمادہ کیا۔انڈوں سے بچے نکلتے ہی وہ اپنے گھونسلوں سے ہمیشہ کے لئے کیوں نہیں اُڑ جاتے، وہ کیوں دانہ لے لے کر تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد گھونسلے میں واپس آتے ہیں۔اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ایک ایسی ہستی جو حکیم مطلق بھی ہے موجود ہے جس نے پرندوں میں یہ شعور پیدا کیا کہ اب انڈے دینے کا وقت آ گیا ہے اس لیے انہیں گھونسلا بنانا چاہئے اور یہ گھونسلا کسی محفوظ مقام پر بنانا چاہئے، انڈوں پر بیٹھ کر انہیں اپنے پروں سے گرمی پہنچانا چاہئے، انڈوں سے بچے نکلنے کے بعد انہیں اس وقت تک دانہ کھلانا چاہئے جب تک وہ خود اڑنے اور دانہ کھانے کے قابل نہیں ہو جاتے۔اگر ایسا نہ ہوتا تو آج روئے زمین پر کوئی حیوان یا پرندہ نظر نہ آتا۔

موجودات کی فضیلت اور خدا کا وجود

یونانی فلاسفہ کے مکتبۂ فکر نے ایک بہت بڑے فلسفی کو جنم دیا جس کا نام کلیانقس تھا یہ تین سو قبل مسیح میں پیدا ہوا، اس نے خدا کی ہستی پر طویل غور و خوض کرنے کے بعد متعدد

عقلی دلائل پیش کیے۔ وہ کہتا ہے کہ اس کائنات میں پائے جانے والے موجودات میں بے شمار اختلافات ہیں۔ انہی اختلافات کی بنا پر موجودات کی ایک نوع کو دوسری نوع پر برتری حاصل ہے۔ مثال کے طور پر'' کچھوے پر گھوڑے کو فضیلت حاصل ہے' بیل گدھے پر فضیلت رکھتا ہے' بیل پر شیر کو فوقیت حاصل ہے''۔ کلیاقس کے اس نظریئے کو وسعت دے کر یوں کہا جا سکتا ہے کہ اس کائنات میں ہر چیز دوسرے سے افضل ہے اور فضیلت کا یہ سلسلہ برابر نیچے سے اُوپر کی طرف جا رہا ہے۔ سورج کو چاند پر برتری حاصل ہے' زمین کو چاند پر فضیلت حاصل ہے' پانی کو دوسرے عناصرِ اربعہ پر برتری حاصل ہے' پانی میں بھی کثیف اور گندے پانی پر صاف اور لطیف پانی کو فضیلت حاصل ہے۔ جمادات پر نباتات کو فضیلت حاصل ہے۔ جمادات میں بھی بعض پتھر بعض پر فوقیت رکھتے ہیں مثلاً سنگِ مرمر کو عام پتھروں پر فضیلت حاصل ہے۔ نباتات میں گھاس اور خاردار جھاڑیوں پر پھل دار درختوں کو فضیلت حاصل ہے۔ نباتات پر حیوانات کو فضیلت حاصل ہے۔ حیوانات میں بلیوں اور کتوں پر گائے اور بھینس کو فضیلت حاصل ہے' گیدڑ اور لومڑی پر شیر کو فضیلت حاصل ہے' حیوانات پر انسان کو فضیلت حاصل ہے۔ انسانوں میں بدصورت انسان پر خوبصورت انسان کو فضیلت حاصل ہے' عقل مند آدمی کو بے وقوف آدمی پر برتری حاصل ہے' بدکردار اور بداخلاق آدمی پر نیک نفس اور خوش اخلاق آدمی کو برتری حاصل ہے۔

جب یہ بات ثابت ہوگئی کہ انسان تمام موجودات میں افضل ہے تو یہ بھی ثابت ہوگیا کہ اس کائنات میں فضیلت کا ایک ارتقا پایا جاتا ہے اور ہم ہر نوع کو دوسری نوع سے افضل پاتے ہیں پھر اس نوع میں بھی باہم ایک کی دوسرے پر فضیلت پائی جاتی ہے حتیٰ کہ انسان کو دیکھتے ہیں جو سب سے افضل ہے اور اس میں بے شمار کمالات موجود ہیں۔ سوال یہ ہے کہ ایک ادنیٰ مخلوق سے لے کر انسان تک جب ایک کی دوسرے پر برتری اور فضیلت کا سلسلہ جاری ہے تو اسے انسان پر کیوں ختم کر دیا جائے؟ اسے کیوں نہ اور آگے لے جایا جائے کیونکہ انسان میں بہت سے کمالات اور فضائل کے باوجود بہت سے نقائص بھی پائے جاتے ہیں مثلاً وہ جھوٹ بھی بولتا ہے' حرام بھی کھاتا ہے' دوسروں کو آزار بھی پہنچاتا ہے' عقل

وفہم کے لحاظ سے بھی اس میں کمزوریاں پائی جاتی ہیں۔ اپنی تمام طاقتوں کے باوجود وہ عاجز اور بے بس بھی ہے حتیٰ کہ فنا ہو جاتا ہے۔ موجودات میں ایک کی دوسرے پر جو برتری اور فضیلت پائی جاتی ہے اس کا تقاضا ہے کہ ایک وجود ایسا بھی ہونا چاہیئے جو انسان سے بھی افضل ہو اور اس میں کسی قسم کا نقص نہ پایا جائے جو تمام کمالات کا جامع ہو پس ثابت ہوا کہ وہ ہستی خدا ہے کیونکہ اس کے وجود اور کامل صفات کی بے شمار شہادتیں موجود ہیں اور کوئی ذی فہم اور منصف مزاج ان شہادتوں کا انکار نہیں کر سکتا۔

خدا کے وجود پر ذہنِ انسانی کی شہادت

فرانس کا مشہور فلسفی ڈیکارٹ خداوند تعالیٰ کی ہستی پر ایک عجیب اور بڑی لطیف دلیل پیش کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اگر خدا کا وجود نہ ہوتا تو ہمارے ذہن میں کبھی اس کا تصور پیدا نہ ہوتا۔ ڈیکارٹ جو کچھ کہنا چاہتا ہے اس کی تشریح یوں کی جا سکتی ہے کہ انسان کے ذہن میں انہی اشیا کا تصور پیدا ہوتا ہے جو موجود ہوں' ایسی اشیا جن کا وجود نہ ہو ان کا تصور اور خیال اس کے ذہن میں آ ہی نہیں سکتا کیونکہ انسان خود موجود ہے' ایک موجود چیز ہی جس میں عقل و شعور بھی ہو ایک موجود چیز کا تصور کر سکتی ہے۔ چونکہ انسان بھی موجود ہے اس لئے وہ خدا کا تصور کرتا ہے اس سے ثابت ہوا کہ خدا موجود ہے۔

اس دلیل پر ایک اعتراض پیدا ہوتا ہے کہ بہت سی اشیا ایسی بھی ہیں جن کا کوئی وجود نہیں مگر اس کے باوجود انسان کے ذہن میں ان کا تصور آتا ہے مثال کے طور پر پریاں' دیو اور بھوت وغیرہ حقیقت میں موجود نہیں مگر ہماری کتابیں ان کی داستانوں سے بھری پڑی ہیں۔ دراصل یہ اعتراض تدبر کی کمی کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ یقیناً دیو' پریوں اور بھوتوں کا تصور ہمارے ذہن میں آتا ہے حالانکہ ان کا وجود نہیں مگر ہم جن شکلوں اور صورتوں میں ان کا تصور کرتے ہیں وہ فرضی نہیں ان کا وجود ہے۔ مثلاً جب ہم پریوں کا تصور کرتے ہیں تو ہمارے ذہن میں نہایت خوبصورت اور جوان عورتوں کا تصور پیدا ہوتا ہے جن کے پر ہوتے ہیں اور ان پروں سے وہ اڑتی پھرتی ہیں۔ ہر شخص جانتا ہے کہ خوبصورت عورتیں اور پر و بال

دنیا میں موجود ہیں، ہمارے ذہن نے ان پروں کو خوبصورت عورتوں کے شانوں کے ساتھ پیوست کر دیا۔ گویا پریوں کا وجود نہ سہی مگر اس مخلوق اور ان اعضا کا تو وجود ہے جن سے ہمارا ذہن پریوں کا جسم مرکب کر دیتا ہے۔ اسی طرح جب ہم دیو کا تصور کرتے ہیں تو ہمارے ذہن میں ایک ایسی ڈراؤنی اور ہیبت ناک شکل پیدا ہوتی ہے جو انسان اور کسی خونخوار درندے سے مل کر بنتی ہے۔ اب ظاہر ہے کہ دیو کا وجود نہ سہی مگر خونخوار جانور اور ڈراؤنے انسانوں کا تو وجود ہے، جن کے اعضا کی ترکیب سے ہمارا ذہن دیو کا تصور پیدا کر لیتا ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ جب تک کوئی چیز موجود نہ ہو ہمارے ذہن میں اس کا تصور پیدا ہو سکتا ہی نہیں اور چونکہ ہر شخص کے ذہن میں خواہ وہ منکرِ خدا ہی کیوں نہ ہو خدا کا تصور پیدا ہوتا ہے اس لئے ضرور خدا موجود ہے۔

جدید سائنس اور خدا کا وجود

موجودہ دور سائنس اور ٹیکنالوجی کا دور ہے۔ اس ترقی یافتہ دور میں ہر نظریئے کو سائنس کی کسوٹی پر پرکھا جا رہا ہے اور جو نظریہ اس معیار پر پورا نہیں اترتا اسے رد کیا جا رہا ہے لیکن یہ عجیب بات ہے کہ خدا کے وجود کی سب سے مستحکم اور ناقابل تردید شہادت سائنس ہی مہیا کرتی ہے مثلاً ہماری زمین سورج سے توانائی اور حرارت حاصل کرتی ہے۔ اگر سورج کا ذخیرۂ آتش ختم ہو جائے تو زمین پر کسی جاندار کا وجود باقی نہ رہے بلکہ یہ زمین بھی فنا ہو جائے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ کوئی ایسی صاحبِ حکمت ہستی موجود ہے جس نے ہمارے کرۂ ارض پر زندگی قائم رکھنے کے لئے سورج کو پیدا کیا اور اس میں اتنی حرارت رکھ دی جو زمین پر زندگی اور اس کی نشو و نما کے لئے ضروری تھی۔ ہماری زمیں سورج کے گرد گردش کرتی ہے۔ اگر یہ ساکن ہوتی تو نہ موسموں کا تغیر و تبدل ہوتا اور نہ دن رات کا سلسلہ جاری ہوتا اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ایک ایسی ہستی ضرور موجود ہے جس نے زمین میں سورج کے گرد گردش کرنے کی صلاحیت پیدا کی تاکہ شب و روز اور موسموں کے تغیر و تبدل کا سلسلہ جاری رہے۔ سائنس کہتی ہے کہ سورج کا زمین سے فاصلہ ۹ کروڑ تیس لاکھ میل ہے۔ اتنے فاصلے

کے باوجود موسم گرما میں اس قیامت کی گرمی پڑتی ہے کہ لوگ الاماں پکار اٹھتے ہیں۔ اگر یہ فاصلہ ۹ کروڑ میل کی بجائے صرف ساڑھے چار کروڑ میل ہوتا تو یقیناً اس کرۂ ارض کی ہر چیز جل کر بھسم ہو جاتی۔ اگر اس کا فاصلہ ۹ کروڑ تیس لاکھ میل کی بجائے ۱۸ کروڑ ۶۰ لاکھ میل ہوتا تو کرۂ ارض پر اتنی شدید سردی پڑتی کہ ساری دنیا برف بن جاتی اور کسی ذی روح حتی کہ نباتات کا بھی وجود نہ ہوتا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ایک مدبر بالا رادہ ہستی موجود ہے جس نے اپنی حکمت کے تحت سورج اور زمین کے درمیان اتنا فاصلہ رکھا تا کہ کرۂ ارض پر زندگی قائم رہ سکے اور اس کی نشو و نما کا عمل جاری رہ سکے اس فاصلے میں نہ کمی ہوتی ہے نہ بیشی۔

سائنس کہتی ہے کہ زمین سورج کے گرد بیضوی شکل کے مدار میں گردش کرتی ہے۔ بالکل گول اور دائرہ نما مدار میں گردش نہیں کرتی۔ بیضوی مدار میں گردش کرنے کا نتیجہ ہے کہ کبھی تو زمین سورج کے قریب سے ہو کر گزرتی ہے اور کبھی گردش کرتی ہوئی اس سے دور نکل جاتی ہے۔ جب زمین سورج کے قریب سے گزرتی ہے تو اس کی حرارت کی وجہ سے ہمارے کرۂ ارض پر گرمی کا موسم آ جاتا ہے اور جب زمین گردش کرتی ہوئی اس سے دور چلی جاتی ہے تو سردیوں کا موسم آ جاتا ہے۔ اس طرح موسم کی تبدیلی ہماری زندگی اور اس کے تمام اسباب کے قیام اور بقائے صحت کا باعث بنتی ہے لیکن اگر زمین بیضوی مدار کی بجائے گول مدار میں گردش کرتی تو سورج اور زمین کا فاصلہ ہمیشہ یکساں رہتا یعنی ہمارے کرۂ ارض پر یا تو ہمیشہ گرمی رہتی یا ہمیشہ سردی۔ اس صورت میں زمین پر زندگی کا وجود ہی نہ ہوتا۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ زمین سورج کے گرد گول مدار میں کیوں گردش نہیں کرتی اس کے لئے بیضوی مدار میں گردش کرنے کا راستہ کس نے مقرر کیا پھر یہ اپنا مدار تبدیل کیوں نہیں کرتی، یہ اپنے دائرے سے باہر کیوں نہیں نکل آتی۔ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ ایک ایسی صاحب ارادہ اور مدبر ہستی موجود ہے جس نے زمین کو ایسے مدار میں گردش دی جس کے نتیجے میں موسموں کا تغیر و تبدل قائم رہتا ہے اور وہ اس مدار سے ایک انچ ادھر اُدھر نہیں ہوتی۔

سائنس کہتی ہے کہ پانی کا اپنی ذات میں کوئی وجود نہیں بلکہ یہ دو گیسوں کا مجموعہ ہے جن میں سے ایک کا نام ہائیڈروجن اور دوسری کا نام آکسیجن ہے۔ان دونوں کے باہم ملنے سے پانی وجود میں آ گیا۔حیرت کی بات یہ ہے کہ ان میں سے ایک گیس یعنی آکسیجن کی خاصیت اشیا کو جلانا اور دوسری گیس یعنی ہائیڈروجن کی خاصیت آگ کو قبول کرنا اور جلنا ہے مگر جب یہ دونوں گیسیں ایک خاص تناسب سے باہم مل جاتی ہیں تو پانی وجود میں آ جاتا ہے۔سوال یہ ہے کہ آکسیجن اور ہائیڈروجن میں یہ خاصیتیں کیسے پیدا ہوئیں اور ان دو متضاد خاصیتوں کی گیسوں کے ملنے سے ایک تیسری اور متضاد چیز پانی کیسے پیدا ہو گیا؟ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ایک مدبر بالا رادہ ہستی موجود ہے جس نے اپنی خاص حکمت سے دو مختلف گیسوں کی آمیزش سے پانی پیدا کیا۔

سائنس کہتی ہے کہ آکسیجن ہر جاندار کے لئے ضروری ہے اس کے بغیر کوئی ذی حیات زندہ نہیں رہ سکتا۔سطح زمین پر پائے جانے والے جاندار تو کھلی فضا میں سانس لیتے ہیں اور اس سانس کے ذریعے آکسیجن ان کے جسم میں داخل ہو کر ان کی زندگی برقرار رکھتی ہے لیکن سمندروں کی گہرائی میں پائے جانے والے بے شمار آبی جانور کس طرح زندہ رہ سکتے ہیں کیونکہ انہیں تو کھلی فضا میسر نہیں؟ سائنس کی جدید تحقیق سے ثابت ہو گیا ہے کہ سمندروں کے پانی میں بہت سی گیسیں ملی ہوئی ہیں جن میں آکسیجن بھی شامل ہے اور اس آکسیجن کی مقدار ایک سو ستر کھرب ٹن ہے۔سمندری جانور سمندروں کے پانی میں پائی جانے والی یہی آکسیجن حاصل کرتے اور اپنی زندگی برقرار رکھتے ہیں۔اگر سمندروں کے پانی میں آکسیجن نہ ہوتی تو کوئی آبی جانور زندہ نہیں رہ سکتا تھا بلکہ روئے زمین پر زندگی کا وجود ہی نہ ہوتا کیونکہ قرآن حکیم اور سائنس دونوں کی رو سے زندگی کا آغاز پانی میں ہوا۔(سورہ النور آیت نمبر ۴۵)

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ کوئی صاحب تدبر و حکمت ہستی موجود ہے جس نے سمندر کے پانی میں آکسیجن کی اتنی مقدار شامل کر دی جو آبی جانوروں کی زندگی کی بقا کے

لئے ضروری تھی ورنہ اندھے مادہ سے ایسی حکمت و دانائی کے کارناموں کی توقع کرنا انتہا درجے کی نادانی ہے۔

سائنس دانوں نے تحقیق کرنے کے بعد ثابت کیا ہے کہ ہر ذرہ اپنے اندر ایک کائنات لئے ہوئے ہے چنانچہ انگلستان کے ممتاز سائنس دان ''سر ارنسٹ ردرفورڈ'' (Sir Ernest Rutherford) نے ۱۹۱۱ء میں طویل تحقیق کے بعد انکشاف کیا کہ ایک باریک ترین ذرے میں اور بھی بہت سے ذرات ہوتے ہیں جو اس ذرے سے بھی چھوٹے ہوتے ہیں۔ کچھ مدت کے بعد ایک اور سائنس دان ''نیلز بوہر'' (Niels Bohr) نے جو ڈنمارک کا رہنے والا تھا اپنی تحقیق کے نتائج کا اعلان کیا۔ اس نے بتایا کہ ہر ذرے میں ایک نظام شمسی پوشیدہ ہے یعنی جس طرح سورج کے گرد ہماری زمین اور بہت سے سیارے گردش کرتے رہتے ہیں اسی طرح ہر ذرے میں ایک مرکزی ذرہ ہے جس کے گرد بہت سے باریک در باریک ذرات مصروف گردش رہتے ہیں۔ ان میں دو قسم کے ذرات شامل ہیں' ایک الیکٹرون (Electron) اور دوسرے پروٹون (Proton)۔ الیکٹرون منفی طاقت والے ذرات کہلاتے ہیں اور پروٹون مثبت چارج والے۔

ایٹم کے متعلق جدید تحقیق یہ ہے کہ یہ الیکٹرون اور پروٹون کا مجموعہ ہے یا دونوں اس میں شامل ہیں بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ یہ دونوں اس کے بنیادی اجزائے ترکیبی ہیں۔ پروٹون اس (ذرے) کے مرکز میں رہتے ہیں اور الیکٹرون اس مرکز کے چاروں طرف گردش کرتے رہتے ہیں۔ اسی مضمون کو ان سطور کے راقم نے اپنے اس شعر میں بیان کیا ہے ؎

ہر قطرہ داستانِ نمودِ حیات ہے ہر ذرہ اپنی ذات میں اِک کائنات ہے

ذرات کے اس باریک در باریک نظام پر غور کرنے کے بعد کیا ہماری عقل اس نظام کا کوئی خالق تسلیم نہیں کرتی؟ کیا ان باریک ذروں میں ان سے بھی باریک ذروں کی موجودگی اور ان سے مثبت اور منفی قوتوں کا اخراج اور ان کا ایک دوسرے پر اثر انداز ہونا'

ایٹم کے پروٹون کا ذرے کے مرکز میں رہنا اور الیکٹرون کا اس مرکز کے چاروں طرف مصروفِ گردش رہنا ثابت نہیں کرتا کہ اس عجیب وغریب نظام کا ایک خالق ہے جس کی حکمت اور ارادے سے یہ سب کچھ ہو رہا ہے ورنہ اندھے مادے سے اس قسم کے پیچیدہ کارنامے سرانجام دینے کی توقع رکھنا خلافِ عقل ہے۔

سائنس دان کہتے ہیں کہ روشنی بے شمار باریک در باریک ذرات کے مجموعے کا نام ہے جو لہروں کی صورت میں سورج سے ہماری زمین کی طرف رواں دواں رہتی ہے۔ یہ لہریں اتنی باریک ہوتی ہے کہ ۶۲ ہزار لہریں ایک انچ جگہ میں سما جاتی ہیں۔ روشنی سات رنگوں کے مجموعے کا نام ہے یہ سب رنگ سورج سے ہی خارج ہوتے ہیں، یہ رنگ ہر ساعت اور ہر گھڑی کسی وقفے کے بغیر خارج ہوتے رہتے ہیں مگر ان کا اخراج بے ترتیبی کے ساتھ نہیں ہوتا بلکہ ان کے اخراج میں ایک خاص ترتیب ہوتی ہے ورنہ زمین پر پہنچنے تک یہ رنگ باہم مل کر سفید رنگ کی روشنی میں تبدیل نہ ہوسکیں جن کے بغیر ہماری زندگی ناممکن ہو جائے۔ سوچئے اور بار بار سوچئے کہ باریک در باریک ذروں کے مجموعے کا مل کر روشنی کی صورت اختیار کرنا اور سورج سے سات رنگوں کا ایک خاص ترتیب سے خارج ہونا جو زمین پر پہنچ کر سفید رنگ کی روشنی میں تبدیل ہو جاتے ہیں ــــ کیا اس نظام اور ترتیب کے پیچھے کوئی صاحب حکمت و ارادہ ہستی کا دستِ قدرت کارفرما نہیں؟ سورج سے جو رنگ خارج ہوتے ہیں ان میں ایسی ترتیب کیسے قائم ہوگئی کہ وہ زمین پر پہنچ کر سفید روشنی میں تبدیل ہو جاتے ہیں، یہ ترتیب کس نے قائم کی؟ کوئی تو ہے؟

مشاہداتی دلائل اور خدا کا وجود

مشہور دانشور اے کریسی ماریسن نے ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے "Man does not stand alone" اس فاضل دانشور نے اپنی اس کتاب میں خدا کے وجود پر جو سائنسی دلائل دیئے ہیں وہ عقلِ انسانی کو براہ راست اپیل کرتے ہیں مثلاً ماریسن کہتا ہے

کہ زمین سورج کے گرد ایک ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے گردش کرتی ہے لیکن اگر اس کی رفتار موجودہ رفتار سے مختلف ہوتی مثال کے طور پر اگر زمین ایک ہزار میل فی گھنٹہ کی بجائے ایک سو میل فی گھنٹہ کی رفتار سے گردش کرتی تو ہمارے دن اور رات کی مدت موجودہ مدت سے دس گنا طویل ہو جاتی اور موسم گرما کا دن ایک سو بیس گھنٹے سے لے کر دو سو گھنٹے تک طویل ہو جاتا۔ اندازہ لگائیے کہ جب دو سو گھنٹے تک سورج مسلسل ہماری زمین پر آگ برساتا تو کیا ہماری فصلوں، باغوں اور سرسبز جنگلوں میں سے کوئی چیز بھی باقی رہتی بلکہ حیوانات اور انسان تک جھلس کر فنا نہ ہو جاتے؟

سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کون ہے جس نے زمین کی گردش کی ایسی رفتار مقرر کی جس سے ہر موسم میں دن اور رات کی مدت اتنی مناسب اور موزوں ہوتی ہے جس میں ہم اپنا وظیفۂ زندگی بڑی خوش اسلوبی سے سرانجام دیتے رہتے ہیں۔ پس ثابت ہوا کہ ایک صاحبِ حکمت و ارادہ ہستی موجود ہے جس نے اس نظامِ شمسی کو ایک خاص انداز سے تخلیق کیا اور اس کی گردشیں مقرر فرمائیں۔

چاند کا فاصلہ زمین سے دو لاکھ چالیس ہزار میل ہے۔ اتنے فاصلے کے باوجود اس کی کشش سے سمندروں میں جو لہریں اٹھتی ہیں وہ کبھی کبھی تو ساٹھ فٹ کی بلندی تک پہنچ جاتی ہیں۔ اب تصور کیجئے کہ اگر چاند زمین سے دو لاکھ چالیس ہزار میل کی بجائے صرف پچاس ہزار میل دور ہوتا تو اس کی کشش اتنی سخت ہوتی کہ سمندروں سے پہاڑوں جتنی بلند لہریں اٹھتیں اور زمین پر اتنا زبردست سیلاب آتا کہ پہاڑوں کو بھی کاٹ دیتا زمین اس آبی طوفان کی شدت سے پھٹ جاتی اور ہمارے میدانوں میں اتنا پانی چڑھ آتا کہ اس کی گہرائی تقریباً ڈیڑھ میل تک پہنچ جاتی۔ کیا اس صورت میں روئے زمین پر کوئی جاندار باقی رہتا بلکہ کیا سرے سے یہاں بھی زندگی وجود میں آ بھی سکتی تھی؟ پس ثابت ہوا کہ ایک صاحبِ حکمت و ارادہ ہستی موجود ہے جس نے نہایت صحیح انداز سے زمین اور چاند کے درمیان فاصلہ مقرر فرمایا یہ فاصلہ روزِ اول سے آج تک یکساں ہے۔

بعض سمندروں میں ایک مچھلی پائی جاتی ہے جسے سامن کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ یہ مچھلی کسی دریا کے کنارے پیدا ہوتی ہے' جوان ہو کر یہ سمندروں میں چلی جاتی ہے اور مدتیں وہیں گزار دیتی ہے لیکن ایک مدت کے بعد وہ پھر اپنے اصل وطن کی طرف روانہ ہوتی ہے اور سمندر میں الٹا سفر کرتی ہے۔ وہ تیز وتند موجوں کو چیرتی ہوئی مسلسل اوپر کی جانب بڑھتی رہتی ہے' سیکڑوں میل کا سفر طے کرنے کے بعد وہ اس دریا کا رُخ کرتی ہے جہاں پیدا ہوئی تھی۔ اگر اس سے کبھی غلطی ہو جائے اور وہ کسی دوسری طرف رُخ کر لے تو اسے فوراً اپنی غلطی کا احساس ہو جاتا ہے اور وہ اپنی سمت درست کر کے اپنی صحیح جائے پیدائش کی طرف سفر جاری رکھتی ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ اگر وہ اس دریا کے دائیں کنارے کے پاس پیدا ہوئی تھی تو وہ کبھی بائیں کنارے کی طرف نہیں جائے گی اور اگر بائیں کنارے کے قریب پیدا ہوئی تھی تو کبھی دائیں کنارے کی طرف نہیں جائے گی۔

ایک اور مچھلی جو ایل کہلاتی ہے برمودا کے جزائر میں بچے دیتی ہے۔ یہ مچھلی امریکہ اور یورپ دونوں براعظموں میں پائی جاتی ہے۔ مذکورہ مچھلی دریاؤں اور جھیلوں میں جوان ہوتی ہے اور پھر یورپ اور امریکہ دونوں براعظموں سے برمودا کی طرف روانہ ہو جاتی ہے۔ برمودا کے جزائر یورپ سے ہزاروں میل کے فاصلے پر واقع ہیں۔ یہ طویل ترین فاصلہ وہ ہر حالت میں طے کر لیتی ہے اور جزائر برمودا پہنچ کر یہاں بچے دیتی ہے اور یہیں کے پانی میں موت سے ہمکنار ہو جاتی ہے۔ اس کے بچے جن کے لئے یہ ماحول بالکل اجنبی ہوتا ہے اور کوئی ان کی راہنمائی کرنے والا نہیں ہوتا جزائر برمودا سے اپنے والدین کے وطن کی طرف روانہ ہو جاتے ہیں۔ راستے میں ہزاروں طوفانی موجوں اور سمندری ریلوں سے گزرتے ہیں اور اپنے آپ کو ان سے بچاتے ہوئے سلامتی کے ساتھ ٹھیک ان جھیلوں اور دریاؤں میں پہنچ جاتے ہیں جہاں سے روانہ ہو کر ان کے والدین برمودا آئے تھے۔ یہاں یہ بچے قیام کرتے ہیں اور جب پوری طرح جوان ہو جاتے ہیں تو پھر جزائر برمودا کی طرف روانہ ہو جاتے ہیں اور وہاں پہنچ کر بچے دیتے ہیں اور مر جاتے ہیں۔ ان کے بچے بھی یہی سفر شروع کر دیتے ہیں۔ یہ سلسلہ معلوم نہیں کتنے لاکھ سال سے جاری ہے۔ عجیب تر بات یہ

ہے کہ برمودا کے جزائر کے قریب امریکی ایل اور یورپی ایل دونوں قسم کی مچھلیاں جمع ہوتی اور بچے دیتی ہیں مگر جب ان بچوں کے سفر کا وقت شروع ہوتا ہے تو وہ بالکل ناک کی سیدھ پر ٹھیک اپنے والدین کے وطن کا رُخ کرتے ہیں اور وہاں پہنچ کر دم لیتے ہیں۔ آج تک یہ کبھی نہیں ہوا کہ امریکی ایل مچھلی یورپ کی طرف یا یورپی ایل مچھلی امریکہ کی طرف روانہ ہوئی ہو۔

یہاں ہر سوچنے والا ذہن بجا طور پر سوچتا ہے کہ آخر وہ کون سا پوشیدہ اشارہ ہے جو ان کی راہنمائی کرتا ہے اور وہ اپنا یہ عجیب و غریب سفر جاری رکھتی ہیں، اس سے سر مو انحراف نہیں کرتیں بلکہ کبھی راستہ نہیں بھولتیں۔ ان کے ذہن میں فاصلوں اور سمتوں کا شعور کون پیدا کرتا ہے کہ وہ ٹھیک اپنی منزلِ مقصود کی طرف جاتی ہیں؟ ایسی منزل جس سے وہ شناسا بھی نہیں ہوتیں جبکہ نامہ بر کبوتروں کی طرح ان کی تربیت بھی نہیں کی جاتی۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ کوئی ہستی موجود ہے جس نے ان کی تربیت کا ایک نظام قائم کیا اور ان کے لئے کوئی سگنل مقرر کیا ہے۔

اگر آپ میں اشیاء پر غور کرنے اور ان سے نتائج اخذ کرنے کی صلاحیت ہے اور کبھی اتفاقاً آپ کی نظر پڑ گئی ہو تو آپ نے دیکھا ہوگا کہ آپ کے بالاخانے کی کھڑکی کے راستے ایک پروانے کی مادہ اندر داخل ہوتی ہے، اسے یہ جگہ پسند آ جاتی ہے، تھوڑی دیر نہیں گزرتی کہ نر پروانوں کا جمِ غفیر ادھر آ نکلتا ہے اور بڑا دور دراز فاصلہ طے کر کے پہنچ جاتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا پروانے کی مادہ نے کوئی پیغام نر پروانوں کو بھیجا تھا؟ یقیناً بھیجا ہوگا جو اتنے فاصلے سے انہوں نے سن لیا مگر آپ نہ سن سکے بلکہ آپ کو پروانے کی مادہ کے اپنے کمرے میں آنے کا احساس تک نہ ہو سکا۔ غور طلب بات یہ ہے کہ کیا اس مادہ پروانے میں کوئی ریڈیائی نظام ہے جس سے لہریں پیدا ہوتی ہیں اور وہ لہریں نر پروانوں کے دماغ میں لگا ہوا ریڈیو سیٹ وصول کر لیتا ہے اور پھر سارے نر پروانے ادھر چل پڑتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ انسان ریڈیو اور ایسا ٹیلی فون ایجاد کر چکا ہے جو فضا میں کام کرتا ہے لیکن اس کے باوجود ہم ابھی تک کسی نہ کسی حد تک تاروں کے محتاج ہیں اور فاصلوں کی حدوں کے بھی پابند

ہیں مگر پروانے ابھی تک ہم سے بہت آگے ہیں اور ان میں سے ہر پروانہ اپنا ایک ریڈیائی نظام رکھتا ہے۔ سوچئے اور خوب سوچئے کہ کیا یہ سب کچھ کسی بالا اور صاحب حکمت و ارادہ ہستی کے ارادے کے بغیر ہوتا ہے؟

جن لوگوں کو پرندوں سے دلچسپی ہے، جو پرندے پالتے اور ان کی نگہداشت کرتے ہیں وہ خوب جانتے ہیں کہ جن پرندوں کو وہ کم سنی کی حالت میں اُن کے گھونسلوں سے اٹھالاتے ہیں اور ان کے پر کتر کر انہیں پال لیتے ہیں، جب ان کے انڈے دینے کا وقت آتا ہے تو وہ بھی اپنے ماں باپ کی طرز پر گھونسلا بناتے ہیں حالانکہ انہوں نے اپنے والدین کے اس عمل کا مشاہدہ نہیں کیا ہوتا۔ آخر وہ کون ہے جو انہیں اس عمل پر ابھارتا ہے؟ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ کوئی ان کا تربیت کنندہ ہے جس نے ان کی فطرت میں ایک مخصوص طریقے سے آشیانہ بنانے کا شعور ودیعت کر دیا ہے، وہ اس کا مشاہدہ کریں یا نہ کریں خود بخود اس طریقے پر عمل کر کے اپنا گھونسلا بنا لیتے ہیں۔

اگر کسی جھینگے کا ایک پیر کسی وجہ سے کٹ جائے تو اس کے جسم میں جو تخلیقی خلیے موجود ہوتے ہیں وہ اسی وقت حرکت میں آ جاتے ہیں اور اس کٹے ہوئے پیر کی جگہ دوسرا پیر بنانا شروع کر دیتے ہیں۔ کچھ عرصے کے بعد کٹے ہوئے پیر کی جگہ نیا پیر نمودار ہو جاتا ہے اور اس کے ساتھ ہی جھینگے کے تخلیقی خلیے اپنا عمل روک دیتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ وہ کون ہے جو جھینگے کے تخلیقی خلیئے کو بتا دیتا ہے کہ اب اس کا کام ختم ہو گیا ہے وہ مزید عمل جاری نہ رکھے اور یہ خودکار مشین خود بخود بند ہو جاتی ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ کوئی ہستی ہے جو اس نظام کو کنٹرول کرتی ہے۔

علم حشرات الارض کے ماہرین جانتے ہیں کہ ایک خاص قسم کی بھڑ جب کسی ٹڈے کو پکڑتی ہے تو اس کے جسم پر ایسی جگہ کاٹتی ہے جس سے وہ صرف بے ہوش ہو جاتا ہے مرتا نہیں۔ اس کے بعد زمین کے کسی سوراخ میں اسے محفوظ کر دیتی ہے پھر وہ اس محفوظ شدہ ٹڈے کے قریب انڈے دیتی ہے، انڈوں سے بچے نکل کر اپنے قریب موجود بے ہوش ٹڈے سے اپنی خوراک حاصل کرنے لگتے ہیں۔ اس کے بعد یہ بھڑ باہر نکل کر سوراخ بند کر

دیتی ہے اور پھر مر جاتی ہے۔ اگر بھڑ اس ٹڈے کو بے ہوش کرنے کی بجائے مار کر محفوظ کرتی تو اس کا گوشت زہریلا ہو جاتا اور جب انڈوں سے بچے نکلتے تو وہ یہ گوشت کھا کر مر جاتے اور آج روئے زمین پر کسی بھڑ کا وجود نہ ہوتا۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کون ہے جس نے بھڑ میں یہ شعور بلکہ ذہانت پیدا کی کہ وہ ٹڈے کو مارتی نہیں بلکہ صرف بے ہوش کر دیتی ہے اور پھر اسے سوراخ میں محفوظ کر دیتی ہے اور انڈے بھی اس کے قریب دیتی ہے تاکہ بچوں کو غذا حاصل کرنے میں دشواری پیش نہ آئے۔ یہی نہیں بلکہ یہ سارا انتظام کر کے جب وہ سوراخ سے باہر نکلتی ہے تو اسے بند کر دیتی ہے تاکہ کوئی اور کیڑا اس راستے سے داخل ہو کر اس کے نوزائیدہ بچوں کو نقصان نہ پہنچا سکے۔ کیا بقائے نسل کا یہ عجیب وغریب اور حیران کن نظام کسی بالاتر مدبر اور صاحب ارادہ ہستی کا پتا نہیں دیتا؟

انسان ہو یا کوئی بھی جاندار مخلوق خواہ وہ نر ہو یا مادہ ان سب کے خلیوں میں ایسے جرثومے پائے جاتے ہیں جنہیں ''جینز'' (Genes) کہتے ہیں۔ یہی جرثومے ہر مخلوق میں اس کی نسلی اور صنفی خصوصیات قائم رکھتے ہیں یعنی جو نسلی خصوصیات والدین میں پائی جاتی ہیں وہی اولاد میں منتقل کرتے ہیں۔ یہ جرثومے اتنا اہم بلکہ اہم ترین فریضہ سرانجام دینے کے باوجود اتنے چھوٹے ہیں کہ اگر روئے زمین پر آباد اربوں انسانوں کے جرثوموں کو جمع کرنا ممکن ہوتا تو یہ سارے انگلی کے ایک پورے یعنی انگلی کے تیسرے حصے جتنی جگہ میں سما جاتے۔ کیا یہ کائنات کا سب سے بڑا عجوبہ نہیں؟ آخر وہ کون ہے جس نے ان جرثوموں کو اتنی قلیل جسامت عطا کی اور انہیں اتنا عظیم الشان کام سونپا جسے وہ بڑی مستعدی سے سرانجام دیتے ہیں۔ کیا اس باریک در باریک اور پیچیدہ نظام کا کوئی خالق نہیں؟

ہمارا جسمانی نظام اور خدا کا وجود

ہم اپنے معدے میں مختلف غذائیں داخل کرتے ہیں جن میں گوشت، روٹی، سبزی، انڈے، پھل، کافی، چائے، دودھ اور خشک میوے شامل ہوتے ہیں، اس کے بعد معدے میں داخل ہونے والی ہر غذا کیمیائی عمل سے اس طرح تحلیل ہوتی ہے کہ اس میں

سے ناکارہ اجزا الگ ہوجاتے ہیں اور مفید اجزا سے ایسے لحمیات بن جاتے ہیں جو ہمارے جسمانی خلیوں کو خوراک پہنچاتے ہیں۔ ہمارا نظام ہضم ایک سفری راستہ ہے۔ جس پر غذا کا قافلہ منہ سے معدے کی طرف روانہ ہوتا ہے اور پھر معدے سے اس کا دوسرا سفر شروع ہوتا ہے۔ اس راہ سے گزرنے والے مسافروں میں چونا، فولاد اور اسی قسم کے بہت سے اجزا کو ہمارا نظام ہضم جذب کرتا چلا جاتا ہے اور اس نظام کے کارپرداز اتنے ہوشیار اور مستعد ہیں کہ وہ انتہائی ضروری اجزا میں سے کسی ایک کو اپنی گرفت سے باہر نہیں نکلنے دیتے۔ پھر غذا کے سفر کے راستے میں جگہ بہ جگہ ایسے اسٹور بنے ہوئے ہیں کہ یہاں چربی اور دوسرے توانائی بخش اجزاء محفوظ ہوتے رہتے ہیں جو فاقے یا کم خوراک دستیاب ہونے کی صورت میں اس کمی کو پورا کر دیتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو صرف ایک دن غذا نہ ملنے کی وجہ سے انسان ہلاک ہوجاتا۔ جب معدہ ہماری غذا کو ہضم کر کے اسے ذروں میں تبدیل کر دیتا ہے تو ہمارے جسم میں جو اربوں خلیے اپنا کام کر رہے ہیں یہ غذا ان میں سے ہر خلیے کو پہنچتی ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ خلیوں کے لئے خوراک کی تقسیم کا یہ نظام اتنا دانشمندانہ ہے کہ ہر خلیے کو وہی خوراک پہنچتی ہے جو اس کی اپنی ذاتی ضرورت کے مطابق ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر ہمارے جسم میں جو خلیے ناخن بڑھانے کا کام کرتے ہیں انہیں وہی خوراک پہنچائی جاتی ہے جسے کھا کر وہ اپنا کام جاری رکھ سکیں۔ بالوں کے خلیوں کو وہی خوراک ملتی ہے جس سے وہ بالوں کی افزائش کا فریضہ سرانجام دے سکیں۔ یہ نہیں ہوتا کہ بال بڑھانے والی غذا کا حصہ ناخن یا ہڈیوں سے تعلق رکھنے والے خلیوں کی طرف چلا جائے یا ہڈیوں اور ناخنوں کی افزائش کرنے والے خلیوں کی غذا بال بڑھانے والے خلیوں میں داخل ہوجائے، اگر ایسا ہو تو سارا جسمانی نظام درہم برہم ہوکر رہ جائے۔

جب ہمارے جسم کے ان خلیوں کو ان کی خوراک مل جاتی ہے تو ان خلیوں میں ایک آتشیں کیفیت رونما ہوتی ہے جو ہمارے جسم میں حرارت پیدا کرتی ہے۔ اس مقصد کے لئے ہمارے جسمانی نظام میں ایسی خودکار بھٹیاں موجود ہیں جن میں مختلف قسم کی گیسیں پائی جاتی ہیں کیونکہ سائنس کا یہ اصول ہے کہ کوئی چیز اُس وقت تک نہیں جل سکتی جب تک اسے

جلانے والی دوسری چیز موجود نہ ہو چنانچہ ہمارے جسم کے ہر خلیے میں آکسیجن اور ہائیڈروجن دونوں قسم کی گیسیں موجود ہیں جن میں سے ایک کا کام جلنا اور دوسری کا جلانا ہے۔ ان کے جلنے سے حرارت پیدا ہوتی ہے اس کے نتیجے میں کاربن ڈائی آکسائیڈ وجود میں آتی ہے جسے فوراً خون اپنی گرفت میں لے لیتا ہے اور انہیں پھیپھڑوں تک پہنچاتا ہے۔ اس عمل کے نتیجے میں ہم سانس لیتے ہیں۔

ہمارے جسم میں آنکھ ایک ایسا قیمتی عضو ہے جو انسانی زندگی کے قیام و بقا اور تہذیب و تمدن کے ارتقا میں اہم ترین کردار ادا کرتا ہے۔ اس عضو کی بناوٹ اور اس کے پیچیدہ نظام پر غور کیجئے۔ آپ کو آنکھ میں ایک بیرونی پردہ نظر آتا ہے جس کا کچھ حصہ سفید اور کچھ سیاہ ہے۔ اس سیاہ گولائی نما حصے کے درمیان ایک چھوٹا سا نقطہ ہوتا ہے جسے ہم اپنی زبان میں تل کہتے ہیں۔ دیکھنے میں یہ تل ٹھوس معلوم ہوتا ہے لیکن درحقیقت یہ اندر سے خالی ہوتا ہے یعنی اس تل میں ایک باریک سوراخ ہوتا ہے جس سے روشنی یا اشیاء اور مناظر کی تصویر آنکھ کے اندر داخل ہوتی ہے۔ آنکھ کے اس سامنے والے پردے اور تل کے پیچھے ایک شیشہ (Lens) نصب ہوتا ہے۔ اس شیشے کے پیچھے ایک پردہ ہے جو ٹائپ کے باریک کاغذ سے بھی کہیں زیادہ باریک ہوتا ہے جسے ریٹینا (Retina) کہتے ہیں۔ جب ہم کسی چیز کو دیکھتے ہیں تو اس کی تصویر آنکھ کے تل کے سوراخ میں سے گزر کر اس شیشے (Lens) پر اتر آتی ہے جو ہماری آنکھ کے سامنے والے پردے کے پیچھے نصب ہے۔ یہ شیشہ (Lens) اس تصویر کو آنکھ کے آخری پردے ریٹینا (Retina) میں منعکس کر دیتا ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ اس پردے پر آنکھ میں لگے ہوئے شیشے سے جو تصویر اترتی ہے وہ اُلٹی ہوتی ہے یعنی پہلے اس کا نیگیٹو بنتا ہے۔ یہ پردہ کچھ رگوں کے ذریعے دماغ کے ساتھ منسلک ہے۔ دماغ کا یہ حصہ اس سے پوزیٹو تیار کرتا ہے یعنی اس تصویر کو سیدھا کر کے اس کی اصل شکل میں تبدیل کر دیتا ہے۔

جس پردے (Retina) پر یہ تصویر منعکس ہوتی ہے اس کے دس کے قریب حصے ہیں۔ ان میں سے ہر حصے کے ذمہ مختلف فرائض ہیں مثلاً ایک حصہ رنگوں کو اُن کی اصل شکل

میں محفوظ کر لیتا ہے، دوسرا کسی چیز کی موٹائی کو، تیسرا اس کی لمبائی کو، چوتھا چوڑائی کو، پانچواں متحرک اشیا اور جاندار چیزوں کی حرکات وسکنات کو، اسی طرح یہ تمام حصے ہمیں نظر آنے والی ہر چیز کی جملہ کیفیات کی تصویریں کھینچتے رہتے ہیں۔ عجیب بات یہ ہے کہ تصویر کے اس پردے کے جس حصے کے ذمہ جو کام ہے وہ اسی کو سرانجام دیتا ہے۔ سرخ رنگ ہمیں سرخ نظر آتا ہے، سبز رنگ ہمیں سبز نظر آتا ہے، ایک مجسم اور ٹھوس چیز ہمیں ٹھوس ہی نظر آتی ہے، ایک متحرک اور چلتی پھرتی چیز ہمیں حرکت کرتی نظر آتی ہے۔

آنکھ کے اس نظام میں ایک عجیب اور حیران کن بات اور بھی ہے کہ آنکھ کی پتلی روشنی کی کمی اور بیشی کے مطابق چھوٹی بڑی ہوتی یعنی سکڑتی اور پھیلتی رہتی ہے۔ اس میں حکمت یہ ہے کہ اگر روشنی تیز ہو اور آنکھ کی پتلی اس کے مطابق سکڑنے کا عمل نہ کرے تو آنکھ کے آخری پردے ریٹینا (Retina) پر اشیا کی تصویر منتقل نہیں ہو سکے گی۔ جب روشنی کم ہو تو پتلی پھیل جاتی ہے۔ اس میں حکمت یہ ہے کہ پتلی کے پھیلنے سے دیکھنے کی قوت بڑھ جاتی ہے اور کم روشنی میں بھی ہم اشیاء کو دیکھ سکتے ہیں۔ اگر کم روشنی میں پتلی پھیلنے کا عمل نہ کرے تو ہم اشیا کو نہیں دیکھ سکتے۔

آنکھ میں بے شمار باریک در باریک رگیں ہیں جن میں ہر وقت خون رواں دواں رہتا ہے۔ اس خون سے آنکھ میں زندگی اور توانائی قائم رہتی ہے مگر آنکھ کے سامنے والے پردے کے پیچھے جو شیشہ (Lens) ہے اسے خون کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ اگر خون اس شیشے پر پھیل جائے تو آنکھ بینائی سے محروم ہو جائے۔ اس شیشے (Lens) کو صاف وشفاف رکھنے کے لئے ایک خاص انتظام کیا گیا ہے۔ اس مقصد کے لئے خون میں سے ایک خاص قسم کا پانی تیار کیا جاتا ہے اور آنکھ کے مخصوص حصوں میں اس کا ذخیرہ ہوتا رہتا ہے۔ پھر آنکھ میں بہت سی باریک جھلیاں یا جالیاں بنا دی گئی ہیں جن سے پانی چھن کر آنکھ کے شیشے (Lens) کو صاف کرتا رہتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ پانی آنکھ کے اندرونی پردوں اور شیشے کو خوراک بھی مہیا کرتا ہے اس طرح ہماری آنکھ بڑی خوش اسلوبی سے اپنا فریضہ سرانجام دیتی ہے۔

سب سے عجیب بلکہ عجیب تر بات یہ ہے کہ ہمیں دو آنکھیں عطا کی گئی ہیں اور دونوں آنکھوں کے پیچھے دو الگ الگ پردے (Retina) موجود ہیں۔ بظاہر ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ جب ہماری دو آنکھیں ایک چیز کو دیکھتیں تو اس کی دو تصویریں ہماری آنکھ کے اندرونی دونوں پردوں (Retina) پر منعکس ہو جاتیں مگر اس طرح ہمیں ایک کی بجائے دو آدمی نظر آتے۔ اندازہ کیجئے کہ اس سے کتنی قباحتیں پیدا ہوتیں مگر ایک عجیب و غریب انتظام کے ذریعے اس قباحت کو دور کر دیا گیا۔ چنانچہ جب ہماری یہ دو آنکھیں کسی چیز کو دیکھتی ہیں اور ان دونوں کے پیچھے لگے ہوئے پردوں پر ایک ہی چیز کی دو الگ الگ تصویریں منعکس ہوتی ہیں تو عکس قبول کرنے والے پردے کے پیچھے ان دونوں آنکھوں کی رگیں ایک دوسرے کو کراس کرتی ہیں اور اس طرح دو آنکھوں سے نظر آنے والی دو تصویریں ایک تصویر میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ یوں جب ہم ایک شخص کو دیکھتے ہیں تو وہ ہمیں ایک ہی نظر آتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ جب ہم دس، بیس یا چالیس آدمی دیکھتے ہیں تو ہماری آنکھ کا کیمرہ ان کی تصویریں کھینچ کر جب دماغ تک پہنچاتا ہے تو ہمیں اتنے ہی اشخاص نظر آتے ہیں۔ اگر قدرت اس نظام کو اس طرح ترتیب نہ دیتی تو اندازہ فرمائیے کہ ہم کس مشکل سے دوچار ہو جاتے۔

ہماری آنکھیں ہمارے جسم کے سب سے بلند اور اس کے سامنے کے حصے میں واقع ہیں۔ آنکھوں کے اس محلِ وقوع کی بدولت ہم اپنی زندگی سے متعلق سارے فرائض بڑی خوش اسلوبی سے سرانجام دیتے ہیں۔ ہماری آنکھوں کی پتلیاں سر کو جنبش دیئے بغیر بڑی آسانی سے دائیں اور بائیں طرف پھر کر دونوں سمتوں کی چیزوں کو دیکھ سکتی ہیں۔ اگر ہماری آنکھیں جسم کے موجودہ حصے کی بجائے کہیں اور واقع ہوتیں تو سوچئے کہ ہم اپنا وظیفۂ زندگی کس طرح سرانجام دیتے۔ اگر یہ آنکھیں پیشانی کے نیچے ہونے کی بجائے سر کے اوپر عین وسط میں واقع ہوتیں تو غور کیجئے کہ ہمارا انجام کیا ہوتا۔ آخر وہ کون ہے جس نے آنکھوں کے لئے موجودہ محلِ وقوع تجویز کیا؟ (۴)

اب آپ آنکھ کے اس باریک در باریک اور حیرت ناک نظام پر غور کیجئے۔ آپ

کا دل خود بخود گواہی دے گا کہ ایک حیرت انگیز اور نا قابل بیان عقل و دانش اس سارے نظام کی تخلیق میں کارفرما ہے اور یہ خدا کے سوائے اور کون ہو سکتا ہے؟ کیا اندھا مادہ اس پیچیدہ اور حیرت انگیز نظام کے پرزوں کو تخلیق کر کے انہیں خود بخود اس سلیقے اور دانشمندی سے ترتیب دے سکتا ہے؟

اب آپ انسانی جسم کی اس مختصر ترین روداد پر غور کیجئے جو ابھی بیان کی گئی ہے۔ اس کے باریک در باریک اور پیچیدہ نظام پر تفکر کیجئے اور اس عقل و دانش کا تصور کیجئے جو اُس کی ترتیب اور نظام کار میں کارفرما نظر آتی ہے اور یہ فیصلہ اپنے دماغ اور ضمیر پر چھوڑ دیجئے کہ وہ اس عجیب و غریب اور حیرت انگیز نظام کا کوئی خالق تجویز کرتا ہے یا نہیں؟

خدا کے وجود پر انبیا کی شہادت

دنیا میں بے شمار معاملات کا فیصلہ شہادت (گواہی) کی بنا پر ہوتا ہے اور یہ ایک ایسا مسلمہ اصول ہے جس کی صحت، معقولیت اور صداقت سے کوئی ذی فہم انکار نہیں کر سکتا۔ ہم تاریخ کے بے شمار واقعات پر صرف شہادت کی بنا پر یقین کر لیتے ہیں حالانکہ ہم خود ان کے عینی شاہد نہیں ہوتے۔ اللہ تعالیٰ کی ہستی اور اس کے وجود پر بحث و گفتگو کرتے ہوئے بھی ہمیں اس اصول سے کام لینا ہوگا۔

آج تک دنیا میں لاکھوں انبیا اور بزرگان دین پیدا ہوئے۔ ان سب نے بآواز بلند اعلان کیا کہ ''اس کائنات کا ایک خالق و مالک ہے اور وہ اپنی عبادت کرنے کا حکم دیتا ہے، یہ خالق و مالک ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا''۔ اگر دو ثقہ گواہوں کی گواہی سے ایک دعویٰ قطعی صداقت کا درجہ حاصل کر لیتا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ ان لاکھوں انبیا اور مذہبی راہنماؤں کی شہادت کو رد کر دیا جائے جبکہ ان میں سے کسی ایک شخصیت کے کردار کے بارے میں آج تک اس کے کسی بدترین مخالف نے بھی حرف گیری نہ کی۔ روئے زمین پر پیدا ہونے والے جتنے لوگوں نے اپنے آپ کو خدا کا نبی کہا انہیں دیوانہ ضرور قرار دیا گیا، ساحر یا جادوگر ضرور ٹھہرایا گیا، مجذوب اور وہمی ضرور کہا گیا، آسیب زدہ ضرور بتایا گیا لیکن

ان کے اس دعوے سے قبل کسی ایک شخص نے بھی یہ نہیں کہا کہ یہ کاذب یا بدکردار شخص ہے بلکہ تاریخ شہادت دیتی ہے کہ جب تک ان مقدس ہستیوں نے اپنی نبوت کا اعلان نہیں کیا اس وقت تک ان کی قوم کے لوگ انہیں نیک نفس، پرہیزگار، صادق اور امین قرار دیتے رہے۔ اگر دعویٰ نبوت سے قبل ان مقدس شخصیتوں کا دامن اخلاقی عیوب سے آلودہ ہوتا، اگر نعوذ باللہ یہ جھوٹے، دھوکے باز، جعل ساز اور بدکردار ہوتے تو مخالفت کے اس طوفان میں غریب و نادار اور ہر طرف سے ٹھکرائے ہوئے لوگ کبھی ان کا ساتھ نہ دیتے۔ انہوں نے ان مقدس انبیا کا ساتھ اسی لئے دیا کہ ان کی زندگی انہیں بے عیب نظر آئی۔ انہوں نے بجا طور پر سوچا کہ جس شخص نے اپنی نجی زندگی میں کبھی جھوٹ نہیں بولا اور مکر و فریب سے کام نہیں لیا وہ خدا کے بارے میں ایسا فریب کیسے کر سکتا ہے۔ اس مقام پر پہنچ کر آج بھی ہر ذی فہم اور منصف مزاج شخص یہی نتیجہ نکالتا ہے کہ جس شخص نے نبوت کا دعویٰ کرنے سے قبل کسی پر ظلم نہیں کیا کسی کا حق نہیں مارا، حرام نہیں کھایا، کسی عورت کی طرف نگاہ اٹھا کر نہیں دیکھا، کبھی جھوٹ نہیں بولا وہ اچانک اتنا بڑا جھوٹ کیسے بول سکتا تھا کہ ایک شے کا سرے سے وجود ہی نہ ہو اور وہ اس کے وجود کا اس یقین سے اعلان کرے کہ گویا وہ اپنی آنکھوں سے اسے دیکھ رہا ہے۔ عقل انسانی اسے ہرگز تسلیم نہیں کر سکتی کہ ایک پاک باز، صاحب کردار اور راستباز شخص رات کی رات میں اپنی تمام اخلاقی اور انسانی صفات کھو بیٹھا اور صریح کذب بیانی پر اتر آیا جبکہ اس کذب بیانی اور دروغ گوئی میں اس کا کوئی ذاتی فائدہ بھی نہ تھا بلکہ اس کے نتیجے میں مصائب و آلام صف باندھے اس کے سامنے کھڑے تھے۔

ادیانِ عالم کی تاریخ کا ہر صفحہ ہمارے سامنے کھلا ہوا ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ جن بزرگ شخصیتوں نے خدا کے وجود اور اس کی حقانیت کا اعلان کیا اور اپنے آپ کو اس ذات اقدس سے منسوب کیا انہیں طرح طرح کی ایذائیں دی گئیں، وطن سے بے وطن کیا گیا، ان کا سماجی مقاطعہ کیا گیا، ان کے خلاف قتل و بغاوت کے جھوٹے مقدمات بنائے گئے حتیٰ کہ ان میں سے بعض کو قتل تک کر دیا گیا۔ انہوں نے یہ سب کچھ گوارا کر لیا مگر یہ گوارا نہ کیا کہ اس ہستی کے وجود کا انکار کر دیں جس نے انہیں اپنے بندوں کی طرف مبعوث کیا تھا۔ اگر

انہیں خدا کی ہستی کا یقین کامل نہ ہوتا اور خدا ان سے ہم کلام نہ ہوتا تو وہ اس کی محبت سے سرشار ہو کر ہرگز ایسے سخت مصائب و آلام برداشت نہ کرتے۔ اگر انہوں نے ایک غلط دعویٰ کیا ہوتا، اگر انہوں نے دنیا کو بھی فریب دینے کی کوشش کی ہوتی اور اپنے نفس کو بھی تو وہ اس غلط دعوے پر اتنی طویل مدت تک اس قدر سختی اور استقامت سے ہرگز قائم نہیں رہ سکتے تھے کیونکہ جھوٹ اور فریب کبھی استقامت پیدا نہیں کرتے بلکہ بزدلی پیدا کرتے ہیں۔ اپنے دعوے، اپنے مقصد اور اپنے موقف کے لئے ہوش ربا مصائب و آلام برداشت کرنا اور آخر وقت تک ثابت قدم رہنا حتیٰ کہ اس راہ میں جان تک قربان کر دینا بڑی جرأت، شجاعت اور پامردی و استقلال کا کام ہے۔ یہ شجاعت و جرأت انہی لوگوں میں پیدا ہوتی ہے جنہیں اپنے دعوے اور موقف کی صداقت کا اس طرح یقین ہو جیسے دوپہر کو چمکتے ہوئے سورج کا۔ کاذبوں اور افترا پردازوں کو جو مادی قوت کے بل پر ذلیل اور پست مقاصد کے لئے جدوجہد کرتے ہیں یہ جرأت اور بے خوفی ہرگز نصیب نہیں ہو سکتی۔ ان میں سے بعض اگر جھوٹی انا پر قائم رہنے کی کوشش کرتے بھی ہیں تو اس کے پیچھے مادی طاقتیں اور امداد کی یقین دہانیاں ہوتی ہیں جبکہ خدا کی ہستی کا اعلان کرنے والے مقدس انبیا مادی وسائل سے کلیتہً محروم ہوتے ہیں۔

خداوند تعالیٰ کے وجود کے بارے میں انبیا کی شہادت پر غور کرتے ہوئے ایک نکتہ خاص طور پر قابل توجہ ہے۔ حضرت آدمؑ سے لے کر نبی آخرالزمان حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپؐ کے پاک باز تبعین تک ہزاروں سال کا فصل ہے اور یہ انبیاء و مصلحین دُنیا کے مختلف علاقوں اور مختلف زمانوں میں مبعوث ہوئے مگر اس کے باوجود ان سب کی بنیادی تعلیم ایک ہی ہے کہ اس کائنات کا صرف ایک خالق و مالک ہے جس کی ذات و صفات میں کوئی شریک نہیں۔ اس کی عبادت کرو، والدین کی اطاعت کرو، جھوٹ نہ بولو، کسی پر ظلم نہ کرو، حرام نہ کھاؤ، کسی کی عزت و آبرو پر حملہ نہ کرو۔ آخر اتنی طویل مدت میں لاکھوں مقدس انسانوں کا جو دنیا کے مختلف علاقوں اور مختلف زمانوں میں پیدا ہوئے ایک ہی سی تعلیم دینا کیسے ممکن ہے جب تک کہ انہیں تعلیم دینے والا بھی ایک ہی نہ ہو۔ اگر خدا موجود

نہیں ہے اور اس نے ان انبیا اور مصلحین کو مبعوث نہیں کیا تو پھر ہزاروں سال کے فصل زمانی ومکانی کے باوجود ان کی تعلیم بنیادی طور پر یکساں کیوں ہے۔ اگر خدا موجود نہ ہوتا اور ان انبیاء کو اس نے مبعوث نہ کیا ہوتا بلکہ خدا کا تصور ان کی اپنی ذہنی اختراع ہوتی اور اس کی بنیاد دروغ گوئی پر ہوتی تو ان کی تعلیم میں یہ یکسانیت کبھی نہ ہوتی بلکہ وہ مختلف اور متضاد خیالات کا مجموعہ ہوتی' ایک مشرق کی کہتا دوسرا مغرب کی۔

اس سلسلے میں ایک اور نکتہ بھی یاد رکھنے کے لائق ہے اور عقل انسانی کو دعوت فکر دیتا ہے۔ دنیا میں دو قسم کے مدعی پیدا ہوئے ہیں ایک وہ جنہوں نے خدا کی ہستی کا اعلان کیا اور اپنے آپ کو اس کا فرستادہ قرار دیا۔ دوسرے وہ فلسفی اور مفکرین جنہوں نے خدا کی ہستی کا انکار کیا۔ ان دونوں قسم کے مدعیوں کا کردار اس مسئلے کے تصفیے کے لیے سب سے بڑی کسوٹی ہے۔ انبیا اور مذہبی مصلحین کی زندگی کا ایک ایک واقعہ صحائف آسمانی اور تاریخ و سیرت کی کتابوں میں محفوظ ہے اور اس کے مطالعے سے ثابت ہوتا ہے کہ ان مقدس نفوس نے بے داغ زندگی گزاری اور دنیا کے لئے اخلاق وکردار کی ایسی مشعلیں روشن کر گئے جن کی روشنی قیامت تک ہماری راہنمائی کرتی رہے گی۔ دوسری طرف خدا تعالیٰ کی ہستی کا انکار کرنے والے مفکرین ہیں کہ ان میں سے کوئی ایک شخص بھی ایسا پیش نہیں کیا جا سکتا جس نے شروع سے لے کر آخر تک پاکیزہ زندگی گزاری ہو' جس نے زندگی میں کبھی جھوٹ نہ بولا ہو' فریب نہ کیا ہو جس کے خیالات وافکار میں انتشار نہ ہو جبکہ خود ان کی تحریروں سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ لوگ اخلاقی صفات سے عاری تھے۔ ان کے افکار اصلاح نفس کا کوئی اعلیٰ اصول پیش نہیں کرتے بلکہ سرے سے اخلاقی اقدار ہی کا انکار کرتے ہیں حتیٰ کہ ماں اور بیٹے' باپ اور بیٹی اور بھائی بہن میں جنسی تعلق پیدا کرنے کو معیوب نہیں سمجھتے بلکہ اس کی وکالت کرتے ہیں اس طرح شہوت کے معاملے میں مرد وعورت کو آزاد چھوڑ دیتے ہیں کہ جدھر چاہیں منہ مارتے پھریں۔

ان دونوں قسم کے مدعیوں کے کردار کا یہ فرق ہمیں اس نتیجے پر پہنچاتا ہے کہ خدا کی ہستی کا اعلان کرنے والے یہ مقدس لوگ یقیناً خدا کی طرف سے تھے کیونکہ ایک طرف

پراگندہ افکار اور پست کردار کے کچھ لوگ ہیں جو خدا کی ہستی کا انکار کرتے ہیں اور دوسری طرف وہ لاکھوں راست باز ہیں جو کسی ایک زمانے اور ایک ملک میں پیدا نہیں ہوئے کہ انہوں نے کسی جگہ بیٹھ کر ایک منصوبہ بنایا ہو اور پھر ایک نظریہ گھڑ کر اس کی تعلیم و تلقین کے لئے روئے زمین کے مختلف حصوں میں پھیل گئے ہوں بلکہ یہ مقدس لوگ دنیا کے مختلف علاقوں اور مختلف زمانوں میں پیدا ہوئے جو مختلف زبانیں بولتے تھے۔ انہوں نے اپنے اعلیٰ اخلاق، پاکیزہ زندگی اور مقدس تعلیم کے ذریعے خدائے واحد کے وجود کو تسلیم کرایا۔ عقلِ سلیم خود فیصلہ کرتی ہے کہ ان میں سے کس کی شہادت معقول اور وزنی ہے۔

ان مصلحین اور انبیا کی شہادت کا ایک اور پہلو نہایت روشن اور مضبوط ہے وہ یہ کہ ان میں سے بعض نبی اور مصلح خداوند تعالیٰ کی طرف دعوت دینے سے قبل مالی اور دنیوی وجاہت کے لحاظ سے بڑے اونچے مرتبے پر فائز تھے۔ مثال کے طور پر قدیم ہندوستان کا مشہور مصلح اور بزرگ گوتم بدھ ریاست کپل وستو کا ولی عہد تھا، اپنے باپ کی وفات کے بعد اسے بادشاہ بننا تھا، حکومت و اقتدار کی لذتوں سے لطف اندوز ہونا تھا، اس کی بیوی ''گوپا'' اپنے زمانے کی حسین ترین شہزادی تھی اور خدا نے اسے ایک خوبصورت بیٹا بھی دیا تھا۔ گویا اس کے پاس دولت بھی تھی، حکومت بھی تھی، شہرت بھی تھی، حسین و جمیل بیوی بھی تھی اور اس سے اولادِ نرینہ بھی موجود تھی، اسے کس چیز کی ضرورت تھی؟ مگر وہ ان تمام آسائشوں اور دنیاوی نعمتوں کو پائے حقارت سے ٹھکرا کر خدا کی تلاش میں شاہی محل سے نکل کھڑا ہوا اور جب اسے خدا کا عرفان حاصل ہو گیا اور اپنی ریاست میں واپس آیا تو رعایا اور اعیانِ سلطنت کے اصرار کے باوجود اس نے تختِ حکومت پر بیٹھنے اور تاجِ شاہی سر پر رکھنے سے انکار کر دیا بلکہ اپنی باقی زندگی بندگانِ خدا کو خدا کا پیغام پہنچانے میں صرف کر دی۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ایک ہستی موجود ہے، جس کا حقیقی عرفان حاصل ہونے کے بعد انسان ایک نیا وجود اختیار کر لیتا ہے اور اس کی محبت میں ایسا گم ہو جاتا ہے کہ بڑی سے بڑی قربانی دے کر بھی اس سے بڑی قربانی دینے کے لئے بے چین رہتا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد آزر جو ابتدا میں بت ساز تھے ترقی کر کے

بادشاہِ وقت نمرود کے دربار کے معزز سردار ہو گئے تھے' عراق کے دارالسلطنت ''اُر'' کے سب سے بڑے مندر کے پروہت اور مذہبی پیشوا تھے۔ حضرت ابراہیمؑ کے لئے کون سی چیز کی کمی تھی؟ دنیا کی تمام نعمتیں انہیں میسر تھیں مگر آپؑ نے ان تمام نعمتوں پر لات ماردی اور خدائے واحد کا پیغام پہنچانے کو اپنا نصب العین بنالیا۔ اس راستے میں آپؑ نے وہ اذیتیں برداشت کیں اور قربانیاں دیں کہ انبیا کی تاریخ ان کی نظیر کم ہی پیش کر سکے گی۔ اگر خدا موجود نہیں تو حضرت ابراہیمؑ کو کس ہستی نے مخاطب کیا جس کی محبت میں آپؑ نے آگ میں گرایا جانا گوارا کرلیا مگر اس کے وجود سے انکار کرنا گوارا نہیں کیا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کے محل میں پرورش پائی' فرعون اور اس کی بیٹی آپؑ پر نہایت مہربان تھے۔ چنانچہ ''کتابِ مقدس'' میں لکھا ہے کہ جب حضرت موسیٰؑ پیدا ہوئے تو آپؑ کی والدہ نے تین ماہ تک آپؑ کو چھپائے رکھا مگر جب مزید چھپائے رکھنا ممکن نہ رہا تو فرعون کے ڈر سے جو بنو اسرائیل کے نوزائیدہ بیٹوں کو قتل کروا رہا تھا آپ نے حضرت موسیٰؑ کو سرکنڈوں کے ایک ٹوکرے میں رکھا اور دریا میں بہا دیا۔ اپنی بیٹی کو دریا کے ساتھ ساتھ چلنے کی ہدایت کردی تاکہ وہ دیکھتی رہے کہ اس بچے کے ساتھ کیا ماجرا گزرتا ہے۔ اس کے بعد بائیبل کا بیان ہے کہ :

''اور فرعون کی بیٹی دریا پر غسل کرنے آئی اور اس کی سہیلیاں دریا کے کنارے کنارے ٹہلنے لگیں۔ تب اُس نے جھاؤ میں وہ ٹوکرا دیکھ کر اپنی سہیلی کو بھیجا کہ اسے اٹھالائے۔ جب اس نے کھولا تو لڑکے کو دیکھا اور وہ بچہ رو رہا تھا۔ اسے اس پر رحم آیا اور کہنے لگی یہ کسی عبرانی کا بچہ ہے۔ تب اس (حضرت موسیٰؑ) کی بہن نے فرعون کی بیٹی سے کہا کہ میں جا کر عبرانی عورتوں میں سے ایک دائی تیرے لئے بلالاؤں جو تیرے لئے اس بچے کو دودھ پلایا کرے۔ فرعون کی بیٹی نے کہا جا۔ وہ لڑکی (یعنی حضرت موسیٰؑ کی بہن جو ٹوکرے کے ساتھ ساتھ چلتی ہوئی اس مقام پر آ گئی تھی) جا کر اس بچے کی ماں کو بلا لائی۔ فرعون کی بیٹی نے اسے کہا کہ تو اس بچے کو لے جا کر میرے لیے دودھ پلا۔ میں تجھے تیری اجرت دیا کروں گی۔ وہ عورت اس بچے کو لے

جا کر دودھ پلانے لگی۔ جب بچہ کچھ بڑا ہوا تو وہ اسے فرعون کی بیٹی کے پاس لے گئی اور وہ اس کا بیٹا ٹھہرا اور اس نے اس کا نام موسیٰ یہ کہہ کر رکھا کہ میں نے اسے پانی سے نکالا"۔ (عہد نامہ قدیم۔ باب خروج)

بائبل کی ان تصریحات سے ثابت ہوتا ہے کہ فرعون کے محل میں حضرت موسیٰؑ کی پرورش کسی ملازم یا غلام بچے کی طرح نہیں ہوئی بلکہ فرعون کی بیٹی نے آپؑ کو اپنا بیٹا بنالیا تھا اور آپؑ کا نام بھی اسی شہزادی نے تجویز کیا تھا۔ گویا حضرت موسیٰ علیہ السلام اب بادشاہِ مصر کے شہزادے تھے۔ آپؑ کی پرورش بڑے ناز و نعمت میں ہوئی۔ دنیا کی ساری نعمتیں آپؑ کو میسر تھیں مگر آپؑ نے ان ساری نعمتوں کو ٹھکرا کر اپنے لئے وہ وادیٔ خارزار منتخب کی جو قدم قدم پر لہو مانگتی تھی۔ اگر اس کائنات کا خالق موجود نہیں تو حضرت موسیٰؑ کو کس نے فرعون کے بھرے دربار میں جا کر اس طاقت ور اور جابر بادشاہ کے سامنے ہستیٔ باری تعالیٰ کے وجود کا اعلان کرنے کی تحریک کی اور اس اعلان کی آپؑ کو بڑی گراں قیمت ادا کرنی پڑی۔

آخر میں ختم المرسلین حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جب مکہ کے سرداروں کو بے جان بتوں کی پرستش کرنے کی بجائے خدائے واحد کی عبادت کرنے کی دعوت دی اور سرداران قریش نے دیکھا کہ حضورؐ اپنے مقدس مشن سے کسی طرح دست بردار ہونے کو تیار نہیں تو انہوں نے اکابر قریش کا ایک وفد مرتب کیا اور مکہ کے مشہور مدبر اور ذی اثر سردار عُتبہ کو اس وفد کا قائد منتخب کیا۔ یہ وفد حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سب سے پہلے اور سب سے مستند سیرت نگار علامہ ابن اسحاق نے اپنی کتاب سیرت میں اس وفد کی گفتگو نقل کرتے ہوئے لکھا ہے کہ عتبہ نے حضورؐ اقدس کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ:

"اے میرے بھتیجے! تمہیں ہمارے خاندان میں جو عزت حاصل ہے اسے تم جانتے ہو، تمہیں یہ بھی معلوم ہے کہ تم کس اعلیٰ حسب نسب کے مالک ہو لیکن (اس کے باوجود) تم نے اپنی قوم کو سخت مصیبت میں مبتلا کر دیا

ہے۔تم نے ان کی جماعت میں تفرقہ ڈال دیا ہے۔ان کے اہل دانش کو
بیوقوف کہتے ہو'ان کے بتوں کی مذمت کرتے ہو'ان کے فوت شدہ باپوں
کو جھٹلاتے ہو۔اب میں تم سے چند باتیں کہنا چاہتا ہوں انہیں سن لو اور
ان پر غور کرو'شائد یہ باتیں تمہاری سمجھ میں آ جائیں''۔

حضورؐ عتبہ کی یہ تقریر بڑے تحمل اور اطمینان سے سنتے رہے۔جب وہ اپنی بات ختم کر چکا تو آپؐ نے فرمایا کہ تم جو کچھ کہنا چاہتے ہو کہو میں غور سے سنوں گا۔اس پر عتبہ نے حضورؐ کو مخاطب کرتے ہوئے مندرجہ ذیل امور کی پیش کش کی۔

''اگر تمہارا مقصد اس امر (خدائے واحد کی طرف دعوت دینے) سے
دولت جمع کرنا ہے تو ہم تمہارے لئے اتنی دولت فراہم کر دیں گے کہ تم
مکہ کے امیر ترین شخص ہو جاؤ گے۔اگر تم اس طرح قوم کی سرداری حاصل
کرنا چاہتے ہو تو ہم تمہیں اپنا سردار بنانے کو تیار ہیں اور ہم تمہارے
مشورے کے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھایا کریں گے۔اگر تمہیں بادشاہت کی
تمنا ہے تو ہم تمہیں اپنا بادشاہ بنالیں گے''۔(ابن اسحاق۔بحوالہ سیرت
ابن ہشام)

یہ پیش کش اس ہستیؐ کو کی جارہی تھی جو مکہ کی بے یارومددگار شخصیت تھی جس کے پاس نہ دولت تھی' نہ سرداری تھی' نہ بادشاہت تھی' پیش کش کرنے والے وہ لوگ تھے جو نہ صرف مکہ میں بلکہ عرب کے بہت بڑے حصے میں اپنے اثرورسوخ کی وجہ سے حددرجہ قابل عزت تھے۔اگر حضورؐ اقدس نے (نعوذ باللہ) شہرت وعزت یا دولت وحکومت حاصل کرنے کا کوئی منصوبہ بنایا ہوتا تو آپؐ سرداران مکہ کی یہ پیش کش قبول فرمالیتے اور ہوش ربا مصائب وآلام اٹھائے بغیر آپؐ کو بادشاہت مل جاتی کیونکہ اس وقت جب آپؐ کسمپرسی کی زندگی گزار رہے تھے کون کہہ سکتا تھا کہ ایک روز سارا عرب آپؐ کے قدموں میں ہوگا' مگر آپؐ نے انتہائی نامساعد حالات کے باوجود یہ پیش کش پائے حقارت سے ٹھکرادی اور صاف آواز میں اعلان کر دیا کہ ''مجھے ان میں سے کسی چیز کی ضرورت نہیں۔مجھے تو خدا نے

اپنا نبی بنا کر بھیجا ہے اور مجھ پر ایک کتاب اُتاری ہے میں نے اپنے اللہ کا پیغام تمہیں پہنچا دیا ہے"۔

اگر خدا موجود نہیں ہے تو اس پیش کش کو حضورؐ کی نظر میں کس نے حقیر اور بے حقیقت بنا دیا جسے قبول کرنے کے بعد آپؐ بغیر کسی مشقت اور تکلیف کے بادشاہ بن سکتے تھے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ایک ایسی ہستی موجود ہے جو اپنے مقدس بندوں سے کلام کرتی ہے اور انہیں منصب نبوت پر سرفراز فرماتی ہے اور یہ مقدس وجود خدا کی محبت میں اس قدر سرشار ہو جاتے ہیں کہ اگر انہیں بڑے سے بڑا منصب بھی پیش کیا جائے تو وہ اسے پائے حقارت سے ٹھکرا کر ہر قسم کے مصائب و آلام برداشت کرتے ہیں مگر اپنے خدا سے رشتۂ محبت توڑنا کسی قیمت پر گوارا نہیں کرتے۔

پس ان پاکیزہ نفس اور راستباز ہستیوں کی شہادت اور ان کا کردار ہمیں دعوت فکر دیتا ہے کہ ہم خدائے قدوس پر ایمان لائیں کیونکہ نیک نفس اور پاکیزہ کردار لوگوں کی اتنی بڑی تعداد نہ جھوٹ بول سکتی ہے اور نہ اس جھوٹ پر اتنی طویل مدت تک قائم رہ سکتی ہے اور نہ وہم میں مبتلا ہو سکتی ہے کیونکہ وہم اور شک انسان میں کبھی یقین کامل پیدا نہیں کرتے بلکہ اسے ہمیشہ مذبذب رکھتے ہیں جبکہ ہم دیکھتے ہیں کہ خدا کے نبی اور مذہبی مصلح یقینِ کامل کے پیکر اور ثبات و استقلال کے کوہِ گراں ہوتے ہیں۔

خدا کے وجود کی قرآنی شہادت

جس آسمانی کتاب نے دنیا میں سب سے عظیم الشان اور ابدی انقلاب برپا کیا وہ قرآن حکیم ہے۔ یہ وہ مقدس اور آخری صحیفۂ آسمانی ہے جس نے ہماری مادی و روحانی دونوں ضرورتوں کے لئے ضابطے اور قوانین مرتب کئے اور انسانی زندگی کا کوئی گوشہ تشنہ اور نامکمل نہیں چھوڑا۔ قرآن حکیم نے اللہ تعالیٰ کے وجود پر سب سے ٹھوس اور مستحکم دلائل پیش کئے جنہیں دنیا کے سارے فلسفی اور مفکر مل کر بھی نہیں توڑ سکتے۔ یہ مقدس کتاب ایک ایسی ہستی پر نازل ہوئی جو لکھنا پڑھنا نہیں جانتی تھی۔ اس نے ایسے معاشرے میں آنکھ کھولی اور

زندگی گزاری جہاں علم کی روشنی بلکہ اس کی معمولی سی کرن کا بھی وجود نہ تھا۔ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آج سے چودہ سو سال قبل جن صداقتوں کا اعلان فرمایا آج ساری دنیا ان کی تصدیق کر رہی ہے یہ اس امر کا ثبوت ہے کہ ایک ایسی ہستی موجود ہے جس نے حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ان امور پر مطلع فرمادیا تھا جو سیکڑوں سال کے بعد ظاہر ہونے والے تھے اور اس وقت کسی کے وہم و گمان میں نہ آ سکتے تھے۔

ایٹم بم سے متعلق پیش گوئی

مثلاً آج انسان خوفناک تباہی کے کنارے پہنچ چکا ہے' دنیا کی بڑی طاقتوں نے ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم بنالیئے ہیں' بے شمار مصنوعی سیارے ایٹمی اسلحہ سے لیس ہر وقت فضا میں گردش کر رہے ہیں اور خطرہ ہے کہ کسی وقت بھی آسمان سے آگ اور دھوئیں کی اس طرح بارش شروع ہو جائے کہ روئے زمین پر ہر طرف موت ہی موت نظر آنے لگے لیکن قرآنِ حکیم آج سے چودہ سو سال قبل انکشاف کر چکا ہے کہ:

فارتقب یوم تاتی السماء بدخان مبین o یغشی الناس ط هذا عذاب الیم o (سورہ الدخان آیت نمبر ۱۰' ۱۱)

''سو اس دن کا انتظار کرو کہ آسمان سے ایک نظر آنے والا دھواں ظاہر ہوگا جو لوگوں پر پھیل جائے گا۔ یہ ایک دردناک عذاب ہے''۔

اگر اللہ تعالیٰ موجود نہیں ہے تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو چودہ سو سال قبل کس نے بتایا کہ ایک دن ایسا آئے گا جب آسمان سے ایک دھواں ظاہر ہوگا اور یہ ایسا دھواں ہوگا کہ زمین پر بسنے والوں کو اپنی لپیٹ میں لے لے گا۔ یہ کہر وغیرہ کی قسم کا دھواں نہیں ہوگا بلکہ عذاب الیم کی صورت میں ظاہر ہوگا یعنی جس کے ظاہر ہونے پر انسانی زندگیاں ہلاکت کا شکار ہونے لگیں گی۔ یہ دھواں ایٹم اور ہائیڈروجن بم کے دھوئیں کے سوائے اور کون سا دھواں ہو سکتا ہے؟ جن لوگوں کے ذہن میں یہ وسوسہ پیدا ہو کہ یہ اشارہ عذاب قیامت کی طرف ہے' اللہ تعالیٰ نے ان کی اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لئے

سورت میں وضاحت فرمادی کہ لوگ اس دھوئیں کو دیکھ کر اللہ تعالیٰ سے التجا کریں گے کہ اے رب کریم اس عذاب کو ہم سے دور کر دیجئے ہم ضرور ایمان لے آئیں گے۔ (آیت نمبر ۱۲) اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ "ہم کچھ مدت کے لئے انہیں اس عذاب سے نجات دے دیں گے"۔ **انا کاشفوا العذاب قلیلا** (آیت نمبر ۱۵)۔ اس سے ثابت ہو گیا کہ یہ عذابِ قیامت کی طرف اشارہ نہیں ہے کیونکہ قیامت کا عذاب آنے کے بعد تو کسی کو ایک لمحے کے لئے بھی مہلت نہیں دی جائے گی۔ اس عذاب میں ایٹم بم اور ہائیڈروجن بموں کی طرف اشارا ہے جن کے گرنے کے بعد تباہی پھیل جائے گی لیکن یہ ایسی تباہی نہیں ہوگی کہ دنیا کے سارے انسان ہلاک ہو جائیں بلکہ جزوی تباہی آئے گی اور اللہ تعالیٰ انسانوں کو پھر ایک موقع اور مہلت عطا فرمائے گا کہ وہ اپنے اعمال کی اصلاح کر لیں۔ یہ مقام بڑے غور کا ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا عہد سائنس اور ٹیکنالوجی کا عہد نہیں تھا بلکہ انتہائی جہالت اور ظلمت کا عہد تھا۔ حضورؐ کو کس نے بتایا کہ ایک زمانہ آئے گا جب ایٹم پر ریسرچ کی جائے گی، ایٹم کو توڑا جائے گا اور اس سے اتنی طاقت پیدا ہوگی کہ بڑے خوفناک اور تباہ کن بم بنائے جائیں گے جن کے گرنے سے فضائے آسمانی سے لے کر زمین تک دھواں ہی دھواں چھا جائے گا۔ اس سے ثابت ہوا کہ ایک علیم وخبیر ہستی موجود ہے جس نے اپنے نبیٔ مکرم کو چودہ سو سال بعد پیش آنے والے ہلاکت خیز واقعے کی خبر دے دی تھی۔

انسان کے چاند پر پہنچنے کی پیش گوئی

پھر فرمایا کہ:۔

اقتربت الساعة وانشق القمر o (سورہ القمر آیت نمبر ۱) "وہ گھڑی نزدیک ہے جب چاند شق ہو جائے گا"۔

چاند کے شق ہونے کا جو معجزہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دکھایا تھا وہ مسلّم لیکن قرآن کریم کی خوبی اور اس کی بلاغت کا کمال یہ ہے کہ اس کے بطن میں کئی کئی معنے ہوتے ہیں اور قرآن حکیم کی ایک پیش گوئی بار بار پوری ہوتی ہے۔ اس آیت میں بھی اللہ

تعالیٰ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خبر دیتا ہے کہ ایک زمانہ آئے گا جب چاند کو پھاڑ دیا جائے گا، یعنی انسان علمی اور دماغی لحاظ سے اتنی ترقی کرے گا کہ وہ چاند پر جا پہنچے گا۔ اس طرح چاند کے پوشیدہ راز انسان پر ظاہر ہو جائیں گے۔ چنانچہ روس کے سائنس داں ایک خلائی جہاز چاند پر بھیج چکے ہیں جس میں ایسے ہل نما آلات نصب تھے جنہوں نے چاند کی سطح میں شگاف ڈال کر کئی سو فٹ لمبی اور کئی فٹ چوڑی ایک خندق کھودی۔ اس طرح چاند شق ہو گیا کیونکہ جب کسی چیز میں شگاف ڈال دیا جائے تو وہ پھٹ جاتی ہے پس قرآن حکیم کی یہ پیش گوئی کیسے عظیم الشان طریقے سے پوری ہوئی۔ اگر خدا موجود نہیں ہے تو آج سے چودہ سو سال پہلے حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کس نے بتایا تھا کہ ایک زمانہ ایسا آئے گا جب انسان چاند کو مسخر کرے گا اور اس میں شگاف ڈال کر اسے پھاڑ دے گا۔ اس مضمون کو اللہ تعالیٰ نے ایک اور مقام پر یوں بیان فرمایا کہ ''ہم نے سورج اور چاند کو تمہارے لئے قابل تسخیر بنا دیا ہے'' (سورہ النحل) یعنی تم میں ایسی صلاحیت رکھ دی ہے کہ تم سورج اور چاند سے اس طرح کام لو گے جس طرح حاکم اپنے محکوم سے خدمت لیتا ہے۔ چنانچہ آج سائنس داں سورج سے توانائی حاصل کر کے انسان کی بڑھتی ہوئی ایندھن کی ضروریات پوری کرنے کی کوشش میں مصروف ہیں اور اس میں بہت حد تک کامیاب بھی ہو چکے ہیں۔ اگر خدا موجود نہیں ہے تو عرب کے نبی اُمیؐ کو کس نے بتایا کہ ایک زمانہ آئے گا جب انسان سورج سے فوائد حاصل کرے گا کیونکہ سورج کو انسان کے لیے قابل تسخیر بنا دیا گیا ہے وہ اس پر غلبہ حاصل کر سکتا ہے۔

سمندروں کو ملانے کی پیش گوئی

آج سے چودہ سو سال پہلے کون کہہ سکتا تھا کہ بعض سمندروں کے درمیان خشکی کی جو خلیج حائل ہے اُسے دور کر کے دو سمندروں کو باہم ملا دیا جائے گا مگر قرآنِ حکیم نے اس کی پیش گوئی کر دی تھی چنانچہ فرمایا کہ:۔

مرج البحرین یلتقیٰن o بینھما برزخ لایبغیٰن o (سورہ الرحمٰن آیت نمبر۱۹، ۲۰)

(اللہ نے) ''دو سمندروں کو اس طرح جاری کیا ہے کہ ان دونوں کے درمیان روک ہے لیکن وہ ملا دیئے جائیں گے مگر اس وقت تک ایک دوسرے میں داخل نہیں ہو سکتے''۔

یہ پیش گوئی ہے ان دو نہروں کے متعلق جن کے ذریعے ترقی یافتہ انسان نے دو سمندروں کے درمیان خشکی کی خلیج کو کاٹ کر بحری راستہ بنا دیا یعنی ایک نہر سویز جس کے ذریعے بحیرۂ قلزم بحیرۂ احمر سے مل گیا اور دوسری نہر پاناما جس کے ذریعے بحر الکاہل، بحرِ اوقیانوس سے مل گیا اور بحری جہازوں کے ذریعے سفر مختصر ہو گیا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے صرف لفظ سمندر کہنے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ان کی نشاندہی بھی فرما دی کہ وہ کون سے سمندر ہیں۔ ان کی علامت یہ بیان فرمائی کہ:۔

یخرج منھما اللولؤ والمرجان o (سورہ الرحمٰن آیت نمبر۲۲)

''ان (سمندروں) میں سے تم موتی اور مونگے نکالتے ہو''۔

موتیوں کی تجارت کرنے والے بخوبی جانتے ہیں کہ یہی دونوں سمندر ہیں جہاں سے موتی اور مونگے کثیر تعداد میں نکلتے اور دنیا کی سب سے زیادہ ضرورت پوری کرتے ہیں۔ اگر خدا موجود نہیں تو حضرت محمدؐ رسول اللہ کو آج سے چودہ سو سال قبل کس نے بتایا کہ ایک زمانہ آئے گا جب وہ سمندر جنہیں خشکی نے ایک دوسرے سے جدا کر دیا ہے باہم ملا دیئے جائیں گے اور انسان علمی لحاظ سے اور ٹیکنالوجی کے میدان میں اتنی ترقی کرے گا کہ وہ دیوہیکل مشینوں کے ذریعے میلوں پھیلی ہوئی زمین کو کھود کر پھینک دے گا اور جہاں حدِ نگاہ خشکی نظر آ رہی ہے وہاں سمندر کا پانی موجزن ہوگا جس میں سے بڑے سے بڑے اور وزنی سے وزنی جہاز بآسانی گزر جائیں گے۔

یہودیوں کے قیامِ حکومت کی پیش گوئی

قرآن حکیم کی رو سے یہودی مغضوب قوموں میں سے ہیں یعنی جن پر خدا کا

غضب نازل ہوا۔ قرآن حکیم ان کے ذکر سے بھرا پڑا ہے ان کی بداعمالیوں کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے انہیں حکومت واقتدار سے محروم کر دیا اور انہیں ان کے دشمنوں کے ہاتھوں بار بار ذلیل کروایا۔ پھر انہیں ان کے وطن سے خستہ وخوار کر کے نکال دیا اور روئے زمین پر منتشر کر کے دوسری قوموں کا غلام بنا دیا۔ کون کہہ سکتا تھا کہ یہ منتشر اور محکوم قوم ایک دن پھر ظاہری ذلت کے گڑھے سے نکل آئے گی اور اسے حکومت واقتدار حاصل ہو جائے گا مگر قرآن حکیم نے آج سے چودہ سو سال قبل پیش گوئی کر دی تھی کہ:۔

ضربت علیهم الذلة این ماثقفوا الابحبل من اللّٰه وحبل من الناس وبآء و بغضب من اللّٰه وضربت علیهم المسکنة ط ذلك بانهم کانوا یکفرون بایٰت اللّٰه ویقتلون الانبیآء بغیر حق ط ذلك بما عصوا و کانوا یعتدون o (سورہ آل عمران آیت نمبر۱۱۲)

''انہیں (یہود کو) ذلت کی ماردی گئی ہے سوائے اس کے کہ وہ اللہ کے کسی عہد یا لوگوں کے عہد کی پناہ میں چلے جائیں اور وہ اللہ کے غضب کے مستحق ہو گئے ہیں اور ان پر پستی مسلط کر دی گئی ہے اور یہ اس وجہ سے ہوا کہ وہ لوگ احکام الٰہی کے منکر ہو جاتے تھے اور بغیر حق کے نبیوں کو قتل کرتے تھے (اور اس کا ایک) سبب یہ بھی تھا کہ وہ لوگ اطاعت الٰہی سے انکار کرتے اور حد سے گزر جاتے تھے''۔

ان آیات کریمہ میں اللہ تعالیٰ یہود کو ذلت کی مار دینے اور ان کی پستی اور کسمپرسی کی وجہ یہ بیان فرماتا ہے کہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی اطاعت سے بار بار منحرف ہو جاتے تھے، ظلم کرتے تھے اور انبیائے کرام کو قتل کرتے تھے۔ فرمایا کہ اس لئے ان پر ذلت وخواری مسلط کر دی گئی ہے لیکن ساتھ ہی استثنا کی ایک صورت بھی بیان فرمادی کہ ان کی یہ ذلت وخواری اس صورت میں ختم ہو جائے گی کہ وہ یا تو اللہ تعالیٰ سے کوئی عہد کر لیں یعنی اسلام قبول کر لیں یا انسانوں کے کسی گروہ کی پناہ حاصل کر لیں۔ اس ارشادِ خداوندی میں صاف طور پر مستقبل کی یہ خبر موجود ہے کہ ایک زمانہ آئے گا جب بنو اسرائیل ایک جگہ جمع ہو جائیں گے اور انہیں حکومت واقتدار مل جائے گا لیکن ان کا یہ اقتدار دوسری قوموں کے رحم وکرم پر ہو گا یعنی جب

تک کوئی قوم ان کی پشت پناہی نہیں کرے گی اس وقت تک یہ لوگ بدستور روئے زمین پر منتشر اور دوسری قوموں کے غلام رہیں گے چنانچہ ساری دنیا نے دیکھ لیا کہ انگریزوں اور امریکہ نے یہود کی سرپرستی کی اور انہی کی پشت پناہی کی بدولت آج وہ حکومت کررہے ہیں۔

اگر خدا موجود نہیں ہے تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو آج سے چودہ سو سال قبل کس نے بتادیا تھا کہ ایک زمانہ آئے گا جب دنیا کی دو بڑی طاقتیں یہودیوں کی سرپرستی کریں گی اور ان کی پشت پناہی اور امداد کی بدولت یہودی صاحبِ حکومت واقتدار ہوجائیں گے۔ اگرچہ قرآن حکیم کی رو سے ان کے اقتدار کا یہ زمانہ عارضی ہے اور جو زندہ رہے گا وہ دیکھے گا کہ ایک دن ایسا آئے گا جب یہود یا تو اللہ کے عہد کے نیچے آجائیں گے یعنی اسلام قبول کرلیں گے بصورت دیگر انہیں پھر ذلت ورسوائی سے دوچار ہونا پڑے گا اور ارضِ مقدس (فلسطین) اللہ اپنے نیک بندوں کو عطا فرمائے گا۔

جدید بحری جہازوں کی پیش گوئی

جس زمانے میں قرآن نازل ہوا اس عہد میں سفر بادبانی جہازوں کے ذریعے کئے جاتے تھے اور کسی کے تصور میں نہ آسکتا تھا کہ ایک زمانہ ایسا آئے گا جب شہر نما جہاز ایجاد ہوجائیں گے جن میں بیک وقت کئی کئی ہزار افراد سفر کرسکیں گے اور سیکڑوں ٹن وزنی سامان اٹھا کر یہ جہاز سمندروں پر حکمرانی کریں گے مگر قرآن نازل کرنے والے خدا نے آج سے چودہ سو سال قبل پیش گوئی کردی تھی کہ:۔

ولہ الجوار المنشئٰت فی البحر کالاعلام o (سورہ الرحمٰن آیت نمبر ۲۴)

"اور اسی کے قبضے میں ہیں وہ جہاز جو پہاڑوں کی طرح اونچے کھڑے نظر آتے ہیں"۔

ظاہر ہے قرآن کریم کے نزول کے زمانے میں دیوپیکر اور پہاڑ نما جہاز موجود نہ تھے۔ یہ جہاز موجودہ دور کی ایجاد ہیں اور دیکھنے والوں کو واقعی پہاڑ کی طرح نظر آتے ہیں۔

اگر خدا موجود نہیں ہے تو آج سے چودہ سو سال قبل محمدؐ رسول اللہ کو کس نے بتایا کہ ایک زمانہ

آئے گا جب انجنوں سے چلنے والے جہاز ایجاد ہو جائیں گے جنہیں دیکھ کر پہاڑوں کا گمان ہوگا۔ پھر بہت سے ایسے امور جن تک اس دور میں انسانی ذہن کی رسائی ممکن ہی نہ تھی رسولؐ اقدس کی زبانِ مبارک سے اس طرح بیان فرمائے جیسے آپؐ ان واقعات کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہوں چنانچہ ارشاد ہوا:

واذاالجبال سیرت o واذاالعشار عطلت o واذاالصحف نشرت o (سورہ التکویر آیت نمبر ۳، ۴، ۱۰)

''اور جب پہاڑ چلائے جائیں گے اور جب دس ماہ کی حاملہ اونٹنیاں بے کار چھوڑ دی جائیں گی اور جب صحیفے روئے زمین پر پھیلا دیئے جائیں گے''۔

فرمایا پہاڑ چلائے جائیں گے، پہاڑ چلانے سے مراد ان کا اپنی جگہ سے ہٹ جانا ہے چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا کے ہر ملک میں پہاڑوں کو بارود سے اڑا کر سڑکیں، پل اور نہریں نکال دی گئیں اور بعض مقامات پر انہیں ہموار کر کے بستیاں بسا دی گئیں۔ پھر فرمایا کہ دس ماہ کی اونٹنیاں بے کار چھوڑ دی جائیں گی۔ عرب میں دس ماہ کی اونٹنی زیادہ قیمتی ہوتی تھی کیونکہ اس کے بچہ دینے کا وقت قریب ہوتا تھا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ایک زمانہ آئے گا جب اونٹوں کی کوئی قدر و قیمت نہیں رہے گی کیونکہ جزیرہ نمائے عرب میں سفر اونٹوں کے ذریعے سے نہیں ہوگا بلکہ بسیں، کاریں اور ہوائی جہاز ایجاد ہو جائیں گے اس لئے دس ماہ کی حاملہ اونٹنیاں آوارہ پھریں گی یعنی کوئی ان کی طرف توجہ نہیں کرے گا۔ آخری پیش گوئی تو نہایت عظیم الشان ہے کہ جب صحیفے ساری دنیا میں پھیلا دیئے جائیں گے یعنی اس کثرت سے اخبارات، رسائل اور کتابیں شائع ہوں گی کہ دنیا کا کوئی گوشہ ان سے خالی نہیں رہے گا۔

یہ آیاتِ قرآنی ہمیں دعوت فکر دیتی ہیں کہ اگر خدا موجود نہیں ہے تو آج سے چودہ سو سال قبل جب بارود کا وجود تک نہ تھا رسولؐ اللہ کو کس نے بتایا کہ ایک زمانہ آئے گا جب پہاڑوں کو اُڑا کر بستیاں بسائی جائیں گی، راستے بنائے جائیں گے۔ جب اونٹوں، خچروں اور گھوڑوں کے سوائے خشکی پر سفر کرنے کا اور کوئی ذریعہ نہیں تھا رسولؐ اللہ کو کیسے معلوم ہو گیا کہ ایک زمانہ آئے گا جب دس ماہ کی حاملہ اونٹنیاں آوارہ پھرتی رہیں گی کیونکہ

بسیں، کاریں اور ہوائی جہاز ایجاد ہو چکے ہوں گے۔ آج سے چودہ سو سال پہلے جب عرب میں لکھنا پڑھنا بھی بہت کم لوگ جانتے تھے اور درختوں کی چھال یا اونٹ کے گھٹنے کی ہڈیاں زیادہ تر بطور کاغذ استعمال ہوتی تھیں، جب پریس اور اخبارات و رسائل کا تصور بھی موجود نہ تھا اس وقت رسولِ خداؐ کو کس نے بتایا کہ ایک زمانہ آئے گا کہ جب صحافت عروج پر ہوگی، دنیا کے ہر ملک سے اتنی کثرت سے اخبارات و رسائل شائع ہوں گے اور اتنی کتابیں چھپیں گی کہ روئے زمین کا کوئی گوشہ ان سے خالی نہیں رہے گا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ایک ایسی علیم و خبیر ہستی موجود ہے جسے قیامت تک رونما ہونے والے تمام واقعات کا علم ہے اور جس نے ان واقعات میں سے بہت سے واقعات اپنے رسولؐ پر ظاہر فرما دیئے جن میں سے ایک ایک واقعہ رونما ہو گیا۔

فرعون کا جسم محفوظ رہنے کی پیش گوئی

قرآنِ حکیم کے نزول سے سیکڑوں سال قبل فرعون مصر نے اپنے لشکروں کے ساتھ حضرت موسیٰؑ اور بنو اسرائیل کا تعاقب کیا تھا۔ حضرت موسیٰؑ اور آپؑ کے پیرو سلامتی کے ساتھ سمندر سے گزر گئے، مگر فرعون اور اس کے لشکر غرق کر دیئے گئے۔ قرآن حکیم یہ واقعہ بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ:۔

وجاوزنا ببنی اسرآءیل البحر فاتبعھم فرعون وجنودہٗ بغیا وعدوا ط حتی اذا ادرکہ الغرق قال امنت انہ لا الہ الا الذی امنت بہ بنو اسرآءیل وانا من المسلمین ○ آلئن وقد عصیت قبل وکنت من المفسدین ○ فالیوم ننجیک

''اور ہم نے بنو اسرائیل کو سمندر سے (سلامتی کے ساتھ) گزار دیا پھر ان کے پیچھے پیچھے فرعون مع اپنے لشکر کے ظلم اور زیادتی کے ارادے سے چلا یہاں تک کہ جب ڈوبنے لگا تو (اللہ تعالیٰ سے) کہا کہ میں ایمان لاتا ہوں اس پر، جس پر بنو اسرائیل ایمان لائے کہ اس کے سوائے اور کوئی معبود نہیں اور میں مسلمانوں میں

ببدنك لتكون لمن خلفك ایۃ○ (سورہ یونس آیت نمبر۹۰ تا۹۲) داخل ہوتا ہوں (اللہ نے جواب دیا کہ) اب ایمان لاتا ہے۔ پہلے سرکشی کرتا رہا اور مفسدوں میں داخل رہا سو اب ہم تیرے بدن کو نجات دیں گے تا کہ تو اپنے بعد آنے والوں کے لئے موجب عبرت رہے''۔

یہ واقعہ صرف قرآن کریم نے بیان کیا ہے۔قدیم آسمانی صحائف یعنی بائیبل میں فرعون کی غرقابی کا تو ذکر ہے مگر اس کے جسم کو بچائے جانے کا کوئی تذکرہ نہیں ورنہ مخالفین کہہ دیتے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ واقعہ بائیبل سے سن کر قرآن میں دہرا دیا۔اس پیش گوئی نے قرآن حکیم کی صداقت، رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صداقت اور خدا کی ہستی تینوں کا ایک ایسا زبردست ثبوت مہیا کر دیا کہ عقل انسانی دنگ رہ جاتی ہے۔غور کرنے کا مقام ہے کہ جو شخص سمندر میں ڈوب جاتا ہے اس کے متعلق کون کہہ سکتا ہے کہ اس کی لاش محفوظ رہے گی کیونکہ سمندر کے خوفناک آبی جانور جو ہر وقت شکار کی تلاش میں گھومتے رہتے ہیں انسانی جسم کو دیکھتے ہی لقمہ بنا لیتے ہیں مگر خداوند تعالیٰ فرعون کو مخاطب کر کے فرماتا ہے کہ ہم تیرے جسم کو محفوظ رکھیں گے تا کہ تیرے بعد آنے والی نسلوں کے لیے یہ نشانِ عبرت ثابت ہو۔خدا کا یہ وعدہ بہ لفظ درست ثابت ہوا اور فرعون کی لاش سمندر کی تہہ میں محفوظ رہی۔نہ اسے کسی مگرمچھ نے لقمہ بنایا نہ کسی وہیل مچھلی نے اور نہ سمندر کے پانی ہی سے اسے کوئی نقصان پہنچ سکا۔پھر سمندر کی لہروں نے اس کی لاش کو نکال کر کنارے پر پھینک دیا، اسے حنوط کیا گیا اور ایک تہہ خانے میں محفوظ کر دیا گیا۔غالباً ۱۸۷۵ء میں فرعون کی لاش اس تہہ خانے سے نکالی گئی اور مصر کے عجائب گھر میں رکھ دی گئی جہاں آج تک یہ لاش ایک عالم کے لئے نشانِ عبرت بنی ہوئی ہے اور زبان حال سے پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ یہ وہی شخص ہے جو حضرت موسیٰؑ کا تعاقب کرتے ہوئے غرق ہوا تھا۔

اگر خدا موجود نہیں ہے تو آج سے چودہ سو سال قبل حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وآلہ وسلم کو کس نے بتایا کہ فرعون جو نزول قرآن سے سیکڑوں سال قبل غرق ہو چکا تھا اس کی لاش محفوظ ہے اور ایک دن آئے گا جب اسے عجائب گھر میں رکھا جائے گا کیونکہ جب تک فرعون کی لاش کسی مقبرے میں پڑی رہتی اس وقت تک وہ دنیا کے لئے سامان عبرت نہیں بن سکتی تھی۔ سامانِ عبرت بننے کے لئے ضروری تھا کہ ایک عالم اُسے دیکھے اور جو چاہے اس کی لاش تک پہنچ سکے یہ اسی صورت میں ممکن تھا کہ اسے عجائب گھر میں رکھا جاتا۔ سو آج وہ حسرت ویاس کی تصویر بنی عجائب گھر میں رکھی ہوئی ہے اور ایک دنیا اُسے دیکھ کر عبرت حاصل کر رہی ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ایک ایسی ہستی موجود ہے جس کے علم و خبر کا دائرہ لامحدود ہے اور جس نے اپنے رسولؐ برحق کو فرعون کا جسم محفوظ رکھنے اور پھر اس کی نمائش کئے جانے کی صدیوں پہلے خبر دے دی تھی۔

تحفظ قرآن کی پیش گوئی

چودہ سو سال گزرے جب عرب کے اُمی نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایک کتاب نازل ہوئی۔ اس کتاب کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ:۔

وانہ لتنزیل رب العٰلمین ٥
(سورہ الشعراء آیت نمبر ۱۹۲)

''اور بلاشبہ قرآن اس خدا کی طرف سے نازل کیا گیا جو سب جہانوں کا رب ہے۔''

ایک اور جگہ اعلان فرمایا گیا کہ:۔

انا نحن نزلنا الذکر و انا لہ لحافظون ٥ (سورہ الحجر رکوع نمبر ۱)

''یہ ذکر (یعنی قرآن) ہم نے نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت فرمائیں گے''۔

یہ اعلان اس وقت کیا گیا جب عرب جہالت کی تاریکیوں میں ڈوبا ہوا تھا' جب عرب میں کاغذ کا وجود تک نہ تھا' جب اہلِ عرب لٹریچر کے تصور تک سے نا آشنا تھے' قرآن حکیم کی آیات درختوں کی چھالوں' کھجور کے پتوں' کپڑے کے ٹکڑوں اور اونٹ کے گھٹنوں کی ہڈیوں پر لکھی ہوئی موجود ضرور تھیں مگر کتابی صورت میں موجود نہ تھیں بلکہ مختلف صحابہ کے پاس مختلف سورتیں تھیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں لکھوا دی تھیں اور

ہدایت فرمادی تھی کہ فلاں آیت فلاں سورت میں درج کرلو یعنی قرآن حکیم الحمد سے لے کر والناس تک موجودہ ترتیب کے ساتھ حضورؐ نے اپنے صحابہ کو لکھوا تو دیا تھا مگر وہ کسی ایک صحابی کے پاس ایک کتاب کی صورت میں موجود نہ تھا۔ان حالات میں کوئی اس قسم کا دعویٰ نہیں کر سکتا تھا کہ سامانِ کتابت وطباعت کے فقدان کے باوجود اتنی ضخیم کتاب جس کے اجزا ابھی تک یک جا نہیں ہوئے تھے پوری طرح محفوظ رہے گی مگر چونکہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ تھا کہ یہ قرآن اس نے نازل کیا ہے اس لئے وہی اس کی حفاظت فرمائے گا' کتابت وطباعت کی بے سروسامانی کے باوجود قرآن حکیم مکمل طور پر نہ صرف جمع کرلیا گیا بلکہ آج تک اسی صورت میں محفوظ ہے جس صورت میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مرتب کروایا تھا۔ حالانکہ اس دوران امتِ مسلمہ پر ہزاروں حوادث گزر گئے' بڑے بڑے انقلابات آئے حتیٰ کہ یہودیوں نے قرآن حکیم کے الفاظ میں تغیر وتبدل کر کے ایک تحریف شدہ قرآن مرتب کر کے اسے دنیا کے کونے کونے میں پھیلانے کا ناپاک منصوبہ بنالیا مگر یہ سارے منصوبے خاک میں مل گئے اور آج روئے زمین پر قرآن حکیم کے ایک نسخے کے سوائے کوئی نسخہ موجود نہیں۔کوئی شخص اس کتاب الٰہی کا کوئی ایسا نسخہ نہیں پیش کرسکتا جس میں مروجہ نسخے کے خلاف ایک لفظ کا بھی فرق ہو جبکہ روئے زمین پر کوئی ایک آسمانی کتاب ایسی نہیں جو تحریف سے پاک ہو۔

اگر خدا موجود نہیں تو آج سے چودہ سو سال قبل جبکہ قرآن حکیم کے تحفظ کا کوئی ظاہری سامان موجود نہیں تھا رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کس نے بتایا کہ یہ کتاب مقدس قیامت تک اسی طرح محفوظ رہے گی اور اس میں ایک لفظ تو کیا ایک نقطے کی بھی تبدیلی نہ ہوگی۔اس ارشاد خداوندی کا حرف بہ حرف پورا ہوجانا ثابت کرتا ہے کہ بلاشبہ' خدا موجود ہے جو عالم الغیب بھی ہے۔

....

حواشی:

(۱) اس جلیل القدر عارف باللہ کے یہ نکات جناب عبداللہ افغانی کے مضمون ''فتنہ لادینیت'' سے ماخوذ ہیں جو اس کتاب کی کتابت کے دوران ۶ مارچ ۱۹۸۰ء کے روزنامہ ''امروز'' لاہور میں شائع ہوا۔

(۲) دیوانِ غالب کے نسخوں میں آخری شعر پہلے درج ہے۔ یہاں اسے موخر کر دیا گیا ہے۔ (مصنف)

(۳) ان دلائل کا مرکزی تخیل مشہور دانشور اے کریسی ماریسن کی کتاب "Man does not stand alone" سے ماخوذ ہے۔

(۴) ممنون ہوں میں اپنے دیرینہ کرم فرما اور لاہور کے بزرگ معالج ڈاکٹر سید بہادر علی شاہ صاحب اور پاکستان کے ممتاز ماہر چشم ڈاکٹر محمد یقین صاحب کا' ان دونوں صاحب علم و فن حضرات سے میں نے کئی نشستوں میں آنکھ کے نظام کے بارے میں متعدد سوالات کئے' ان حضرات کے جوابات کی روشنی میں میں نے کتاب کے اس باب کا یہ حصہ مکمل کیا۔ (پیامؔ)

⌘⌘⌘

تخلیقِ کائنات

منکرینِ خدا کا المیہ

دین اور اس کے تصورات پر مفکر انیجلز اور اس کے ہم خیال مفکروں کا سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ خدا اور سائنس یا مذہب اور سائنس ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ اس اعتراض کی اصل وجہ یہ ہے کہ ان منکرینِ خدا نے سائنس تو ضرور پڑھی، تاریخ عالم، علمِ حیاتیات اور علمِ اقتصادیات میں بھی مہارت حاصل کی اور فلاسفہ کے افکار کا بھی مطالعہ کیا مگر انہوں نے قرآن نہیں پڑھا اور نہ انہیں اس کتابِ حکمت پر تدبر اور غور و فکر کا موقع مل سکا۔ یہ منکرینِ خدا ایشیائی ممالک سے تعلق رکھتے ہوں یا مغربی ممالک سے ان کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ ان مفکروں اور فلاسفہ کا علم یک رُخا ہے یعنی صرف ایک پہلو تک محدود ہے، اس کا دوسرا پہلو جو علم دین سے تعلق رکھتا ہے ان کی نگاہوں سے قطعاً اوجھل رہا۔ اس سے ہمارا یہ مقصد نہیں کہ منکرینِ خدا کو عالم دین بھی ہونا چاہئے؟ بلکہ ہم کہنا یہ چاہتے ہیں کہ جس طرح سائنسی امور پر کوئی فیصلہ کرنے یا اظہارِ خیال کا حق صرف انہی لوگوں کو حاصل ہے جنہوں نے سائنس کا مطالعہ کیا ہے، جو شخص سائنس کی ابجد سے بھی واقف نہ ہو وہ سائنس پر اظہارِ خیال کا کوئی حق نہیں رکھتا۔ اسی طرح جب ایک منکرِ خدا یہ کہتا ہے کہ خدا موجود نہیں یا خدا کا تصور سائنس کی ضد ہے تو ہمیں اس سے یہ دریافت کرنے کا حق حاصل ہے کہ کیا اس نے خدا اور سائنس کے بارے میں مذہب سے کوئی رہنمائی حاصل کی؟ اگر حاصل کی تو کس مذہب سے؟ مذاہبِ عالم میں اسلام کے متعلق ہمارا دعویٰ ہے کہ یہ مکمل ترین اور آخری دین

ہے جو خدا کے وجود پر بھی دلائل پیش کرتا ہے اور سائنس کے بارے میں بھی ہماری رہنمائی کرتا ہے۔ اگر منکرینِ خدا نے سائنس کے ساتھ قرآن بھی پڑھا ہے تو انہیں خدا اور مذہب کے بارے میں اظہارِ خیال کا حق حاصل ہے بصورت دیگر انہیں خدا کے وجود اور مذہب پر اعتراض کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں کیونکہ ان کا علم نامکمل اور قرآن کے بارے میں صفر کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہم پورے یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ اگر منکرینِ خدا نے قرآن کا باریک بینی سے مطالعہ کیا ہوتا اور اسے سمجھنے کی کوشش کی ہوتی تو وہ خدا کی ہستی کا اقرار کرتے اور کبھی یہ اعتراض نہ کرتے کہ خدا اور مذہب کا تصور سائنس کی ضد ہے۔

سائنس کا منبع

قرآن حکیم اس ہستی کی طرف سے نازل ہوا ہے جو تمام علوم کی جامع ہے اور جس کے علم وخبر کا دائرہ لامحدود ہے اس لئے اس علیم وخبیر ہستی نے قرآن حکیم میں جہاں عقائد، اخلاقیات، معاشی ضابطے اور معاشرے کے انتظامی امور سے متعلق اصول بیان فرمائے وہاں اس نے بنی نوع انسان کو سائنس اور اس کے باریک در باریک نکات پر بھی مطلع فرمایا۔ یہ نکات جہاں ایک طرف خدا کے وجود پر شاہدِ عادل ہیں وہاں ان سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ خدا اور سائنس نہ صرف یہ کہ ایک دوسرے کی ضد نہیں بلکہ سائنس کے بہت سے اسرار و رموز سب سے پہلے قرآن حکیم ہی نے بیان فرمائے اور کائنات کی تخلیق سے لے کر انسان کی تخلیق تک مختلف مدارج کی کیفیات کا انکشاف کیا۔

دوسری بات یہ کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں تخلیق کائنات کی سائنس بیان کرنے ہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ بنی نوع انسان کو ہدایت فرمائی کہ:

اس (اللہ)

سیروا فی الارض فانظروا کیف بدأ الخلق (سورہ العنکبوت آیت نمبر ۲۰)

''زمین پر چلو پھرو اور دیکھو کہ ہم نے زندگی کا آغاز کس طرح کیا''۔

دعوتِ مشاہدہ

اگر خدا اور مذہب کا تصور سائنس کی ضد ہوتا تو اللہ تعالیٰ انسان کو کبھی ہدایت نہ فرماتا کہ زمین پر پھیل کر اس کائنات کا مشاہدہ کرو، غور وفکر کرو، تلاش و تحقیق کرو اور دیکھو کہ ہم نے زمین و آسمان اور ان میں پائی جانے والی اشیاء کی تخلیق کا آغاز کس طرح کیا کیونکہ اگر خدا اور مذہب کا تصور غیر منطقی، غیر معقول اور غیر سائنسی ہوتا تو کائنات کے اسرار و رموز اور اس کی پیدائش پر غور و خوض کرنے سے خدا اور مذہب کے تصورات کے سارے تار و پود بکھر جاتے۔ اس صورت میں انسان کو ان اسرار و رموز پر غور کرنے سے روک دیا جاتا مگر یہاں تو اللہ تعالیٰ خود دعوت دے رہا ہے کہ اے غور وفکر کرنے والو! زمین پر گھومو پھرو اور تحقیق کرو کہ ہم نے اس کائنات کی تخلیق کا عمل کس طرح شروع کیا۔ یہ دعوت وہی ہستی دے سکتی ہے جسے اپنے دعوے کے بارے میں کسی قسم کا شک وشبہ نہ ہو اور جس کے دلائل کی بنیاد پہاڑوں سے بھی کہیں زیادہ مستحکم ہو۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ خدا اور مذہب کے تصورات کو سائنس سے کوئی نقصان نہیں پہنچتا اور نہ سائنس کی ترقی میں خدا اور مذہب حائل ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ غور وفکر کرنے والے لوگوں کو صرف فکر اور مشاہدے کی تلقین کر کے خاموش نہیں ہو جاتا بلکہ سائنس کے میدان میں ان کی رہنمائی بھی کرتا ہے۔

قرآن حکیم میں تخلیق کائنات سے متعلق جو اسرار و رموز بیان کئے گئے ہیں انہیں تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے (۱) نظام شمسی کی تخلیق کا آغاز (۲) کرۂ ارض پر زندگی کا آغاز (۳) انسان کی تخلیق کا آغاز۔

نظامِ شمسی کی تخلیق کا سائنسی نظریہ

سائنس دانوں نے جن میں علم الافلاک اور علم طبقات الارض دونوں کے ماہر شامل ہیں طویل تحقیق کے بعد اس کائنات کی تخلیق کی جو سرگزشت بیان کی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے۔

زمین، چاند، سورج اور لاتعداد ستارے اور سیارے جو اس وسیع کائنات میں پھیلے

ہوئے ہیں پہلے ان کا کہیں وجود نہ تھا' ایک آتشیں گیس تھی جو ہر طرف چھائی ہوئی تھی۔ کوئی دو کھرب سال گزرے کہ اجرام فلکی اسی آتشیں گیس سے وجود میں آئے۔ یہ آتشیں گیس ان گنت باریک در باریک ذرات پر مشتمل تھی۔ ان ذرات میں کشش کی قوت تھی بلکہ ان میں سے ہر ذرے کے اندر خوردبین سے بھی نظر نہ آنے والے ننھے ننھے بہت سے ذرے سمائے ہوئے تھے۔ ان میں سے ہر ذرہ متحرک تھا۔ اس حرکت اور اپنی کشش کی وجہ سے یہ ذرے ایک دوسرے سے پیوست ہونے لگے اور اس طرح رفتہ رفتہ گیند نما کرے عالمِ وجود میں آنے لگے۔ یہ کرے پہلے گولے کی طرح بند تھے مگر مسلسل گردش کرتے رہنے اور اندرونی مادے کے جوش مارنے کی وجہ سے یہ درمیان سے کھل گئے اور ان کے کنارے جدا ہو کر دور چلے گئے۔ اس طرح ان پر ہزاروں لاکھوں میل لمبے چوڑے میدان وجود میں آ گئے۔ انہی کروں میں سے ایک کرہ سورج ہے۔ سورج آگ کی ایک ایسی خوفناک بھٹی ہے جس کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے۔ اس کا قطر دس لاکھ میل ہے اور اس کی سطح سے ہر وقت آتشیں طوفان اٹھتے رہتے ہیں جن کی لہریں کئی کئی سو میل بلند ہوتی ہیں انہیں آتشیں شعلوں کے نام سے بھی موسوم کیا جاتا ہے۔ یہ طوفانی شعلے اپنی جسامت میں ہماری زمین سے کئی ہزار گنا بڑے ہوتے ہیں۔ اس سے سورج کی خوفناک وسعت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

سورج اپنے مدار میں گردش کرتا رہتا ہے۔ یہ حسب معمول گردش کر رہا تھا کہ ایک آوارہ سیارہ اس کے پاس سے گزرا' دوسری تحقیق کے مطابق اس سے جا ٹکرایا۔ اس کشش یا تصادم کے نتیجے میں سورج کی سطح سے بہت بڑی مقدار میں سیال آتشیں مادہ اُچھل کر فضا میں تیرنے لگا۔ اس مادے کے کئی حصے ہو گئے چونکہ یہ مادہ سورج سے نکلا تھا اس لئے اس کے تمام حصے سورج کی کشش کی وجہ سے اس کے اردگرد چکر لگانے لگے۔ انہی میں سے ایک حصہ ٹھنڈا ہو کر منجمد ہو گیا یہ ہماری زمین ہے۔ گویا اجرام فلکی میں سے زمین بعد میں تخلیق ہوئی اور اس کی عمر چار ارب پچاس کروڑ سال ہے۔ زمین کے علاوہ عطارد' زہرہ' مریخ' مشتری' زحل' یورینس' نیپچون اور پلوٹو' یہ تمام سیارے سورج کے ساتھ اسی آوارہ سیارے کے تصادم کے نتیجے میں عالم وجود میں آئے چونکہ یہ تمام سیارے بھی سورج ہی کے

مادے سے پیدا ہوئے یا اسی سے الگ ہوئے تھے اس لئے یہ سب سورج کے چاروں طرف گردش کرتے رہتے ہیں اور نظام شمسی میں شامل ہیں۔

یہ تمام سیارے ابتدا میں پگھلے ہوئے مادے کی صورت میں گردش کررہے تھے۔ جیسے جیسے وقت گزرتا گیا یہ ٹھنڈے ہوکر منجمد ہوتے چلے گئے۔ ہماری زمین بھی ابتدا میں پگھلا ہوا آتشیں مادہ تھا جس کے چاروں طرف کثیف ہوا کا ایک غلاف لپٹا ہوا تھا۔ تین کروڑ سال ہوئے کہ زمین ٹھنڈی ہوکر منجمد ہوگئی۔ سیال مادے سے ٹھوس جسامت کی شکل اختیار کرنے میں ہماری زمین کو دس سے بیس ہزار سال تک لگے۔

جن دنوں زمین سیال آتشیں مادے کی صورت میں سورج کے گرد گردش کررہی تھی اس پر دو قسم کی کشش کے دباؤ پڑ رہے تھے۔ ایک سورج کی کشش اور دوسری زمین کی اپنی کشش۔ اس کشش کی وجہ سے زمین کے پگھلے ہوئے مادے میں طوفان اٹھتے رہتے تھے۔ ایسے ہی ایک طوفان نے زمین کی سطح سے بہت سا آتشیں مادہ باہر نکال پھینکا چونکہ یہ سیال مادہ زمین سے جدا ہوا تھا اس لئے اس کے چاروں طرف گردش کرنے لگا۔ رفتہ رفتہ ٹھنڈا ہوکر یہ مادہ جم گیا اور چاند کہلایا (۱)۔ زمین کے جس حصے سے یہ مادہ خارج ہوا تھا وہاں بہت گہرا خلاء پیدا ہوگیا۔ جب زمین پر برف باری اور بارشوں کا عمل شروع ہوا تو یہ گہرا خلا پانی سے بھر گیا اور سمندر کی صورت اختیار کرگیا۔ یہ وہی سمندر ہے جسے ہم بحرالکاہل کہتے ہیں۔

جس جگہ بحرالکاہل واقع ہے چونکہ وہاں سے بہت بڑی تعداد میں مادہ نکل کر زمین سے باہر جا پڑا تھا اس لئے یہاں سے زمین کی بالائی سطح کمزور ہوگئی۔ یہی وجہ ہے کہ بحرالکاہل کے قریب سب سے زیادہ آتش فشاں پہاڑ واقع ہیں کیونکہ زمین کی پرتیں کمزور ہونے کی وجہ سے اندرونی لاوے کو یہاں سے باہر نکلنے میں آسانی ہوتی ہے۔ (۲)

نظامِ شمسی کی تخلیق کا قرآنی نظریہ

یہ ہے نظامِ شمسی کی تخلیق سے متعلق سائنس دانوں کی طویل تحقیق کا لب لباب۔

اس میں ہم نے حد درجہ اختصار سے کام لیا ہے اور صرف وہی امور بیان کئے ہیں جن کا ہمارے موضوع سے براہِ راست تعلق ہے۔ اس تحقیق کی رو سے نظامِ شمسی ہمیشہ سے نہیں ہے بلکہ ایک محدود مدت قبل معرضِ وجود میں آیا۔ یہ نظامِ شمسی یا دوسرے الفاظ میں سورج، زمین، چاند اور دوسرے تمام ستارے اور سیارے یک دم عالم وجود میں نہیں آئے بلکہ رفتہ رفتہ ارتقائی مراحل سے گزر کر موجودہ حالت تک پہنچے۔ ان تمام کروں کی تخلیق کا آغاز ایک آتشیں گیس سے ہوا جو خلا میں بھری ہوئی تھی۔ (خلا سے مراد موجودہ اصطلاح والی خلا نہیں بلکہ وہ خالی جگہ مراد ہے جہاں اس کائنات سے قبل کچھ نہیں تھا) آیئے اب قرآن حکیم پر غور کریں اور دیکھیں کہ اللہ تعالیٰ تخلیقِ کائنات کے بارے میں ہماری کیا رہنمائی کرتا ہے یا اس بنیادی مسئلے ہی کے بارے میں خاموش ہے اور اگر رہنمائی کرتا ہے تو وہ کیا حقائق بیان فرماتا ہے۔

آغازِ تخلیق

جب ہم قرآن حکیم پر غور کرتے ہیں تو ہماری نگاہ اس آیت پر جا کر ٹھہر جاتی ہے:

ثم استوی الی السماء وھی دخان (سورہ حم السجدہ آیت نمبر ۱۱)

''پھر اللہ تعالیٰ نے آسمان (بنانے) کی طرف توجہ فرمائی اور وہ (اس وقت) دھواں سا تھا۔''

گویا جو مسئلہ سائنس نے طویل تحقیق کے بعد اب حل کیا وہ قرآن حکیم چودہ سو سال قبل بیان کر چکا ہے۔ سائنس کہتی ہے کہ ستاروں اور سیاروں یعنی اس کائنات کے وجود میں آنے سے قبل کچھ نہیں تھا صرف آتشیں گیس تھی۔ قرآن حکیم فرماتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ آسمان کی تخلیق کی طرف متوجہ ہوا تو اس وقت ہر طرف دھواں ہی دھواں تھا اس کے علاوہ اور کچھ موجود نہ تھا۔ عربی میں لفظ ''دخان'' استعمال ہوا ہے جو آتشیں گیس کا مترادف ہے یا گیس جس کی مترادف ہے جسے اردو میں دھواں کہتے ہیں۔ معمولی عقل وفہم کا شخص بھی جانتا ہے کہ دھواں ٹھنڈا نہیں ہوتا بلکہ اس میں حرارت اور گرمی ہوتی ہے۔ حرارت یا گرمی آگ

کے بغیر پیدا نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اس نے جس چیز سے کائنات کو پیدا کیا وہ ایک ایسا دھواں (گیس) تھا جس میں حرارت اور گرمی تھی۔ اسی کو سائنس آتشیں گیس کے نام سے موسوم کرتی ہے۔

سیاروں کی تکمیل کے دو ادوار

سائنس کہتی ہے کہ سیارے ابتدا میں پگھلی ہوئی حالت میں تھے اس کے بعد وہ منجمد ہو گئے یعنی سیاروں اور ستاروں کو آغاز سے لے کر تکمیل تک دو بڑے مرحلوں سے گزرنا پڑا۔ ایک مرحلہ گیس کا پگھلے ہوئے مادے کی صورت اختیار کرنا' دوسرا مرحلہ اس مادے کا منجمد ہو کر سیاروں کی موجودہ صورت اختیار کرنا۔ آئیے دیکھیں قرآن حکیم سائنس کے اس انکشاف کے بارے میں آج سے چودہ سو سال قبل کیا نکتہ بیان کر چکا ہے فرماتا ہے کہ:

فقضهن سبع سموات فی یومین (سورہ حم السجدہ آیت نمبر ۱۲)

''پھر آسمان (کے سیاروں اور ستاروں) کو دو ادوار میں بنایا اور اسے سات طبقوں میں تقسیم کیا''۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے غیر مبہم طریقے سے وضاحت فرمادی کہ اس نے اس کائنات میں پائے جانے والے جملہ کروں کو دو ادوار میں مکمل کیا یعنی ایک دور وہ جب یہ کرے یا سیارے آتشیں گیس سے پگھلے ہوئے مادے کی صورت اختیار کر رہے تھے' دوسرا دور وہ جب انہوں نے پگھلے ہوئے مادے سے منجمد اور ٹھوس جسم کی شکل اختیار کی۔

سائنس نے ابھی تک آسمان کے سات طبقات کی تقسیم کو تسلیم نہیں کیا مگر یہ اس کی بے خبری ہے ایک دن آئے گا جب سائنس دانوں کو یہ تقسیم درست تسلیم کرنا پڑے گی کیونکہ یہ تقسیم اس ہستی نے کی ہے جو اس کائنات کی خالق ہے اور خالق اپنی تخلیق کی ماہیت' اس کے اجزا اور ترتیب سے مشاہدہ کرنے والوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ باخبر ہوتا ہے۔ اس تقسیم کی طرف اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ میں اشارہ فرمادیا ہے کہ:

واوحیٰ فی کل سمآء امرھا ط وزینا السمآء الدنیا بمصابیح و حفظاً (سورہ حم السجدہ آیت نمبر۱۲)

(آسمانوں کو دو ادوار میں بنانے کے بعد) ''جو کچھ ان میں رونما ہونا تھا اس کی طاقت پیدا کر دی اور نیچے والے آسمان کو ستاروں سے زینت دی اور اسے حفاظت کے لئے بنایا''۔

یعنی آسمان کے ان سات طبقات میں سے آخری اور زمین سے نظر آنے والا طبقہ تو وہ ہے جسے تم ستاروں اور سیاروں سے مزین دیکھ سکتے ہو۔ ان کے پیچھے چھ طبقے اور ہیں جن تک تمہاری نگاہ کی رسائی نہیں ہے۔ ان میں سے ہر طبقے میں بے شمار کائناتیں موجود ہیں۔ یہ اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق اور موجودات صرف وہی نہیں جو ہمیں نظر آ رہے ہیں بلکہ اس کے علاوہ اور بھی بہت سے موجودات ہیں۔ کیا عجب کسی ترقی یافتہ دور میں ان چھ طبقات سے متعلق حقائق بھی انسان پر ظاہر ہو جائیں بلکہ یقیناً ظاہر ہوں گے۔

زمین کا فضائی غلاف

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے سائنس کا ایک اور نکتہ بیان فرما دیا ہے یعنی آسمان کا وہ طبق جو تمہیں نظر آتا ہے اور جو ستاروں سے مزین کیا گیا ہے اس میں حسن وخوبصورتی اور روشنی کے علاوہ تمہاری حفاظت کا بھی سامان ہے۔ وہ حفاظت کیا ہے؟ سائنس اس کی تشریح کر دیتی ہے۔ سائنس دان کہتے ہیں کہ آسمان سے ہر وقت لاکھوں کی تعداد میں شہابِ ثاقب زمین کی طرف آتے ہیں۔ اگر راستے میں کوئی رکاوٹ نہ ہوتی تو یہ شہابِ ثاقب جن میں سے بعض کا وزن سیکڑوں ٹن ہوتا ہے زمین پر گر کر اسے تباہ و برباد کر دیتے مگر سورج اور زمین کے درمیان ایک فضائی غلاف ہے جس نے ہماری زمین کا چاروں طرف سے احاطہ کر رکھا ہے جب یہ شہاب ثاقب آسمان سے زمین کی طرف آتے ہیں تو اس فضائی غلاف سے گزرتے وقت اپنی تیز رفتاری کی وجہ سے سخت رگڑ کھاتے ہیں اور زمین پر پہنچنے سے پہلے

ہی جل کر راکھ ہو جاتے ہیں۔ یہ ہے حفاظت کا وہ سامان جس کی طرف اللہ تعالیٰ اس آیت میں اشارا کرتا ہے اور جس کی اب جا کر سائنس کو خبر ہوئی۔

سیاروں کا مسطح ہونا

اس باب کے آغاز میں بتایا جا چکا ہے کہ سائنس کا نظریہ ہے کہ ابتدا میں نظام شمسی کے تمام کرے (ستارے اور سیارے) گولے کی طرح بند تھے۔ پھر مسلسل گردش اور اندرونی مادے کے جوش مارنے کی وجہ سے یہ کھل گئے اور ان پر لاکھوں میل لمبے میدان پیدا ہو گئے۔ یہ نظریہ سب سے پہلے قرآن حکیم نے پیش کیا چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ:

اولم یر الذین کفروا ان السموت والارض کانتا رتقاً ففتقنھما ط

"کیا انکار کرنے والوں کو معلوم نہیں آسمان اور زمین (پہلے) بند تھے پھر ہم نے دونوں کو کھول دیا"۔

(سورہ الانبیاء آیت نمبر ۳۰)

اس آیت میں سائنس کا ایک کلیہ بیان کیا گیا ہے جو صرف ان ستاروں اور سیاروں ہی پر منطبق نہیں ہوتا جو اب تک تکمیل پا چکے ہیں بلکہ ایک عام اصول تخلیق کی نشاندہی کرتا ہے کہ جب کوئی ستارہ یا سیارہ پیدا ہوتا ہے تو مختلف ذرات کے باہم ملنے سے اس کی جسامت بننی شروع ہوتی ہے۔ اس پر دوسرے سیاروں سے شہاب ثاقب گر گر کر اس کے حجم میں اضافہ کرتے رہتے ہیں اس طرح وہ ایک بہت بڑے گولے کی شکل اختیار کر لیتا ہے جس کے اندر بے اندازہ قوت ہوتی ہے اس میں مختلف قسم کی گیسیں اور دھاتیں ہوتی ہیں یہ جوش مارتی رہتی ہیں اور پھر ایک وقت آتا ہے جب یہ گولا اندرونی دباؤ اور بیرونی کشش کی وجہ سے کھل جاتا ہے اس کے کنارے چاروں طرف پھیل جاتے ہیں اور اس پر ایک ناہموار سطح نمودار ہو جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جن لوگوں کو اس سائنسی حقیقت کا علم نہیں انہیں اب معلوم ہو جانا چاہئے کہ زمین اور آسمان پر پائے جانے والے ستارے اور سیارے پہلے گولوں کی طرح بند تھے پھر ہم نے انہیں کھول دیا اور ان پر ہموار و ناہموار سطح پیدا ہو گئی۔

سورج اور چاند کی روشنی کا فرق

سائنس کہتی ہے کہ سورج آگ کی لاکھوں میل لمبی چوڑی بھٹی ہے جس کی سطح پر شعلوں کے اتنے بڑے طوفان اٹھتے ہیں جن کی لہریں کئی کئی سو میل بلندی تک جا پہنچتی ہیں مگر چاند پر ایسی لہریں پیدا نہیں ہوتیں کیونکہ چاند کی بیرونی سطح ٹھنڈی ہو چکی ہے۔ گویا سائنس کے نقطۂ نگاہ سے سورج روشن ہے اور چاند اپنی ذات میں تاریک۔ قرآن حکیم چودہ سو سال قبل اس سائنسی نکتے کی طرف واضح طور پر اشارہ کر چکا ہے فرماتا ہے کہ:۔

وجعل القمر فیھن نوراً وجعل الشمس سراجاًo (سورہ نوح آیت نمبر ۱۶)

''اور (اللہ نے) چاند کو روشنی حاصل کرنے کا ذریعہ بنایا اور سورج کو ان (آسمانوں) کے درمیان چراغ کی حیثیت سے بنایا''۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ سورج کو روشن چراغ قرار دیتا ہے اور چاند کو روشنی حاصل کرنے کا ذریعہ۔ اس میں یہ نکتہ ہے کہ چراغ کسی دوسرے کی روشنی سے روشن نہیں ہوتا بلکہ اپنی ذات میں روشن ہوتا ہے۔ اس کی روشنی ذاتی ہوتی ہے لیکن اگر اس کے سامنے ایک آئینہ رکھ دیا جائے تو اس پر چراغ سے جو روشنی منعکس ہو کر ارد گرد کی اشیاء پر پڑے گی وہ آئینے کی اپنی روشنی نہیں ہوگی بلکہ چراغ کی روشنی ہوگی۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اسی طرح سورج اپنی ذات سے روشن ہے اور چاند اس سے روشنی حاصل کر کے روشن ہوتا اور زمین پر یہ روشنی منعکس کرتا ہے۔ یہ روشنی اس کی ذاتی روشنی نہیں ہوتی بلکہ وہ یہ روشنی سورج سے حاصل کر کے ہم تک پہنچانے کا ذریعہ ہے۔

زمین کی گردش کا نظریہ

زمین کے متحرک یا ساکن ہونے کے بارے میں صدیوں تک بحث جاری رہی۔ یونان کے مشہور مفکر اور ماہر علم الافلاک بطلیموس (Ptolemaeos) کا نظریہ تھا کہ زمین ساکن ہے اور سورج اس کے گرد گردش کرتا رہتا ہے۔ تمام یورپ ایک ہزار سال تک اس نظریئے کو درست قرار دیتا رہا اور مغرب کے بڑے بڑے فلاسفروں اور مفکروں نے اس

نظریے کی تصدیق کی۔ دوسرا نظریہ مفکر ارشمیدس (Archimedes) نے پیش کیا جسے ارسطار قیس کا نظریہ بھی قرار دیا جاتا ہے۔اس مفکر کا خیال تھا کہ زمین ساکن نہیں بلکہ متحرک ہے۔ آیئے دیکھیں اللہ تعالیٰ نے سائنس کے اس مسئلے کے بارے میں بنی نوع انسان کی کوئی رہنمائی فرمائی یا نہیں؟ قرآن حکیم میں کم از کم تین مقامات پر اس مسئلے کے بارے میں اظہار خیال کیا گیا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ:۔

وتری الجبال تحسبها جامدة وهی تمر مر السحاب ط (سورہ النمل آیت نمبر ۸۸)

''اور تو پہاڑوں کو دیکھ رہا ہے اور سمجھ رہا ہے کہ یہ اپنی جگہ پر قائم ہیں اور حرکت نہیں کر رہے حالانکہ وہ بادلوں کی طرح متحرک ہیں''۔

ہر شخص جانتا ہے کہ پہاڑ بادلوں کی طرح حرکت نہیں کرتے بلکہ وہ تو اپنی جگہ ساکت و جامد ہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے کیوں فرمایا کہ وہ بادلوں کی طرح متحرک ہیں؟ دراصل یہ زمین کی گردش کی طرف واضح اشارہ ہے چونکہ زمین گردش کر رہی ہے اس لئے اس میں موجود پہاڑ بھی گھوم رہے ہیں۔ اسی آیت میں آگے چل کر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ:۔

صنع اللّٰہ الذی اتقن کل شیءٍ

''یہ خدا کی صنعت گری ہے کہ جس نے ہر شے کو (مناسب انداز پر) مضبوط بنا رکھا ہے''۔

آیت کے اس دوسرے حصے نے ہمارے اس نظریے کی تائید کر دی کہ مندرجہ بالا آیت کے پہلے حصے میں زمین کی گردش کی طرف واضح اشارا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ آیت کے اس دوسرے حصے میں فرماتا ہے کہ زمین کے حرکت کرنے کے باوجود پہاڑ اپنی جگہ پر قائم ہیں۔ یہ اس کی صنعت گری کا کامل نمونہ ہے کہ اس نے پہاڑوں کو اتنا مضبوط بنایا ہے کہ زمین کی گردش کا ان پر قطعاً کوئی اثر نہیں ہوتا اور وہ اپنی جگہ نہایت استحکام سے کھڑے ہوئے ہیں۔ تیسرا مقام وہ ہے جہاں قرآن حکیم نہایت صاف اور واضح الفاظ میں زمین کی گردش کا نظریہ بیان فرماتا ہے چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:۔

نظریے کی تصدیق کی۔ دوسرا نظریہ مفکر ارشمیدس (Archimedes) نے پیش کیا جسے ارسطارقیس کا نظریہ بھی قرار دیا جاتا ہے۔ اس مفکر کا خیال تھا کہ زمین ساکن نہیں بلکہ متحرک ہے۔ آیئے دیکھیں اللہ تعالیٰ نے سائنس کے اس مسئلے کے بارے میں بنی نوع انسان کی کوئی رہنمائی فرمائی یا نہیں؟ قرآن حکیم میں کم از کم تین مقامات پر اس مسئلے کے بارے میں اظہار خیال کیا گیا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ:۔

وتری الجبال تحسبھا جامدۃ وھی تمر مر السحاب ط (سورہ النمل آیت نمبر ۸۸)

''اور تو پہاڑوں کو دیکھ رہا ہے اور سمجھ رہا ہے کہ یہ اپنی جگہ پر قائم ہیں اور حرکت نہیں کر رہے حالانکہ وہ بادلوں کی طرح متحرک ہیں''۔

ہر شخص جانتا ہے کہ پہاڑ بادلوں کی طرح حرکت نہیں کرتے بلکہ وہ تو اپنی جگہ ساکت و جامد ہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے کیوں فرمایا کہ وہ بادلوں کی طرح متحرک ہیں؟ دراصل یہ زمین کی گردش کی طرف واضح اشارہ ہے چونکہ زمین گردش کر رہی ہے اس لئے اس میں موجود پہاڑ بھی گھوم رہے ہیں۔ اسی آیت میں آگے چل کر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ:۔

صنع اللہ الذی اتقن کل شیء

''یہ خدا کی صنعت گری ہے کہ جس نے ہر شے کو (مناسب انداز پر) مضبوط بنا رکھا ہے''۔

آیت کے اس دوسرے حصے نے ہمارے اس نظریے کی تائید کر دی کہ مندرجہ بالا آیت کے پہلے حصے میں زمین کی گردش کی طرف واضح اشارا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ آیت کے اس دوسرے حصے میں فرماتا ہے کہ زمین کے حرکت کرنے کے باوجود پہاڑ اپنی جگہ پر قائم ہیں۔ یہ اس کی صنعت گری کا کامل نمونہ ہے کہ اس نے پہاڑوں کو اتنا مضبوط بنایا ہے کہ زمین کی گردش کا ان پر قطعاً کوئی اثر نہیں ہوتا اور وہ اپنی جگہ نہایت استحکام سے کھڑے ہوئے ہیں۔ تیسرا مقام وہ ہے جہاں قرآن حکیم نہایت صاف اور واضح الفاظ میں زمین کی گردش کا نظریہ بیان فرماتا ہے چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:۔

ء امنتم من فی السماء ان یخسف بکم الارض فاذا ھی تمور (سورہ الملک آیت نمبر ۱۶) ''کیا تم اس (ہستی) سے بے خوف ہو گئے کہ وہ تم کو زمین میں دھنسا دے اور (تم دیکھتے ہو کہ) وہ (زمین) چکر لگا رہی ہے''۔

اس طرح قرآن حکیم نے گذشتہ سائنس دانوں کے درمیان اختلاف کا قطعی فیصلہ فرما دیا اور آنے والے سائنس دانوں کے لئے بھی ابدی روشنی مہیا فرما دی اور انہیں بتا دیا کہ تم جتنی بار چاہو غور وفکر اور تحقیق کرو اور جتنے چاہو نظریات قائم کرو اور تبدیل کرو، حقیقت یہ ہے کہ زمین گردش کر رہی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ پیش گوئی بھی فرما دی کہ نظامِ شمسی کی یہی کشش اور اس کی گردش ایک دن (جب وقتِ موعود آ جائے گا) اس کائنات کی تباہی کا باعث ہوگی۔ یہ ایک الگ بحث ہے اور سائنس دانوں نے اب یہ نظریہ پیش کیا ہے کہ نظام شمسی فنا کی طرف حرکت کر رہا ہے اور چند کروڑ سال کے بعد یہ سب تہس نہس ہو جائے گا۔ یہ مدت سائنس دانوں نے مقرر کی ہے جن کے اندازے تبدیل ہوتے رہتے ہیں، اصل مدت اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے۔

زمین کا جھکاؤ

ماہرین ارضیات نے اب یہ نظریہ پیش کیا ہے کہ زمین اپنے مدار میں عمودی حالت میں گردش نہیں کر رہی یعنی بالکل سیدھی نہیں ہے بلکہ ایک جانب ۲۳ ڈگری جھکی ہوئی ہے۔ سائنس کہتی ہے کہ زمین کے اسی جھکاؤ کی وجہ سے موسموں میں تغیر وتبدل ہوتا ہے۔ فصلیں پکتی ہیں اور ہم رزق حاصل کرتے ہیں مگر قرآن حکیم نے آج سے چودہ سو سال قبل سب سے پہلے یہ سائنسی نکتہ بیان فرما دیا:۔

ھوالذی جعل لکم الارض ذلولا (سورہ الملک آیت نمبر ۱۵) ''وہی (اللہ) ہے جس نے زمین کو جھکا ہوا بنایا''۔

اس آیت کریمہ میں جھکاؤ کے لئے لفظ ''ذلولاً'' استعمال ہوا ہے۔ علم لغات القرآن کے سب سے بڑے عالم حضرت امام راغبؒ اصفہانی نے اپنی شہرہ آفاق کتاب

''مفردات'' میں ذَلولاً کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ الذل۔ یہ ذل یذل کا مصدر ہے اور ذل خود بخود جھکنے کو نہیں کہتے بلکہ طاقت اور جبر سے جھکنا ذل کہلاتا ہے۔ (مفردات امام راغب ؒ اصفہانی)

ان معنی کی رو سے ثابت ہو گیا کہ زمین ایک طرف جھکی ہوئی ہے۔ عجیب تر بات یہ ہے کہ سائنس کہتی ہے کہ زمین کا یہ جھکاؤ سورج کی زبردست کشش کی وجہ سے ہے یعنی وہ اسے اس کی اپنی قوت کی وجہ سے سیدھا ہونے اور سر اٹھا کر نہیں چلنے دیتا بلکہ اس پر دباؤ ڈال کر اسے جھکائے رکھتا ہے۔ قرآن آج سے چودہ سو سال پہلے یہ نکتہ بیان کر چکا ہے کہ زمین ''ذلولاً'' ہے یعنی یہ ایک طرف کو جھکی ہوئی ہے مگر خود بخود جھکی ہوئی نہیں ہے بلکہ اسے زور اور قوت سے جھکایا گیا ہے۔ یہ حقیقت اب منکشف ہوئی کہ وہ زور اور طاقت سورج کی ہے۔

پھر سائنس نے اب یہ انکشاف کیا ہے کہ اگر زمین ایک طرف کو جھکی ہوئی نہ ہوتی بلکہ سیدھی ہوتی تو نہ موسموں کا تغیر و تبدل ہو سکتا تھا اور نہ فصلیں پک سکتی تھیں مگر قرآن حکیم آج سے چودہ سو سال قبل اسی آیت میں آگے چل کر فرماتا ہے:۔

وکلوا من رزقه ط ''اور اس میں سے اپنا رزق حاصل کرو''۔

یعنی ہم نے تمہارے لئے زمین کو ایک جانب جھکا ہوا اس لئے بنایا ہے تاکہ موسموں میں تغیر و تبدل ہوتا رہے، سورج کی تمازت اور چاند کی روشنی سے اس میں فصلیں اُگیں، وہ پکیں اور ان میں حسب ضرورت (مثلاً پھلوں میں) شیرینی پیدا ہو اور تم اس (زمین) میں سے اپنا رزق حاصل کر سکو یعنی اگر ہم زمین کو ایک جانب جھکا ہوا نہ بناتے تو تمہارے لئے زمین پر زندگی گزارنا ناممکن ہو جاتا۔ سائنس کا کتنا بڑا راز ہے جس پر سے صرف اور صرف قرآن حکیم نے آج سے چودہ سو سال قبل پردہ اٹھایا جب مغرب جہالت کی تاریکیوں میں ڈوبا ہوا تھا۔

زمین کی کشش کا نظریہ

کشش ثقل کا نظریہ زیادہ پرانا نہیں۔ یونانی ہیئت دانوں میں سے کوئی تجرباتی

طور پر اس نظریئے سے واقف نہ تھا۔ قریباً تین صدی قبل اٹلی کے مشہور سائنس دان گیلیلیو نے سب سے پہلے تجربات کر کے یہ نظریہ پیش کیا۔ انگریز سائنس دان آئزک نیوٹن نے اس کی مزید تشریح کی اور سیب کو درخت سے ٹوٹ کر آسمان کی طرف جانے کی بجائے زمین پر گرتا دیکھ کر یہ نتیجہ نکالا کہ زمین میں ہر چیز کو اپنی طرف کھینچنے کی قوت ہے۔ سائنس داں کہتے ہیں کہ اسی قوت کی وجہ سے چاند زمین کے چاروں طرف گردش کرنے پر مجبور ہے۔ نیوٹن کے نظریہ پر آئن سٹائن نے اپنے نظریہ اضافت کی بنیاد رکھی اور یہ نظریہ پیش کیا کہ کشش کی یہ قوت صرف زمین میں نہیں بلکہ ساری کائنات میں پائی جاتی ہے۔ اس قوت یا کیفیت کو وہ "Curve" کے لفظ سے موسوم کرتا ہے۔ سائنس کہتی ہے کہ اسی کشش کی وجہ سے سورج زمین کو اپنے دائرے سے باہر نہیں نکلنے دیتا۔ بہر حال یہ سارے نظریات گزشتہ تین سو سال میں منظر عام پر آئے۔ اس سے پہلے زمین یا سورج کی کشش سے عرب میں کوئی واقف نہ تھا مگر قرآن حکیم میں بنی نوع انسان پر آج سے چودہ سو سال قبل یہ سائنسی راز منکشف فرما دیا گیا تھا چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

یغشی الیل النھار یطلبہ حثیثاo (سورہ الاعراف آیت نمبر ۵۴)	''وہ (اللہ) رات کو دن پر ڈھانپ دیتا ہے جو کوشش کرتی ہے کہ اسے تیزی سے جا پکڑے''۔

حضرت علیؓ کا نظریہ کشش

اس آیت میں اللہ تعالیٰ یہ نکتہ بیان فرماتا ہے کہ رات دن کو تیزی سے پکڑنے یعنی اپنی طرف کھینچنے کی کوشش کرتی ہے گویا زمین سورج کو اپنی طرح کھینچتی ہے اور سورج زمین کو اپنی طرف کھینچتا ہے اس کائنات میں یہ عمل مسلسل جاری ہے۔ سیدنا علی مرتضیٰؓ نے جو حضور نبی کریمؐ کے شاگردِ خاص تھے اور جنہیں قرآن حکیم کی معرفت کے اسرار و رموز سمجھنے اور بیان کرنے میں کمال حاصل تھا یقیناً اسی آیت پر غور و فکر کرنے کے بعد یہ نظریہ قائم کیا کہ نہ صرف زمین، چاند اور سورج میں بلکہ نظام شمسی کے ہر سیارے میں کشش پائی جاتی ہے

چنانچہ ایک موقع پر جب آپؑ اپنے لشکر میں اموال تقسیم فرما رہے تھے بعض لوگوں نے اپنے لئے ترجیحی سلوک کی درخواست کی تو آپؑ نے انہیں مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

واللہ لا اطور بہ ماسَمَرَ سمیر وما ام نجم فی السماء نجماo

یعنی ''خدا گواہ ہے کہ میں ہرگز ایسا نہ کروں گا جب تک زمانے کی کہانی جاری ہے اور آسمان میں ایک ستارہ دوسرے ستارے کو اپنی طرف کھینچ رہا ہے''۔ (نہج البلاغہ جلد اول ص ۳۸۹ و ۳۹۰ مطبوعہ تہران، زمستان ۱۳۶۸)

حالانکہ جب حضرت علیؑ نے سائنس کا یہ نکتہ بیان کیا تو اہل عرب اس سے بالکل واقف نہ تھے۔ اس لئے تسلیم کرنا پڑے گا کہ حضرت علیؑ کے افکار کا ماخذ قرآن حکیم کی یہی آیت تھی اور آپؑ نے بھی اس کے وہی معنی سمجھے تھے جو ہم نے بیان کئے ہیں یعنی نظام شمسی کے سیاروں میں کشش کا مادہ ہے اور اسی کشش کی وجہ سے اس کائنات کا نظام قائم ہے۔

قرآن حکیم میں کشش کا تصور بلاشبہ موجود تھا مگر اس تک رسائی سب سے پہلے حضرت علیؑ کو نصیب ہوئی اور آپؑ نے ایک فلسفے کے طور پر یہ نظریہ پیش کر کے آنے والے سائنس دانوں کو اس طرف متوجہ کیا۔ اس طرح آپؑ نے سب سے پہلے سائنسی حقیقت کی طرف دنیا کی رہنمائی فرمائی یہ حضرت علیؑ کا بہت بڑا علمی اور سائنسی کارنامہ ہے۔

نظریہ حرکت وتوازن

ایک عجیب بات یہ ہے کہ جب ہم سیدنا علیؑ کے خطبات کا مزید جائزہ لیتے ہیں تو یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ علیؑ مرتضیٰ مسلمان مفکرین میں وہ پہلے مفکر اور سائنس دان ہیں جنہوں نے زمین کی حرکت وتوازن کا نظریہ پیش کیا چنانچہ آپؑ فرماتے ہیں کہ:

وحمل شواھق الجبال الشمخ البذخ علی اکنافھا فجر ینابیع العیون من

(حضرت علیؑ کے اس ارشاد کا خلاصہ جو ہمارے موضوع سے تعلق رکھتا ہے یہ ہے کہ) ''اللہ وہ بزرگ و برتر ہستی ہے جس نے

عرانین انوفھا، وترقھا فی سحصوب ویدھا واخا بیدھا، وعدل حرکاتھا بالراسیات من جلامیدھا وذوات الشنا خیب الشم من صیا خیدھا (نہج البلاغہ جلد اول صفحہ ۲۵۸ مطبوعہ تہران)

زمین کے مختلف گوشوں میں پہاڑ نصب فرمائے۔ان پہاڑوں کی سختی، بوجھ اور بلندی کی وجہ سے زمین کی گردش میں اعتدال پیدا ہو گیا اور زمین کے نشیب و فراز میں ان پہاڑوں کے قائم ہو جانے سے زمین کا توازن خراب ہونے سے بچ گیا"۔

حضرت علیؓ کے ان الفاظ کا مفہوم بالکل واضح ہے کہ زمین متحرک ہے یعنی گردش کررہی ہے۔اللہ تعالیٰ نے اس کے مختلف حصوں میں پہاڑوں کو نصب فرما دیا تا کہ اس کی حرکت یا گردش میں اعتدال قائم رہے اور اس کا توازن بگڑنے نہ پائے بلاشبہ حضرت علیؓ کے اس سائنسی نظریئے کا مآخذ قرآن حکیم کی مندرجہ ذیل آیت ہے:

وتری الجبال تحسبھا جامدة وھی مر السحاب ط (سورہ النمل آیت نمبر ۸۸)

"اور تو پہاڑوں کو دیکھ رہا ہے اور سمجھ رہا ہے کہ یہ اپنی جگہ پر قائم ہیں حالانکہ وہ بادلوں کی طرح متحرک ہیں"۔

جیسا کہ ہم قبل ازیں عرض کر چکے ہیں کہ پہاڑ بادلوں کی طرح حرکت نہیں کرتے بلکہ وہ اپنی جگہ ساکت و جامد ہیں پھر اللہ تعالیٰ نے یہ کیوں فرمایا کہ وہ بادلوں کی طرح متحرک ہیں؟ دراصل یہ زمین کی حرکت و گردش کی طرف واضح اشارہ ہے۔چونکہ زمین گردش کررہی ہے اس لئے اس میں موجود پہاڑ بھی گھوم رہے ہیں۔اسی آیت میں آگے چل کر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

صنع اللہ الذی اتقن کل شئی ط

"یہ خدا کی صنعت گری ہے کہ جس نے ہر شے کو (مناسب انداز) میں مضبوط بنا رکھا ہے"۔

آیت کے اس دوسرے حصے نے ہمارے اس خیال کی تائید کر دی کہ مندرجہ بالا آیت کے پہلے حصے میں زمین کی گردش کا نظریہ بیان کیا گیا ہے کیونکہ آیت کے اس

دوسرے حصے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ زمین کے حرکت کرنے کے باوجود پہاڑ اپنی جگہ پر قائم ہیں۔ یہ اس کی صنعت گری کا کامل نمونہ ہے کہ اس نے پہاڑوں کو اتنا مضبوط بنایا ہے کہ زمین کی گردش کا ان پر قطعاً کوئی اثر نہیں ہوتا اور وہ اپنی جگہ نہایت استحکام سے کھڑے ہوئے ہیں۔

قرآن حکیم کی حکیمانہ آیات اور سیدنا علیؓ کے بلیغ ارشادات پر غور کرنے سے ثابت ہو جاتا ہے کہ قرآن مجید صرف احکام اور مسائل کا مجموعہ نہیں بلکہ اس میں بنی نوع انسان کی دنیاوی اور علمی رہنمائی کے لئے واضح ارشادات بھی موجود ہیں اور یہ دنیاوی علوم کا اصل اور ماخذ ہے۔ یہ قرآن حکیم کی عظمت اور صداقت کا بین ثبوت ہے۔

ذرات کی لہریں

سائنس دان کہتے ہیں کہ آسمان سے زمین کی طرف لاتعداد لہریں آتی ہیں اور زمین میں داخل ہو جاتی ہیں۔ اسی طرح زمین سے بے شمار لہریں اٹھتی ہیں اور آسمان کی طرف چلی جاتی ہیں۔ اگر کیمرہ ان لہروں کی تصویریں لینے پر قادر ہوتا تو دیکھنے والے دیکھ سکتے کہ لاکھوں کروڑوں رسّے ہیں جن سے زمین اور آسمان آپس میں بندھے ہوئے ہیں اس نکتے کو سب سے پہلے قرآن حکیم نے بیان کیا چنانچہ فرمایا کہ:۔

یعلم مایلج فی الارض وما یخرج منها وما ینزل من السمآء وما یعرج فیها ط (سورہ سبا آیت نمبر ۲)

"وہ (اللہ) جو کچھ زمین میں داخل ہوتا ہے اسے بھی جانتا ہے اور جو اس میں سے نکلتا ہے اسے بھی جانتا ہے اور جو آسمان سے اترتا ہے اسے بھی جانتا ہے اور جو آسمان کی طرف چڑھتا ہے اسے بھی جانتا ہے"۔

اس سے قبل کی آیت میں فرماتا ہے کہ **وھو الحکیم الخبیر** یعنی وہ بہت ہی باخبر اور صاحب حکمت ہے۔ ان الفاظ نے فیصلہ کر دیا کہ جو چیزیں زمین سے آسمان کی طرف جاتی ہیں اور جو آسمان سے اتر کر زمین میں داخل ہوتی ہیں ان میں اللہ تعالیٰ نے بڑی

حکمت رکھی ہے۔ وہ حکمت یہی ہے کہ زمین سے نکلنے والے ذرات کی لہریں اور آسمان سے آنے والی روشنی اور اس کے ساتھ ذرات کی لہریں کرۂ ارض اور نظام شمسی کے کروں کو آپس میں مربوط رکھتی ہیں۔ یہ نظام اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت کاملہ کے تحت مقرر فرمایا ہے یہ کسی اندھے مادے کی اتفاقی حرکت یا حادثاتی عمل نہیں ہے۔

ایٹم کا نظریہ

سائنس دانوں نے ایٹم کو توڑ کر ایک ایسا عظیم الشان کارنامہ سرانجام دیا ہے کہ اگر اسے تعمیری مقاصد کے لیے استعمال کیا جائے تو روز افزوں آبادی کے بے شمار معاشی و معاشرتی مسائل حل ہو سکتے ہیں اور بلاشبہ سائنس دان اپنے اس کارنامے پر قیامت تک پیدا ہونے والی انسانی نسلوں سے خراج تحسین وصول کرتے رہیں گے مگر قرآن حکیم نے آج سے چودہ سو سال قبل ذرات کو ایک سائنسی علم کی حیثیت سے پیش کیا اور سائنس دانوں کی رہنمائی کرتے ہوئے فرمایا کہ:۔

لایعزب عنہ مثقال ذرۃ فی السموٰت ولا فی الارض ولا اصغر من ذٰلك ولا اکبر الا فی کتٰب مبین o (سورہ سبا آیت نمبر۳)

''آسمانوں اور زمین میں کوئی چیز اللہ تعالیٰ کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں ہے خواہ وہ ایک ذرہ کے برابر وزن یا حجم کی ہو یا اس سے بھی چھوٹی ہو یا اس سے بھی بڑی مگر وہ کھلی کتاب میں مرقوم ہے''۔

یہاں اللہ تعالیٰ ''ذرہ'' کا لفظ استعمال فرماتا ہے اور پھر اس کے وزن کے لئے صغیر کا لفظ استعمال نہیں فرماتا جس کے معنی چھوٹے کے ہیں بلکہ ''اصغر'' کا لفظ استعمال فرماتا ہے یعنی چھوٹے سے چھوٹا ذرہ۔

اس میں واضح اشارا ہے اس امر کی طرف کہ ذرے کو توڑا جا سکتا ہے اور اسے توڑتے توڑتے اتنا چھوٹا کیا جا سکتا ہے کہ اس سے چھوٹا ہونا ممکن ہی نہ ہو۔ جب یہ ذرہ اپنی جسامت کا قلیل ترین حصہ رہ جائے گا تو اس میں اتنی قوت پیدا ہو جائے گی کہ وہ ایک طرف

تو نا قابل یقین حد تک توانائی کا منبع ثابت ہوگا اور دوسری طرف بستیوں کی بستیاں تباہ کر دے گا چنانچہ اسی آیت میں اللہ تعالیٰ کفار کے یہ الفاظ دہراتا ہے کہ ''ہم پر کبھی قیامت نہیں آئے گی'' (لاتاتینا الساعتہ ط)۔ اللہ تعالیٰ اس کا جواب دیتا ہے کہ آئے گی اور ضرور آئے گی۔ اس کی ایک صورت یہ قرار دیتا ہے کہ تم اپنے ہاتھ سے ذرے کو توڑو گے اور اسے توڑ توڑ کر اتنا چھوٹا کر لو گے کہ اس کا جو قلیل ترین حصہ رہ جائے گا وہ زبردست قوت کا سرچشمہ ہو گا جس سے تم خوفناک اور تباہ کن اسلحہ تیار کرو گے اور وہی تمہاری ہلاکت اور بربادی کا سبب بن جائے گا جو قیامت کا منظر ہوگا چنانچہ اب وہ وقت زیادہ دور نہیں۔

سائنسی نظریات کا تضاد

اس کائنات کی تخلیق کا آغاز کب ہوا؟ سائنس دانوں نے اس سلسلے میں بڑی تلاش و تحقیق کی ہے اور اس سوال کا جواب تلاش کرنے اور اس عقدے کو حل کرنے کے لئے اپنی بہترین صلاحیتیں صرف کر دیں لیکن اس کے باوجود وہ کسی قطعی نتیجے پر پہنچنے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ حال کی تحقیق یہ ہے کہ تیس کروڑ سال ہوئے کہ ستاروں اور سیاروں نے جن میں ہماری زمین بھی شامل ہے رقیق مادے سے منجمد اور ٹھوس شکل اختیار کی —— لیکن کیا مدت کی یہ تحقیق قطعی اور آخری ہے اور اس میں مزید ترمیم نہیں ہو گی؟ اس کی کوئی ضمانت نہیں دی جا سکتی۔ صرف تخلیقِ کائنات کے آغاز ہی پر منحصر نہیں سائنس کے بہت سے نظریات ایک دوسرے سے مختلف تھے اور بعض کو تو خود سائنس دانوں نے مضحکہ خیز قرار دیا۔

مریخ پر زندگی

زیادہ مدت نہیں گزری کہ امریکہ کے ایک ماہر علم فلکیات نے مریخ کے مطالعہ اور مشاہدہ کے بعد انکشاف کیا کہ مریخ پر جاندار مخلوق موجود ہے۔ یہ لوگ نہایت متمدن اور ترقی یافتہ ہیں اور بہت اعلیٰ درجے کی تہذیب کے حامل ہیں۔ علم الافلاک کے اس ماہر کا نام ''پرسیول لویل'' (Percival Lowell) ہے۔ اس نے دریافت کیا کہ مریخ کی زندگی کا دور ختم ہونے والا ہے اور پانی کی کمی ہوتی جا رہی ہے اس لئے وہاں کی مخلوق نے نہریں کھود

کر پانی کو محفوظ کر لیا ہے ان نہروں کے ذریعے پانی کو بڑے بڑے ذخیروں کی صورت میں جمع کیا جارہا ہے ان نہروں کے کنارے باغات بھی ہیں مریخ پر جو نارنجی رنگ نظر آتا ہے یہ دراصل انہی باغات اور سبزہ زاروں کا عکس ہے۔ لویل نے بتایا کہ مریخ کے نصف حصے کی برف جب پگھلنے لگتی ہے اس وقت وہاں کے لوگ یہ پانی پمپوں کے ذریعے ان حصوں میں لے جاتے ہیں جو خشک ہو رہے ہیں اور خطِ استوا کے قریب واقع ہیں اس طرح ان علاقوں کو سیراب کرتے ہیں۔

امریکہ ہی کا ایک دانشور جارج گیمو (George Gamow) اپنی کتاب ''بائیوگرافی آف دی ارتھ'' (Biography of the Earth) میں مریخ کے متعلق ''یہ تحقیقی'' روداد بیان کرنے کے بعد اسے بالکل بے سروپا قرار دیتا ہے وہ لکھتا ہے کہ یہ سب محض سراب ہے۔ نہایت طاقت ور دوربینوں اور کیمروں کے ذریعے مریخ کا مطالعہ و مشاہدہ کیا گیا جس کے بعد معلوم ہوا کہ لویل کے ان انکشافات میں قطعاً حقیقت نہیں ہم یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتے کہ مریخ پر زندگی ہے یا نہیں۔

مقناطیسی کشش

یہی مصنف مقناطیس اور زمین کے تعلق پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ مقناطیس زیادہ درجہ حرارت پر پہنچ کر اپنی مقناطیسیت سے محروم ہو جاتا ہے لیکن حیرت ہے کہ زمین کے مرکزی حصے میں جہاں درجۂ حرارت بہت زیادہ ہے مقناطیس کی یہ قوت اور کشش برقرار رہتی ہے۔ ایسا کیوں ہے سائنس اس کا کوئی جواب نہیں دیتی۔ بعض سائنس دان کہتے ہیں کہ ہماری زمین میں کوئی ایسا مادہ موجود نہیں جسے مستقل مقناطیس کہا جائے بلکہ یہ خاصیت ایک برقی رو کے زمین میں دوڑنے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ برقی رو زمین کی مقناطیسیت کو قائم و برقرار رکھتی ہے مگر یہ برقی رو کیسے اور کہاں پیدا ہوتی ہے؟ سائنس داں اپنے تمام مشاہدات اور تجربے کے باوجود اس کا کوئی جواب نہیں دے سکے۔

زمین کے آغازِ تخلیق کے بارے میں تضاد

زمین کس طرح تخلیق ہوئی؟ یہ علم الافلاک اور علم طبقات الارض دونوں کا بنیادی سوال ہے مگر اس مسئلے کے بارے میں بھی سائنس دانوں میں زبردست اختلافات رہ چکے ہیں۔ مثال کے طور پر آج سے قریباً ڈھائی سو سال قبل فرانس کے ممتاز محقق مسٹر جرجیس لوئی بفن نے نظامِ شمسی کے آغاز کے بارے میں طویل اور عالمانہ تحقیق کی۔ ان کی تحقیق کا حاصل یہ ہے کہ بہت طویل مدت ہوئی کہ ایک دُم دار سیارہ سورج کے پاس سے گزرتے ہوئے اس سے ٹکرا گیا جس کے نتیجے میں اس دُم دار سیارے اور سورج دونوں سے زبردست شعلے پیدا ہوئے۔ یہ شعلے منجمد ہو کر سیاروں کی صورت اختیار کر گئے اور سورج کے گرد گھومنے لگے، انہی میں سے ایک ہماری زمین ہے۔ اس نظریئے پر ایک صدی بھی نہ گزری تھی کہ فرانس کے ایک ممتاز محقق اور ماہر علم ریاضی "پائیر لیپ لیس" (Pierre Laplace) نے اس نظریئے کی سختی سے تردید کی اور اپنی تحقیق پیش کرتے ہوئے کہا کہ آفتاب کی سطح پر خود بخود ایک زبردست دھماکہ ہوا جس کے نتیجے میں کثیر تعداد میں بہت سا مادہ سورج کی سطح سے اُچھل کر باہر جا پڑا۔ یہ مادہ سورج کے چاروں طرف گردش کرنے لگا۔ اس دوران میں یہ ٹکڑے آپس میں ایک دوسرے سے پیوست ہونے لگے اور اس طرح بہت سے سیارے معرض وجود میں آ گئے جو آج تک سورج کے گرد گردش کر رہے ہیں ان میں ہماری زمین بھی شامل ہے یعنی "پائیر لیپ لیس" بفن کے اس نظریے کو قبول نہیں کرتا کہ سورج سے کوئی دم دار سیارہ ٹکرایا اور اس کے نتیجے میں ہماری زمین اور دوسرے کرے معرض وجود میں آئے بلکہ اس کے خیال میں سورج کے اندرونی جوش کے نتیجے میں سیال مادہ اس سے باہر نکل پڑا جس سے زمین اور دوسرے سیارے پیدا ہو گئے۔

لیپ لیس کے اس نظریہ پر ایک صدی سے کچھ زیادہ مدت گزری تھی کہ اس کی تحقیق پر بھی سخت تنقید شروع ہو گئی اور امریکہ کے ایک محقق "فوریسٹ آر مولٹن" اور دوسرے سائنس دانوں "ٹومس سی چیمبر لین" (Thomas C. Chamberlin) نے

بفن کے قدیم نظریئے کی بہت حد تک تائید کی مگر اس کی تحقیق کے اس حصے کو رد کر دیا کہ سورج اور دم دار سیارے میں تصادم ہوا بلکہ یہ نظریہ پیش کیا کہ تصادم نہیں ہوا بلکہ ایک آوارہ سیارہ سورج کے قریب سے گزرا جو مدار نہیں تھا۔ ان دونوں سیاروں یعنی سورج اور اس آوارہ سیارہ کی باہمی کشش کے نتیجے میں سورج کی سطح پر زبردست طوفان آیا اور طوفانی لہروں نے اس کی سطح سے آتشیں مادہ باہر کی جانب پھینکنا شروع کر دیا یہ مادہ سورج کے چاروں طرف گردش کرنے لگا ہماری زمین اسی مادے کے ٹھنڈے اور منجمد ہونے سے وجود میں آئی۔

اس حادثے کی مدت کے بارے میں بھی سائنس داں کسی ایک نظریئے پر متفق نہیں ہو سکے۔ پہلا نظریہ یہ ہے کہ سورج اور آوارہ سیارے کے تصادم پر دس ارب سال گزر چکے ہیں۔ موجودہ تحقیق یہ ہے کہ دس ارب نہیں بلکہ صرف تیس کروڑ سال قبل یہ حادثہ رونما ہوا تھا۔ دس ارب اور تیس کروڑ میں معمولی فرق نہیں بلکہ کروڑوں اور اربوں کا فرق ہے۔

چاند کے بارے میں سائنس کے متضاد نظریات

زمین کے آغازِ تخلیق کی طرح چاند کی تخلیق کے مسئلے پر بھی سائنس داں کسی ایک نظریئے پر متفق نہیں مثلاً ایک نظریہ یہ تھا کہ زمین جب پگھلے ہوئے مادے کی صورت میں سورج کے گرد گردش کر رہی تھی تو سورج اور زمین دونوں کی کشش نے زمین پر دباؤ ڈالا اور اس دباؤ کے نتیجے میں زمین سے بہت سا آتشیں مادہ نکل کر اس سے باہر جا پڑا۔ یہ مادہ ٹھنڈا ہو کر منجمد ہو گیا اور چاند کہلایا۔ دوسرا نظریہ یہ پیش کیا گیا کہ جب زمین سورج کے گرد گردش کر رہی تھی تو اس کی اور سورج کی کشش کی وجہ سے زمین کا ایک حصہ پچک کر ناشپاتی کی صورت اختیار کر گیا اور اس پر ایک ابھار سا پیدا ہو گیا۔ پھر اس ابھار میں ایک اور تبدیلی پیدا ہوئی اور اس کا ایک حصہ دوسرے سے بڑا ہو گیا۔ کچھ مدت کے بعد یہ بڑھا ہوا حصہ زمین سے الگ ہو کر فضا میں تیرنے لگا یہی چاند ہے۔ کیمرج یونیورسٹی کے پروفیسر ہیرولڈ (Professor Harold) نے اس سے بالکل مختلف نظریہ پیش کیا۔ ان کے خیال میں چاند کا زمین سے کوئی تعلق نہیں۔ ان کی تحقیق یہ ہے کہ جب ایک آوارہ سیارے کا سورج سے تصادم ہوا اور

اس وقت جو مادے سورج سے الگ ہو کر اس کے چاروں طرف منتشر ہو گئے جنہوں نے مختلف کروں کی صورت اختیار کر لی انہی میں سے ایک چاند بھی ہے یعنی وہ چاند کو زمین کا حصہ قرار نہیں دیتے۔ ایک نظریہ ان سارے نظریات سے مختلف پیش کیا گیا اور وہ یہ کہ عین ممکن ہے کہ چاند کا ابتدا ہی سے اپنا ایک مستقل وجود ہو اور وہ کسی ایسی جگہ پر واقع ہو اور اس کی رفتار اتنی تیز ہو کہ وہ زمین پر گرنے سے محفوظ رہا۔ (۳)

سائنس دانوں میں اس کائنات کی تخلیق کے بارے میں جو اختلافات پائے جاتے ہیں ان کی یہ ایک معمولی سی جھلک ہے۔ ان اختلافات کی نشاندہی کا مقصد سائنس دانوں کی تحقیق کا مضحکہ اڑانا یا انہیں نا قابل اعتبار قرار دینا ہرگز نہیں ہم ان کی تلاش و تحقیق، ان کی جاں فشانی اور ان کے افکار کی عظمت کا اعتراف کرتے ہیں، انہوں نے دنیا کو بہت کچھ دیا، ان کے عظیم الشان کارناموں نے دنیا میں فکری اور عملی انقلاب برپا کر دیا اور ہماری آنکھیں کھول دیں لیکن ان کی اس تمام کد و کاوش اور طویل تحقیق کو غلطیوں سے مبرا قرار نہیں دیا جا سکتا اور نہ ان کی تحقیق کے ہر نتیجے کو آنکھ بند کر کے قبول کیا جا سکتا ہے کیونکہ خود یہ سائنس داں بعض مقامات پر اپنے عجز کا اظہار کرتے ہیں مثلاً مشہور سائنس داں ایڈیسن (Edison) کہتا ہے کہ اب تک ہم جو کچھ معلوم کر سکے ہیں وہ اس کا دس کروڑواں حصہ ہے جو ہمیں معلوم ہونا چاہئے۔ میکسوئل ریڈ کہتا ہے کہ ہماری یہ کائنات اتنی وسیع و عریض ہے کہ ہم اس میں پائی جانے والی بہت سی اشیاء کے آغاز کے متعلق صحیح علم شاید کبھی حاصل نہ کر سکیں۔

....

حواشی:

(۱) جدید سائنسی تحقیق کی رو سے چاند کے زمین سے الگ ہونے کا یہ نظریہ درست ثابت نہیں ہوتا۔ (مصنف)

(۲) مزید تفصیلات کے لئے انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا زیر لفظ "جیالوجی" ڈبلیو میکسوئل ریڈ کی کتاب "دی اسٹارز فار سام" جارج گیمو کی کتاب "بائیو گرافی آف دی ارتھ"

(Biography of the Earth) جرجیس لوئی بفن کی کتاب ''نیچرل ہسٹری''
(Natural History) جو متعدد جلدوں پر مشتمل ہے۔ ای۔ ایس اڈنگٹن کی کتاب
''دی نیچر آف فزیکل ورلڈ'' (The Nature of Physical World) اور
فریڈ ہائل کی کتاب ''دی نیچر آف دی یونی ورس'' ملاحظہ کیجئے۔

(۳) مزید تفصیلات کے لئے انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا زیر لفظ ''جیالوجی''۔ ''بائیوگرافی آف دی ارتھ'' مصنفہ جارج گیمو۔ ''مارولز اینڈ مسٹریز آف سائنس'' مصنفہ ایلی سن ہاکس۔ ''نیچر آف دی یونی ورس'' (Nature of the Universe) مصنفہ فریڈ ہائل ملاحظہ فرمائیے۔

⌘⌘⌘

زندگی کا آغاز

آغازِ حیات کا سائنسی نقطۂ نظر

سائنس کہتی ہے کہ آج سے ساڑھے چار ارب سال قبل جب ہمارا کرۂ ارض وجود میں آیا تو چونکہ یہ سورج سے الگ ہوا تھا اس لئے آگ کے ایک بہت بڑے گولے کی طرح تھا۔ کروڑوں سال گزر جانے اور سورج سے دور ہو جانے کی وجہ سے اس کی بالائی سطح رفتہ رفتہ ٹھنڈی ہونے لگی پھر اس پر ایک ایسا دور آیا جسے برفانی دور کہا جاتا ہے۔ اس دور میں زمین کی بیرونی سطح پر برف کی بڑی دبیز تہہ جم گئی۔ یہ تہہ بعض مقامات پر چند فٹ یا چند گز نہیں بلکہ نصف میل سے بھی زیادہ موٹی تھی۔ یہ برفانی دور ہزاروں لاکھوں سال تک جاری رہا۔ پھر زمین پر گرمی کا دور آیا۔ اس دور میں برف پگھلنے لگا۔ اس کے ساتھ ساتھ بارشوں کا سلسلہ شروع ہو گیا اور ہماری زمین کے نشیبی اور گہرے حصے پانی سے بھر گئے اس طرح قدرتی جھیلیں اور سمندر پیدا ہو گئے اسی دور میں دریا معرضِ وجود میں آئے۔ اس وقت تک روئے زمین پر زندگی یا اس سے ملتی جلتی کسی چیز کا وجود نہ تھا صرف پہاڑ تھے، برفانی چوٹیاں، حدِ نگاہ تک پھیلے ہوئے سمندر اور وہ ہوائیں جو اس کرۂ ارض پر بڑی بے باکی سے چل رہی تھیں۔ لاکھوں سال یہی کیفیت رہی جن مقامات پر پانی کھڑا تھا اس کے کنارے کائی پیدا ہو گئی، دریاؤں، جھیلوں اور بعض سمندروں کے کنارے کائی جمنے لگی۔ زمین کے جن جن حصوں سے برف ہٹتا گیا پانی اترتا گیا وہاں گھاس اُگنی شروع ہوئی، درخت پیدا ہونے لگے اس طرح روئے زمین کا وسیع علاقہ ہرے بھرے سبزہ زاروں اور جنگلوں سے بھر گیا۔ اب زندگی

کے لئے ماحول پوری طرح سازگار ہو چکا تھا چنانچہ سمندر میں ایک پوائنٹ (نقطۂ حیات) پیدا ہوا اس سے کئی اور نقطوں نے جنم لیا۔ اس طرح یہ نقطے تعداد میں بڑھتے چلے گئے یہی زندگی کا آغاز تھا۔

یہ نقطے جاندار تھے' لاکھوں بلکہ کروڑوں سال تک ان میں نشو و ارتقاء کا عمل جاری رہا۔ ان کے جسم مختلف شکلیں اختیار کرتے رہے۔ جب یہ پوائنٹس یا نقطے ارتقا کے ادوار سے گزرتے ہوئے ایک خاص دور میں داخل ہوئے تو ان کی جسمانی کیفیت میں تبدیلی پیدا ہوئی اور کھال اور گوشت سے ملتے جلتے غلاف ان جرثوموں پر چڑھنے لگے۔ اس کے بعد ایک ایسا دور آیا جب ان کے جسم کے خول سخت ہو گئے ان میں ہڈیاں پیدا ہونے لگیں۔ یہ دور وہ تھا جب یہ مخلوق سمندروں سے نکل کر دریاؤں' جھیلوں اور قدرتی تالابوں میں آ گئی۔

کروڑوں سال قدیمی چٹانوں پر ایسے نشانات پائے گئے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس دور میں نو نو فٹ لمبے بچھو نما جانور پانی میں رینگتے پھرتے تھے۔ ان کے علاوہ مچھلیاں' کیکڑے اور دوسرے آبی کیڑے مکوڑے بہت بڑی تعداد میں پیدا ہو چکے تھے۔ جب ان آبی جانوروں کی کثرت ہو گئی تو انہیں خوراک کے لئے جدوجہد کرنی پڑی' جہدِ للبقا کی کشمکش نے ان کے جسم میں ضرورت اور ماحول کے مطابق تبدیلیاں پیدا کرنی شروع کر دیں۔

اسی جہد للبقا کا نتیجہ تھا کہ ان میں سے کچھ جانور پانی سے نکل کر خشکی پر آ گئے جو پیٹ کے بل رینگ رینگ کر چلتے تھے۔ یہ رینگنے والے جانور ارتقا کے ایک اور دور سے گزرے یعنی ان کے جسم پر بازو پیدا ہوئے مگر ابھی تک ان کے بازوؤں پر صرف کھال تھی جو چمڑے کی طرح سخت ہو چکی تھی' ان کے منہ کا اگلا حصہ نکیلا بن چکا تھا۔ طویل مدت کے بعد ان کے بازوؤں کو پر و بال مل گئے اور انہوں نے فضا میں اڑنا شروع کر دیا۔ اس دوران میں دلدلوں میں بھی زندگی کا ارتقا جاری رہا اور ان میں ایسے جانور پیدا ہو گئے جن میں سے بعض سو سو فٹ لمبے تھے۔ یہی دور تھا جب ان میں سے کچھ جانور جنگلوں کی طرف نکل گئے' دودھ پلانے والے جانور انہی کی ارتقائی شکل ہیں۔ ان میں چار پائے اور درختوں پر چڑھنے والے جانور سب ہی شامل تھے' اس طرح بندر اور بن مانس وجود میں آئے۔ اسی بندر کی

ایک شاخ نے ارتقائی منازل سے گزر کر انسان کی صورت اختیار کر لی۔ اگر حیوانات کی اقسام پر غور کیا جائے تو ان کی بعض انواع ایک دوسرے سے اتنی مماثلت اور مشابہت رکھتی ہیں کہ ایک نوع دوسری کی ترقی یافتہ شکل معلوم ہوتی ہے۔ اسی طرح اگر ہم حیوانات کے ارتقا کا جائزہ لیتے ہوئے ماضی کی طرف جائیں تو اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ اس ساری نسل حیوانی کا آغاز ایک ایسے Life Cell (جرثومۂ حیات) سے ہوا جو نہایت چھوٹا تھا۔ مزید تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو چارلس ڈارون کی کتاب

"Evolution of Species by Natural Selection"

اور "Origin of Species by Means of Natural Selection"

چارلس ڈارون نے پہلی کتاب ۱۸۵۹ء میں تصنیف کی۔ اس کے چند سال بعد یعنی ۱۸٦۵ء میں ایک سائنس داں رچٹر (Richter) نے تحقیق کا ایک نیا میدان سر کیا اور ڈارون سے ایک مختلف نظریہ پیش کیا۔ اس نے کہا کہ زندگی کوئی ایسی چیز نہیں جو بعد میں پیدا ہو گئی ہو بلکہ جب سے یہ کائنات عالم وجود میں آئی زندگی اسی وقت سے موجود ہے۔ یہ مادۂ حیات بے حد چھوٹے چھوٹے ذروں یا جرثوموں کی صورت میں ایک سیارے سے دوسرے سیارے کی طرف رواں دواں رہتا ہے۔ جب یہ جرثومے کسی ایسے کرے پر پہنچ جاتے ہیں جہاں ان کی نشو و نما کے لئے حالات سازگار ہوں تو یہ بڑھنے لگتے ہیں اور ان سے حیوانات پیدا ہونے لگتے ہیں۔

روس کے ایک سائنس داں اور محقق سوانٹے آرہینیئس (Svante Arrhenius) نے رچٹر کے نظریئے کی تائید کی۔ اس نے کہا کہ یہ جرثومے جو زندگی کا نقطۂ آغاز ہیں چونکہ بہت چھوٹے چھوٹے ہوتے ہیں اس لیے ان کی رفتار بہت تیز ہوتی ہے اور سیاروں سے جو روشنی نکلتی ہے اس کا دباؤ ان کی رفتار کو قائم رکھتا ہے۔

رچٹر اور آرہینیئس کے نظریات کو مقبولیت حاصل نہ ہو سکی اور دنیا کے جن محققوں اور سائنس دانوں نے ان پر غور کیا انہوں نے پہلی نظر میں یہ کہہ کر رد کر دیا کہ یہ ذرۂ حیات یا جرثومہ اسے جو بھی نام دیجئے اتنی قوت نہیں رکھتا جو فضا میں پائی جانے والی گرمی اور

سردی کو برداشت کر سکے۔ پھر سورج سے جو شعاعیں نکلتی ہیں جنہیں اصطلاح میں ''بنفشی شعاعیں'' کہتے ہیں اور جو ہماری زمین تک پہنچنے سے پہلے ہی ختم ہو جاتی ہیں کیا وہ اس ذرۂ حیات یا جرثومے کو جلا کر بھسم نہیں کر دیتی ہوں گی؟ اس طرح اس نظریئے کو پذیرائی نصیب نہ ہو سکی حالانکہ اس نظریہ کو ایسی سطحی تنقید کی بنا پر رد کر دینا درست نہ تھا۔ البتہ چارلس ڈارون کا نظریہ خوب مقبول ہوا کیونکہ بظاہر اس میں بڑی معقولیت اور وزن تھا اور اس نے جو دلائل پیش کئے وہ ایسے نہ تھے جنہیں آسانی سے توڑا جا سکتا۔

آغازِ حیات کا قرآنی نظریہ

ڈارون کی یہ تحقیق بلاشبہ نہایت قابل قدر ہے اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ وہ غیر معمولی دل و دماغ کا مفکر تھا اس نے اس مسئلے کا جس باریک بینی سے جائزہ لیا اور کروڑوں سال پرانے سلسلہ حیات کی گمشدہ کڑیاں تلاش کر کے انہیں جس طرح باہم مربوط کیا وہ اس کی وسعتِ نظر، غیر معمولی ذہانت اور محققانہ بصیرت کا پتا دیتی ہیں لیکن اس پیچیدہ مسئلے کو حل کرتے ہوئے اس سے کچھ لغزشیں بھی ہوئیں۔ اس کے بعض نتائج تنقید اور تحقیق کی کسوٹی پر پورے نہیں اترتے مگر وہ دو ایسی صداقتیں تلاش کرنے میں ضرور کامیاب ہو گیا جن کا کوئی محقق اور ارتقائے حیات کا عالم انکار نہیں کر سکتا۔ اول ہر قسم کی زندگی کا آغاز پانی میں ہوا۔ دوم تمام حیوان جن میں انسان بھی شامل ہے ارتقائی دور سے گزر کر موجودہ حالت تک پہنچے۔

ڈارون نے جن دو صداقتوں کی نشاندہی کی اگرچہ وہ پہلے بھی مبہم اور غیر واضح انداز سے پیش کی جا چکی ہیں۔ لیکن ڈارون نے انہیں مستحکم دلائل کے ساتھ ایک نظریئے کی صورت میں پیش کیا۔ آیئے دیکھیں اللہ تعالیٰ نے بھی اس بنیادی مسئلے کے بارے میں بنی نوع انسان کی رہنمائی فرمائی یا انہیں فلسفیوں اور مفکروں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا؟ جب ہم قرآن حکیم میں زندگی کے آغاز کے بارے میں روشنی تلاش کرتے ہیں تو ہماری نگاہیں اس منارۂ نور پر جم جاتی ہیں۔

وجعلنا من الماء کل شیء حی ط "اور ہم نے ہر چیز کو پانی میں زندگی دی"۔ (سورہ الانبیا آیت نمبر ۳۰)

گویا جو صداقت محقق چارلس ڈارون نے ۱۸۵۹ء میں تلاش کی وہ اس سے تیرہ سو سال قبل اللہ تعالیٰ اپنے نبیؐ امی پر منکشف فرما چکا تھا۔ اس نبی امی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے نہ فلسفہ پڑھا تھا نہ علم طبقات الارض اور علم الافلاک کی کسی درس گاہ سے سند فضیلت حاصل کی تھی اور نہ اس زمانے میں عرب کی سرزمین پر اس قسم کی درس گاہیں موجود تھیں۔ اہلِ عرب تو اس وقت جہالت کی تاریکیوں میں ڈوبے ہوئے تھے اس زمانے میں دنیا کے کسی حصے میں ان نظریات کی گرم بازاری بھی نہ تھی۔ اس تاریکی اور جہالت کے زمانے میں اللہ تعالیٰ ایک اُمیؐ کے ذریعے بنی نوع انسان کو سائنس کی اس حقیقت پر مطلع فرماتا ہے کہ تم دنیا میں جتنی موجودات دیکھتے ہو ان سب کی زندگی کا آغاز پانی میں ہوا۔

نظریہ ارتقا اور قرآنِ حکیم

دوسری صداقت جو ڈارون نے دریافت کی وہ ارتقائے حیات کا نظریہ ہے یعنی ہر ذی روح جسم ارتقا کے طویل ادوار سے گزر کر موجودہ حالت تک پہنچا جبکہ انسان کے بارے میں عام نظریہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے مٹی کو گوندھا اس سے ایک پتلا بنایا پھر اس پتلے کو سوکھنے کے لئے رکھ دیا جب وہ خشک ہو گیا تو اس میں روح پھونکی اور دوسرے لمحے وہ جیتا جاگتا انسان بن کر کھڑا ہو گیا۔ افسوس تو اس کا ہے کہ اس نظریئے کو قرآن کی طرف منسوب کر دیا گیا حالانکہ یہ اسرائیلی تصورات ہیں جن کا اسلام اور قرآنی تعلیمات سے دور کا بھی تعلق نہیں چنانچہ بائیبل میں انسان کی پیدائش کا جو تصور پیش کیا گیا ہے وہ بالکل یہی ہے جو گزشتہ سیکڑوں سال سے ہمارے ہاں ایک مذہبی صداقت کے طور پر تسلیم کر لیا گیا چنانچہ عہد نامہ قدیم میں بتایا گیا ہے کہ:

"اور خداوند خدا نے زمین کی مٹی سے انسان کو بنایا اور اس کے نتھنوں میں زندگی کا دم پھونکا تو انسان جیتی جاگتی جان ہوا"۔

پھر آگے چل کر بیان ہوا کہ:۔

"اور خداوند خدا نے کہا کہ آدم کا اکیلا رہنا اچھا نہیں میں اس کے لئے ایک مددگار اس کی مانند بناؤں گا"۔ (عہد نامہ قدیم۔ پیدائش باب ۲)

اس کے بعد مرد میں سے عورت تخلیق کرنے کا تصور پیش کیا گیا:۔

"اور خداوند خدا نے آدم پر گہری نیند بھیجی اور وہ سو گیا اور اس نے اس کی پسلیوں میں سے ایک کو نکال لیا اور اس کی جگہ گوشت بھر دیا اور خداوند خدا اس پسلی سے جو اس نے آدم میں سے نکالی تھی ایک عورت بنا کر آدم کے پاس لایا اور آدم نے کہا کہ یہ تو میری ہڈیوں میں سے ہڈی اور گوشت میں سے گوشت ہے اس لئے وہ ناری کہلائے گی کیونکہ وہ نر سے نکالی گئی اس واسطے مرد اپنے ماں باپ کو چھوڑے گا اور اپنی بیوی سے ملا رہے گا اور وہ ایک تن ہوں گے اور آدم اور اس کی بیوی دونوں ننگے تھے اور شرماتے نہ تھے"۔ (عہد نامہ قدم۔ پیدائش باب نمبر ۲)

ظاہر ہے کہ اسلام کا خدا اس قسم کی جادوگری اور شعبدہ بازی سے پاک ہے۔ غالباً اسی قسم کے تصورات اور عقائد تھے جن سے بددل ہو کر مغرب کا تعلیم یافتہ طبقہ خدا اور مذہب ہی سے باغی ہو گیا۔ اب دیکھئے انسان کی پیدائش کے متعلق اللہ تعالیٰ قرآن حکیم میں ہماری کیا رہنمائی کرتا ہے جو صداقت چارلس ڈارون نے آج سے ایک سو سال قبل دریافت کی وہ اسلام کا خدا اس سے تیرہ سو سال قبل بیان کر چکا تھا چنانچہ فرمایا:

والله خلقكم من تراب (سورہ فاطر آیت نمبر ۱۱) "اور اللہ نے تم کو خشک مٹی سے پیدا کیا"۔

اس کے بعد فرمایا:

هل اتى على الانسان حين من الدهر لم يكن شيئا مذكورا (سورہ الدھر آیت نمبر ۱)

"بے شک انسان پر ایک زمانے میں ایسا وقت آ چکا ہے جب وہ بے حقیقت اور ناقابلِ ذکر تھا"۔

پھر فرمایا کہ:۔

ولقد خلقنا الانسان من صلصال من حما مسنون o
(سورہ الحجر آیت نمبر ۲۶)

''اور ہم نے انسان کو بجتی ہوئی مٹی سے جو سڑے ہوئے گارے کی تھی پیدا کیا''۔

تیسری جگہ فرمایا کہ:۔

انا خلقنا الانسان من نطفة امشاج (سورہ الدھر آیت نمبر ۲)

''ہم نے انسان کو مخلوط نطفے سے پیدا کیا''۔

ان آیات میں اللہ تعالیٰ انسان کی پیدائش کے چار ادوار بیان فرماتا ہے یعنی وہ چار ادوار میں سے گزر کر موجودہ حالت تک پہنچا۔ پہلا دور وہ تھا جب انسان ایک ذرہ کی حالت میں تھا اور یہ ذرہ خشک مٹی میں ملا ہوا تھا۔ اس ذرے میں زندگی موجود تھی مگر ابھی اس کا نشوونما شروع نہ ہوا تھا۔ دوسرا دور وہ ہے جب انسان کا ابتدائی جرثومہ پانی میں پرورش پا رہا تھا کیونکہ اللہ تعالیٰ فرما چکا ہے کہ ہم نے تمام اشیاء کو (جن میں انسان بھی شامل ہے) پانی میں زندگی دی (سورۃ الانبیاء آیت نمبر ۳۱) تیسرا دور وہ ہے جب انسانی زندگی کا جرثومہ پانی سے نکل کر دلدلی مٹی میں آیا اور مٹی کے اجزا سے اس کے جسم کی نشوونما شروع ہوئی۔ اس دور کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم نے انسان کو سڑے ہوئے گارے سے پیدا کیا (سورہ الحجر آیت نمبر ۲۵) یہی وہ دور ہے جس کی طرف اشارا کرتے ہوئے اس نے فرمایا کہ ''بے شک انسان پر ایک زمانے میں ایسا وقت بھی گزر چکا ہے جب وہ بے حقیقت اور نا قابل ذکر تھا''۔ (سورہ الدھر آیت نمبر ۱) یعنی وہ تھا تو ضرور مگر اس کی حقیقت اس لائق نہ تھی کہ وہ بیان کی جاتی یا وہ خود ایک دوسرے سے اس کے متعلق کوئی ذکر کرتا کیونکہ جسمانی لحاظ سے ابھی وہ اس قابل ہی نہ ہوا تھا۔ اسے دماغ اور قوت گویائی ملی ہی نہ تھی جن سے سوچ سمجھ کر وہ کچھ بیان کرتا کیونکہ ابھی اس کا جسم دلدلی مٹی میں پرورش پا رہا تھا (جس میں پانی اور مٹی ملی ہوتی ہے) اور جسے لاکھوں سال پرانی ہونے کی وجہ سے سڑا ہوا گارا قرار دیا۔ پس تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس کے حقیر اور نا قابلِ ذکر وجود ہونے کا زمانہ یہی تھا جس کی طرف

اللہ تعالیٰ نے اشارہ فرمایا ہے کہ تم پر ایک ایسا دور بھی گزر چکا ہے جب تم نہ کوئی قابل ذکر کام کرنے کے لائق تھے اور نہ اس قابل تھے کہ اپنی اس حالت کا دوسرے سے تذکرہ کر سکو۔

انسانی زندگی اور اس کے جسمانی ارتقا کا چوتھا دور وہ ہے جس کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم نے انسان کو نطفے سے پیدا کیا (سورہ الدھر آیت نمبر ۲) یعنی یہ دور وہ تھا جب انسانی جسم تکمیل پا چکا تھا اور اس کی پیدائش مرد و عورت کے باہم ملنے کے بعد نطفے کے ذریعے شروع ہوئی۔ انسانی زندگی کے یہی چار ادوار ہیں جو قرآن میں بیان کئے گئے ہیں اور ان سے ثابت ہوتا ہے کہ انسان کی پیدائش اچانک نہیں ہوئی بلکہ اللہ تعالیٰ نے اسے مختلف ارتقائی ادوار سے گزار کر موجودہ جسمانی شکل و صورت تک پہنچایا۔ قرآن حکیم اس کے علاوہ انسان کی پیدائش کا اور کوئی تصور پیش نہیں کرتا۔ حضرت آدمؑ کی بعثت بہت بعد کا واقعہ ہے جس کا انسانی تخلیق کے درمیانی اور ارتقائی دور سے کوئی تعلق نہیں۔ اس موضوع پر انشاء اللہ ہم اس کتاب کے باب ''ظہورِ آدم'' میں اظہارِ خیال کریں گے۔

یہاں تک قرآن حکیم سے ڈارون کے نظریۂ ارتقا کی تائید ہوتی ہے۔ اس کے بعد ڈارون اور قرآن کا راستہ ایک دوسرے سے جدا ہو جاتا ہے اور ڈارون ایک ایسے راستے پر جا نکلتا ہے جس پر گامزن ہونے والے راہرو کا ہر قدم اسے منزل سے دور لے جاتا ہے مثلاً ڈارون کہتا ہے کہ اگر ہم حیوانوں کی مختلف انواع کی جسمانی ساخت پر غور کریں تو ہمیں ان میں بڑی مماثلت و مشابہت نظر آتی ہے اور اگر ہم ماضی کی طرف چلیں تو ہمیں تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ بہت سے حیوانوں کا جن میں انسان بھی شامل ہے ایک ہی Life Cell (نقطۂ حیات) تھا یعنی ایک ہی جرثومہ سے ترقی کر کے یہ حیوانات اپنی موجودہ شکل و صورت کو پہنچے۔

ارتقائے حیات کا صحیح نظریہ

ہم یہ تو تسلیم کرتے ہیں کہ تمام حیوانوں کی زندگی کا آغاز جن میں انسان بھی شامل ہے پانی ہی میں ہوا لیکن یہاں بھی ہمیں ڈارون سے اختلاف ہے وہ کہتا ہے کہ زمین

پر سمندر معرض وجود میں آنے کے بعد انہی سمندروں میں سے کسی سمندر میں Life Cell (زندگی کا اولین نقطہ) پیدا ہوا جس سے دو' چار' دس' سو' ہزار اور لاکھوں تک نقطے بنتے چلے گئے مگر حقیقت یہ نہیں۔ ہمارا نظریہ یہ ہے کہ جن ذرات سے کائنات تخلیق ہوئی انہی میں ایسے ذرات بھی تھے جن میں زندگی موجود تھی۔ یہ ذرات پانی میں بعض دوسرے مادوں سے مل کر جن میں پروٹین جزوِ اعظم تھا بڑھتے رہے اور ایک دور ایسا آیا جب ان میں حرکت وارتقاء کی کیفیت زیادہ نمایاں ہوگئی انہوں نے مٹی اور پانی کے مرکب میں اور کائی میں اپنے جسمانی ارتقاء کا عمل جاری رکھا (کیونکہ اب یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ کائی خود جاندار ہوتی ہے) رفتہ رفتہ ان پر گوشت چڑھا' اس پر کھال چڑھی جسم کے اندر ہڈیاں پیدا ہوئیں اور لاکھوں یا کروڑوں سال میں حیوانات نے اپنی موجودہ شکل اختیار کر لی۔

ان میں سے ہر نوع کا نقطۂ آغاز الگ تھا کیونکہ جب ہم اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں کہ پہلے پہل پانی میں ایک Life Cell (نقطۂ حیات) پیدا ہوا تو یہ کیوں نہ تسلیم کریں کہ ایک کی بجائے ایک لاکھ نقطے یا جرثومے پیدا ہوئے۔ جہاں سے وہ ایک ابتدائی نقطۂ حیات معرض وجود میں آیا وہیں سے ایک ہزار اور ایک لاکھ بھی پیدا ہو سکتے ہیں۔ پس ہمارے خیال میں حیوانوں کی ہر نسل کا نقطۂ حیات الگ تھا (یعنی گائے اور بیل کا ابتدائی Life Cell (نقطۂ حیات) الگ تھا' شیر اور چیتے کا الگ تھا' سانپ اور بچھو کا الگ تھا' مینڈک اور مچھلی کا الگ تھا' باز اور کبوتر کا الگ تھا' بندر اور بن مانس کا الگ تھا اور انسان کا بالکل الگ تھا)۔ ان میں سے ہر نوع اور نسل اپنے اپنے دائرے میں ارتقائی مراحل طے کرتی رہی اور اپنی موجودہ حالت تک پہنچی۔ یہ نظریۂ ارتقا غلط اور قطعاً ناقابلِ قبول ہے کہ ایک ہی لائف سیل (نقطۂ حیات) نے ترقی کر کے مچھلی' مکھی' ہاتھی' کبوتر' گائے' بندر' بن مانس اور انسان کی شکل اختیار کر لی کیونکہ ان انواع اور ان کے ''جینز'' میں جسمانی ساخت کے لحاظ سے اتنا اختلاف ہے کہ عقل اس نظریئے کو قبول ہی نہیں کرتی۔ ہمیں بتایا جائے کہ مکھی اور ہاتھی میں کیا مماثلت ہے۔ سانپ اور شیر میں کیا مماثلت ہے۔ کبوتر اور انسان میں کیا مماثلت ہے۔

ڈارون کے مغربی نقاد

ڈارون کی تحقیقات کے منظر عام پر آنے کے بعد خود مغرب میں اس کے نظریات پر کڑی تنقید کی گئی ہے۔ خیال رہے کہ اس تنقید میں مذہبی یا جذباتی یورش نہیں تھی بلکہ اس تنقید کی بنیاد ایسے حقائق پر تھی جنہیں ڈارون کا بڑے سے بڑا حامی غلط قرار نہیں دے سکتا۔ ڈارون نے اپنی کتاب "Origin of Species" میں اس موضوع پر جو بحث و تحقیق کی ہے اس کی تردید سب سے پہلے آسٹریا کے ایک محقق گریگور منڈل (Gregor Mendel) کی تحقیقات سے ہوئی حالانکہ منڈل کو ڈارون کے افکار کا مطلق علم نہ تھا وہ اپنی جگہ الگ تحقیق کر رہا تھا اسی طرح ڈارون منڈل کی تحقیق سے لاعلم تھا منڈل کی اس تحقیق نے ڈارون کے نظریات کا سارا تار و پود بکھیر دیا۔ منڈل نے اپنی تحقیق کے دوران جو بنیادی نکات اٹھائے ہیں ان میں سے بعض کا تذکرہ یہاں بے محل نہ ہوگا۔ منڈل کی اس تحقیق کے حوالے ولیم بک (William Beck) نے اپنی کتاب "Modern Science and the Nature of Life" میں درج کئے ہیں مثلاً وہ کہتا ہے کہ حیوانات کی ہر نوع کے ''جینز'' (Genes) اپنی ساخت اور اوصاف کے لحاظ سے مختلف ہوتے ہیں اور ان کی تعداد بھی مختلف ہوتی ہے۔ اگر ایک نوع کی جنس دوسری نوع میں تبدیل ہوتی ہے تو اس کے ''جینز'' کو بھی تبدیل ہونا چاہیے مثلاً بیل کے ''جینز'' بندر سے بالکل مختلف ہوتے ہیں۔ کتے کے ''جینز'' خرگوش کے ''جینز'' سے بالکل مختلف ہوتے ہیں۔ انسان کے ''جینز'' دوسری انواع حیوانات کے ''جینز'' سے بالکل ہی مختلف ہوتے ہیں۔ اگر ارتقائے حیات کے نظریئے کے مطابق رینگنے والے جانوروں کی کسی نوع نے ترقی کر کے اڑنے والے جانوروں کی صورت اختیار کر لی یا دودھ پلانے والے جانوروں مثلاً کتوں یا بلیوں نے گائے اور بھینس کی صورت اختیار کر لی تو ان کے ''جینز'' میں بھی تبدیلی آنی چاہیئے تھی حالانکہ یہ امر تحقیق شدہ ہے کہ ایک نوع کے ''جینز'' دوسری نوع کے ''جینز'' کو قبول کر ہی نہیں سکتے۔ جب کتے کے ''جینز'' ''خرگوش کے ''جینز'' سے اپنی ساخت، خصوصیات اور تعداد کے اعتبار سے مختلف ہوتے ہیں تو کتے کا خرگوش یا خرگوش کا کتے کی جنس میں منتقل ہونا بالکل

ناممکن ہے۔ اسی طرح رینگنے والے جانوروں مثلاً سانپ کا کبوتر یا کبوتر کا سانپ کی شکل میں تبدیل ہونا کسی طرح ممکن ہی نہیں۔ جدید تحقیق سے یہ بھی ثابت ہو چکا ہے کہ یہ جینز اتنے قوی ہوتے ہیں کہ دنیا کا بڑے سے بڑا حادثہ اور انقلاب بھی ان میں تبدیلی پیدا نہیں کر سکتا اس لئے ڈارون کا یہ نظریہ بالکل غلط اور ناقابلِ قبول ہے کہ حیوانوں کی ایک نوع دوسری نوع یا جنس میں تبدیل ہوگئی۔

ڈارون اپنے دعویٰ کے حق میں ایک دلیل یہ دیتا ہے کہ مختلف حیوانات کی نسلوں کے ماہرین مسلسل تجربات سے ان حیوانوں کی نسلوں میں اضافے کرتے ہیں۔ وہ اپنی کوشش سے بہتر قسم کی نسلیں بھی پیدا کرتے ہیں اس سے لازم آیا کہ ایک نسل دوسری نسل میں تبدیل ہو سکتی ہے۔ معلوم نہیں ڈارون جیسے ذہین محقق نے یہ عجیب وغریب نظریہ کیسے قائم کر لیا اور اپنے دعوے کے ثبوت میں ایسی دلیل کیوں پیش کر دی جو انتہائی کمزور بلکہ سرے سے دلیل کہلانے کی مستحق نہیں۔ بلاشبہ افزائش نسل کے ماہرین تجربات کر کے حیوانات کی بہتر سے بہتر نسل پیدا کرتے ہیں مگر کیا افزائش نسل کے کسی ماہر نے کوئی ایسا تجربہ بھی کیا جس کے نتیجے میں ایک نسل دوسری نسل میں منتقل ہو گئی ہو۔ مثال کے طور پر افزائشِ نسل حیوانی کے ماہرین اعلیٰ نسل کے اور صحت مند گھوڑے اور بیل تلاش کر کے انہیں صحت مند ماحول میں رکھتے ہیں۔ انہیں اچھی غذا دیتے ہیں ان کی بہتر دیکھ بھال کرتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ گھوڑوں اور بیلوں کی اعلیٰ اور توانا نسل پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ گھوڑے زیادہ چاق و چوبند، مضبوط اور صحت مند ہوتے ہیں۔ اسی طرح ان ماہرین کی زیرِ نگرانی پرورش پانے والے بیلوں سے اعلیٰ نسل کی گائیں پیدا ہوتی ہیں جو صحت مند ہوتی ہیں اور بہت زیادہ مقدار میں دودھ دیتی ہیں لیکن آج تک افزائشِ نسل حیوانی کا کوئی ماہر گھوڑے اور گائے کے ملاپ سے کوئی نئی نسل پیدا نہیں کر سکا، خرگوش اور بلی کے ملاپ سے کوئی تیسری نسل پیدا نہیں کر سکا۔ اس سے ثابت ہوا کہ ایک نسل اپنے دائرے میں رہتے ہوئے ترقی کر سکتی ہے اور بہتر نتائج پیدا کر سکتی ہے مگر دوسری نسل سے مل کر کوئی تیسری نسل پیدا نہیں کر سکتی۔ اس کی وجہ وہی ہے کہ اس کے خلیوں میں جو ''جینز'' ہوتے ہیں وہ کسی دوسری نسل میں منتقل ہو ہی نہیں سکتے اور نہ دوسری نسل انہیں قبول کر سکتی ہے۔ مشہور امریکی

دانشور ''اے کریسی ماریسن'' کے بقول صرف ایک مثال پیش کی جاسکتی ہے اور وہ خچر کی ہے جو دو مختلف نسلوں گھوڑی اور گدھے کے اختلاط کے نتیجے میں پیدا ہوتا ہے مگر چونکہ یہ اختلاط غیر قدرتی اور غیر فطری ہوتا ہے اس لئے خچر اپنی آئندہ نسل پیدا کرنے کے قابل نہیں ہوتا۔

غرض جس زاویئے سے دیکھا جائے ڈارون کا یہ نظریہ غیر منطقی اور غیر سائنسی ہے کہ تمام حیوانات کا یا چند متماثل حیوانات کا نقطۂ حیات ایک ہی تھا جس سے زندگی کے بے شمار نقطے پیدا ہوئے، انہی نقطوں نے ارتقاء کے مختلف مدارج طے کئے اور ایک نوع دوسری بلکہ بالکل مختلف نوع میں تبدیل ہوتی ہوئی بن مانس تک پہنچی اور اسی کی ارتقائی صورت انسان ہے۔ حقیقت یہ نہیں بلکہ جیسا کہ ہم قبل ازیں اپنا نظریہ پیش کر چکے ہیں صحیح نظریۂ ارتقا یہ ہے کہ پانی میں بہت سے Life Cells (زندگی کے نقطے) پیدا ہوئے جو اپنے اپنے دائرے میں جسمانی ساخت کے لحاظ سے ترقی کرتے رہے۔ انسان کا Life Cell (نقطۂ حیات) بالکل الگ اور مختلف تھا اس ایک Cell (سیل) سے دو، دو سے چار، چار سے آٹھ اسی طرح یہ سیل تعداد کے لحاظ سے بڑھتے رہے اور ہر سیل ارتقائی مراحل سے گزرتا رہا یہاں تک کہ وہ پانی اور کیچڑ میں منتقل ہو گیا جسے اللہ تعالیٰ سڑا ہوا گارا قرار دیتا ہے یہاں اس کے جسم کی پرورش اور نشوونما ہوئی، اس گیلی مٹی کے ذرات سے اس کے جسم نے توانائی اور گوشت پوست حاصل کیا اور جب اس کا جسم خشکی میں آ کر سختی برداشت کرنے کے قابل ہو گیا تو وہ پانی اور دلدل سے نکل کر خشک زمین پر آ گیا۔ اس کے بعد اس کی نسل مرد اور عورت کے ملاپ سے نطفے کے ذریعے پیدا ہونے لگی۔ اس کے علاوہ ارتقائے حیات کا کوئی نظریہ منطقی یا سائنسی اعتبار سے قابل قبول نہیں ہو سکتا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں ارتقائے حیات کا جو قانون بیان کیا ہے وہ کسی اور نظریئے کی تائید نہیں کرتا۔

نباتات میں زندگی کا قرآنی نظریہ

عہدِ قدیم سے لے کر سترہویں صدی عیسوی کے وسط تک وجود حیات کے متعلق عام خیال یہی تھا کہ زندگی صرف حیوانوں میں ہے یعنی ذی روح یا جاندار کا تصور صرف چرندوں، پرندوں، آبی جانوروں، حشرات الارض اور انسانوں تک محدود رہا۔ یونان کے بعض

فلاسفروں نے نباتات کی نوعی تبدیلی کی طرف مبہم اشارات ضرور کئے مگر وہ کسی ٹھوس فلسفے پر مبنی نہ تھے۔عصر جدید کی سائنس نے اس حقیقت کو بے نقاب کیا کہ زندگی صرف حیوانوں ہی میں نہیں بلکہ نباتات بھی زندہ ہیں چنانچہ نباتات نے ایک مستقل علم کی صورت اختیار کر لی اور اس علم کے ماہرین نے بڑے بڑے انکشافات کئے جن میں سے ایک بڑا انکشاف یہ تھا کہ انسانوں، چرندوں اور پرندوں کی طرح نباتات میں بھی نر اور مادہ ہوتے ہیں اور ان دونوں کے اتصال ہی سے نباتات میں روئیدگی قائم رہتی ہے۔اگر ان میں سے ایک یعنی نر یا مادہ ختم ہو جائے تو روئے زمین سے نباتات کا وجود بھی ختم ہو جائے اور ساری دنیا خشک اور بنجر ہو کر رہ جائے، دوسرے الفاظ میں حیات انسانی کا چراغ بھی گل ہو جائے۔

سائنس نے جو حقیقت اس ترقی یافتہ دور میں دریافت کی اللہ تعالیٰ آج سے چودہ سو سال قبل اس کا انکشاف فرما چکا ہے چنانچہ ارشاد ہوا کہ:۔

ومن کل شیء خلقنا زوجین لعلکم تذکرون o (سورہ الذریٰت آیت نمبر ۴۹)

''اور ہم نے ہر چیز کے نر اور مادہ پیدا کئے تاکہ تم (خدا کی تخلیق کے اصولوں کو) سمجھ سکو''۔

اس طرح اللہ تعالیٰ نے سائنس کا ایک نکتہ بیان کر کے دو صداقتوں کی طرف ہماری رہنمائی فرما دی۔اول نباتات میں زندگی ہے کیونکہ جو چیز نر اور مادہ کے اختلاط سے پیدا ہوگی وہ لازمی طور پر جاندار ہوگی۔دوم انسانوں اور حیوانوں کی طرح نباتات میں بھی نر اور مادہ ہیں بلکہ اس سے آگے بڑھ کر اللہ تعالیٰ نے ہمیں یہ تصور دیا کہ دنیا کی ہر چیز جاندار ہے اور زندگی سے جمادات تک محروم نہیں کیونکہ ان میں بالیدگی کی قوت کا وجود یعنی ان کا بڑھنا اور ان کے قد وقامت اور جسامت میں اضافہ ہونا اس حقیقت کا ثبوت ہے کہ وہ جاندار ہیں حتیٰ کہ ایک حقیر ذرہ بھی اپنے اندر زندگی رکھتا ہے۔گویا اس کائنات میں ہر طرف زندگی ہی زندگی ہے جو ہمارے چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے۔

ارتقائے حیات کا ایک لطیف نکتہ

یہ عجیب بات ہے، جس کی طرف اب تک توجہ نہیں کی گئی کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم کا آغاز ہی اس کائنات کی پیدائش اور اس کے ارتقا کے ذکر سے کیا ہے۔یہ اس امر کا

ثبوت ہے کہ خدا کے وجود کا تصور یا قرآنی افکار زمین سے مضبوط رشتہ رکھتے ہیں، وہ ہوائی قلعے نہیں بناتے اور نہ خدا اور مذہب پر یقین و ایمان کا مفہوم صرف جنت کے انعامات اور دوزخ کے عذاب تک محدود ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے کہ الحمد للہ رب العالمین o یہ قرآن حکیم کی پہلی سورت کی پہلی آیت ہے یعنی ان الفاظ سے قرآن حکیم کا آغاز ہوتا ہے۔ اس آیت کا سادہ اُردو ترجمہ یہ ہے کہ ہر تعریف کا مستحق صرف اللہ ہے جو تمام جہانوں کا رب ہے۔ رب کے معنی عام طور پر ''پالنے والا'' بیان کئے جاتے ہیں یہ معنی غلط نہیں یقیناً درست ہیں اور یہ اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی صفت ہے لیکن رب کے ایک اور معنی بھی ہیں چنانچہ عربی زبان وادب کے امام اور عربی لغت کے سب سے بڑے ماہر امام راغبؒ نے رب کے یہ معنی بیان کئے ہیں ''انشاء الشیء حالاً فحالاً الی حد التمام'' (مفردات امام راغبؒ) یعنی ''کسی چیز کا حالتِ عدم سے عالمِ وجود میں لانا اور پھر اسے مختلف حالات وواقعات میں ادنیٰ حالت سے ترقی دے کر درجہ بدرجہ اعلیٰ حالت تک پہنچانا''۔ اس میں پالنے والے کا مفہوم خود بخود شامل ہو جاتا ہے۔

گویا اس آیت کی رو سے اللہ تعالیٰ ہر تعریف کا مستحق اس لئے بھی ہے کہ اس نے اس کائنات کی ہر چیز کو پیدا کیا اور پھر اسے ادنیٰ حالت سے ترقی دے کر اعلیٰ حالت تک پہنچایا۔ دراصل قرآن حکیم کی اس پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ سائنس کے ایک بنیادی اصول کی طرف ہماری رہنمائی فرماتا ہے کہ آغاز میں ہر چیز ادنیٰ حالت میں تھی یعنی دنیا کی تمام مخلوقات اور موجودات میں سے ہر مخلوق اور ہر موجود جس حالت اور جس صورت میں ہمیں آج نظر آتا ہے ابتدا میں اس کی یہ صورت نہ تھی بلکہ وہ مختلف حالات وادوار میں اور متعدد مدارج سے گزر کر موجودہ حالت تک پہنچا کیونکہ اگر ہم کائنات اور اس کی جملہ اشیاء کی ابتدا ادنیٰ درجے کی تسلیم نہ کریں تو خدا کا رب ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ پس رب کا لفظ اس حقیقت پر دلالت کرتا ہے کہ یہ کائنات موجودہ صورت میں اچانک اور ایک لمحے میں پیدا نہیں ہوئی اور نہ کسی حادثاتی شکل میں معرضِ وجود میں آئی بلکہ اللہ تعالیٰ نے اسے اپنے قانونِ ارتقا کے تحت ادنیٰ حالت میں پیدا کیا اور پھر اسے مختلف حالات اور مختلف درجوں سے گزار کر موجودہ حالت تک پہنچایا۔ اس قانونِ ارتقاء سے نہ سیارے اور ستارے باہر ہیں، نہ انسان و

حیوان نہ نباتات و جمادات' ارتقا کا یہ قانون اس کائنات کی ہر شے پر نافذ ہوا۔ پس اللہ تعالیٰ نے ہمیں تخلیق کائنات کا جو تصور آج سے چودہ سو سال قبل دیا اس میں نظریہ ارتقا کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔

ایک سے زیادہ کائناتوں کا نظریہ

قرآن حکیم کی اس آیت سے اور بعض دیگر آیات سے بھی ایک اور حقیقت کا ثبوت ملتا ہے' ایک اور نظریہ ہمارے سامنے آتا ہے۔ جب یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا کیونکہ وہ ازلی وابدی ہے' اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ وہ رب العالمین بھی ہے یعنی صرف ایک عالم کا رب نہیں کیونکہ عالمین جمع کا صیغہ ہے اور عربی زبان کے اصول کے مطابق جمع کے صیغے کا اطلاق تین یا اس سے زیادہ کے اعداد پر ہوتا ہے گویا اللہ تعالیٰ تین یا اس سے زائد عالموں کا رب ہے۔ اسی طرح یہ بھی ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ ہماری یہ کائنات ہمیشہ سے نہیں ہے بلکہ دو کھرب سال قبل معرض وجود میں آئی اور کسی وقت جس کا صرف اللہ تعالیٰ کو علم ہے فنا ہو جائے گی۔ اگر اس کائنات سے قبل کوئی اور کائنات موجود نہ تھی اور اس کائنات کے فنا ہو جانے کے بعد بھی کوئی اور کائنات عالم وجود میں نہیں آتی تو اس سے ثابت ہوگا کہ ایک زمانہ ایسا بھی تھا جب اللہ تعالیٰ کی صفتِ خالقیت اور صفتِ ربوبیت دونوں معطل تھیں اور یہ تعطل کروڑوں اور اربوں سال نہیں بلکہ لامحدود زمانے تک قائم رہا اور اس کائنات کے خاتمے کے بعد بھی قائم رہے گا۔ ایسا نظریہ جو خداوند تعالیٰ کی صفتِ خالقیت اور صفتِ ربوبیت دونوں کو معطل کر دے کسی طرح قابل قبول نہیں ہو سکتا۔

پس اس سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ ہماری اس کائنات سے قبل اور بھی بہت سی کائناتیں پیدا ہو چکی ہیں' ان میں بھی کوئی مخلوق تھی جس کی اللہ نے ربوبیت فرمائی اور ہماری کائنات کے فنا ہو جانے کے بعد وہ کوئی اور کائنات پیدا کرے گا اور یہ سلسلہ اسی طرح ابد تک جاری رہے گا اور ابد کی کوئی حد نہیں یعنی ہماری یہ کائنات نہ پہلی ہے اور نہ آخری۔

⌘⌘⌘

ظہورِ آدم

تخلیق آدم کی روایتی داستان

جب اللہ تعالیٰ اس کائنات کو تخلیق فرما چکا تو اس نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین پر اپنا خلیفہ بناؤں گا جب میں اسے پیدا کر دوں تو تم اس کے سامنے سجدے میں گر جانا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو حکم دیا کہ وہ زمین سے مٹی لائیں۔ فرشتے سڑا ہوا اور بدبودار گارا لے کر اپنے مقدس رب کے حضور حاضر ہوئے۔ اس سڑے ہوئے گارے سے اللہ تعالیٰ نے ایک پتلا بنایا' پھر اسے خشک ہونے کے لئے رکھ دیا۔ جب وہ سوکھ گیا تو اس میں اپنی روح پھونکی اس طرح مٹی کا یہ پتلا ایک جاندار انسان بن کر کھڑا ہو گیا۔ یہ حضرت آدمؑ تھے' دنیا کے سب سے پہلے انسان۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدمؑ کو سجدہ کرو۔ سب نے اس حکم کی تعمیل کی مگر فرشتوں کے سردار اور ان کے معلم ابلیس نے حضرت آدمؑ کو سجدہ کرنے سے انکار کر دیا اور یہ موقف اختیار کیا کہ آدم کو سڑے ہوئے گارے سے پیدا کیا گیا ہے جبکہ مجھے آگ سے تخلیق کیا گیا ہے اس لئے میں اس سے افضل ہوں اور اپنے سے کمتر وجود کو سجدہ نہیں کروں گا۔ اللہ تعالیٰ نے اس سرکشی و نافرمانی کی بنا پر ابلیس کو جنت سے نکال دیا۔ اس کے بعد حضرت آدمؑ کی تنہائی دور کرنے کی غرض سے اللہ تعالیٰ نے ان کا ایک ساتھی تخلیق کرنے کا ارادہ فرمایا۔ اس نے حضرت آدمؑ کے جسم سے ایک پسلی نکالی اور اس سے ایک عورت بنائی یہ حضرت حواؑ تھیں جو حضرت آدمؑ کی بیوی بنیں۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کو مخاطب کر کے فرمایا کہ تو اور تیری بیوی دونوں جنت

میں رہواور اس میں سے جو چاہو کھاؤ' ایک درخت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ اس کے قریب مت جانا ورنہ تم ظالموں میں سے ہو جاؤ گے۔ یہ درخت (۱) گندم کا تھا (۲) انجیر کا تھا (۳) انگور کا تھا (۴) بعض نے کہا ہے کہ کافور کا تھا۔ (گویا خود بیان کرنے والوں کو یقین نہیں کہ وہ کس چیز کا درخت تھا)۔

ابلیس جنت سے نکلنے کے بعد حضرت آدمؑ کا دشمن ہو گیا کیونکہ وہ سمجھتا تھا کہ اسی آدمؑ کی وجہ سے اسے جنت سے نکالا گیا۔ چنانچہ اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ حضرت آدمؑ سے اپنی توہین کا انتقام لے گا اور انہیں ورغلا کر اس درخت کا پھل کھانے کی ترغیب دے گا جس کے قریب جانے سے اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ اور حضرت حوّاؑ دونوں کو منع فرمایا ہے۔ اب اس کے لئے جنت میں جانا ممکن نہ تھا کیونکہ خدا تعالیٰ نے اسے اس مقدس مقام کی حدود سے نکال دیا تھا۔ اس مقصد کے لئے اس نے سانپ کو اپنا ہم نوا بنایا اور اسے رضامند کر کے اس کی پیٹھ پر سوار ہوا اور جنت میں داخل ہو گیا۔ جنت میں پہنچ کر وہ حضرت حوّاؑ سے ملا اور انہیں یہ کہہ کر ورغلایا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں اس درخت کا پھل کھانے سے اس لئے روکا ہے کہ کہیں تم دونوں ہمیشہ کی زندگی حاصل نہ کر لو۔ حضرت حوّاؑ ابلیس کے ورغلانے میں آ گئیں۔ انہوں نے حضرت آدمؑ کو یہ پھل کھانے پر آمادہ کر لیا۔ اس طرح خود بھی یہ پھل (گندم) کھایا اور اپنے شوہر نامدار کو بھی کھلایا۔ یہ پھل کھاتے ہی دونوں کے جسم سے جنتی لباس اُتر گیا۔ دونوں برہنہ ہو گئے' اپنی برہنگی چھپانے کے لئے انہوں نے جنت کے درختوں کے پتوں سے اپنا ستر ڈھانکا۔ دونوں اپنے اس فعل پر سخت نادم ہوئے اور اللہ تعالیٰ کے حضور صدق دل سے توبہ کر کے اپنی اس لغزش کی معافی مانگی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول فرمائی مگر ساتھ ہی فرمایا کہ اب تم دونوں جنت میں نہیں رہ سکتے۔ اب تمہیں ایک مقررہ مدت تک زمین پر رہنا ہو گا۔ اس کے بعد اس نے حضرت آدمؑ اور حضرت حوّاؑ دونوں کو زمین پر اُتار دیا جہاں ان دونوں سے نسل انسانی کا آغاز ہوا۔ اس کا طریقہ یہ تھا کہ حضرت حوّاؑ کے بطن سے ایک بچہ صبح کو پیدا ہوتا تھا اور ایک شام کو۔ صبح کو پیدا ہونے والے لڑکے کی شام کو پیدا ہونے والی لڑکی سے شادی کر دی جاتی تھی۔ اس طرح نسلِ انسانی دنیا میں پھیلنے لگی

یہاں تک کہ زمین انسانوں سے بھر گئی۔ سانپ نے چونکہ بغاوت' سرکشی اور نافرمانی کے کام میں ابلیس کے ساتھ تعاون کیا تھا اور اسے اپنی پیٹھ پر بٹھا کر اس جنت میں لے گیا تھا جس سے اس راندۂ درگاہ کو نکال دیا گیا تھا اس لئے خدا نے سانپ کو اس جرم کی یہ سزا دی کہ اسے پیروں سے محروم کر دیا اور فرمایا کہ جا قیامت تک تو پیٹ کے بل رینگ رینگ کر چلا کرے گا۔

چند سوالات

یہ ہے حضرت آدمؑ کی تخلیق کی وہ داستان جو ہمیں سنائی جاتی ہے اور جس سے ہمارا لٹریچر بھرا پڑا ہے۔ اس داستان کو پڑھ کر ہر ذی فہم' روشن خیال اور غور و فکر کرنے والے شخص کے ذہن میں کچھ سوالات پیدا ہوتے ہیں جن کا وہ جواب چاہتا ہے مثلاً:

(۱) جس ہستی کو سڑے ہوئے اور بدبودار گارے سے پیدا کیا گیا کیا وہ خدا کا مقدس نبی تھا؟ کیا خدا کو ایک نبی پیدا کرنے کے لئے سڑے ہوئے بدبودار گارے کے علاوہ اور کوئی مادّہ نہیں ملا؟

(۲) کیا خدائے قدوس کی مقدس بارگاہ میں بدبودار گارا لے جایا گیا؟

(۳) کیا ابلیس فرشتہ تھا؟

(۴) کیا فرشتہ گناہ یا خدا کی نافرمانی کر سکتا ہے؟

(۵) کیا ابلیس ابھی تک بقیدِ حیات ہے؟

(۶) کیا حضرت آدمؑ اُس جنت میں پیدا کئے گئے تھے جس میں انسان موت کے بعد اپنے حسنِ عمل کی بنا پر داخل ہوگا؟

(۷) کیا گناہ' نافرمانی' ساری بدیوں بلکہ تمام خباثتوں کا آغاز جنت میں ہوا؟

(۸) جس درخت کے پاس جانے سے حضرت آدمؑ کو منع کیا گیا تھا کیا وہ گندم کا درخت تھا؟ یا انگور کا یا کافور کا؟ یا انجیر کا؟

(۹) کیا خداوند تعالیٰ کے علاوہ حضرت آدمؑ کو بھی سجدہ کیا گیا اور ایک وقت میں دو

مسجود ہو گئے؟

(۱۰) کیا حضرت حواؑ کو حضرت آدمؑ کی پسلی سے پیدا کیا گیا؟

جو لوگ تخلیق آدم کی اس داستان پر یقین رکھتے ہیں ان کا فرض ہے کہ وہ ان سوالات کا جواب دیں اور ان لوگوں کو مطمئن کریں جن کے ذہن میں یہ سوالات پیدا ہوتے ہیں کیونکہ مذہب اور خصوصاً اسلام کسی سے کوئی بات جبراً نہیں منواتا بلکہ ہر شخص کو غور و فکر کی اجازت بلکہ خود دعوت دیتا ہے اور ہر شبہ کو دلائل و براہین سے دور کرتا ہے مگر ہماری بدقسمتی ہے کہ ان سوالات کا جواب مانگنے والوں یا ان کا منطقی جواب دینے والوں کو گمراہ قرار دے کر ان پر کفر کا فتویٰ لگا دیا جاتا ہے اور کفار کی فوج ظفر موج میں جو پہلے ہی کم نہیں اور اضافہ کیا جاتا ہے لیکن ظاہر ہے کہ اس کے باوجود مسئلہ وہیں کا وہیں رہتا ہے کیونکہ کسی مسئلے کا حل دریافت کرنے والے یا اس کا منطقی جواب دینے والے کو کافر کہہ دینے سے مسئلہ تو حل نہیں ہوتا۔ اگر کچھ ثابت ہوتا ہے تو صرف اتنا کہ کفر کا فتویٰ جاری کرنے والے کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں اور اس نے جو داستان بیان کی ہے وہ اتنی کمزور ہے کہ معمولی سی تنقید کرنے سے اس کا سارا تانا بانا ٹوٹ جانے کا اندیشہ ہے اس لئے اس کے نزدیک اس کا حل یہی ہے کہ لوگوں کو خاموش کر دو' ان کی فکر پر پہرے بٹھا دو مگر اس روشن دور میں جب انسان زمین کی گہرائیوں میں اُتر کر اس کے پوشیدہ خزانے نکال رہا ہے اور آسمان کی حدود میں پہنچ کر ستاروں اور سیاروں کے سینے میں شگاف ڈال رہا ہے اسے محض قصے کہانیوں سے نہیں بہلایا جا سکتا نہ کفر کا فتویٰ لگا کر حقائق کی تلاش سے روکا جا سکتا ہے' ان سوالات کے جوابات بہر حال دینے ہوں گے۔

کچھ حقیقت' کچھ افسانہ؟

سب سے پہلے تو یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہئے کہ حضرت آدمؑ کی تخلیق سے متعلق جو داستان عام طور پر مشہور ہے اور جس کی ایک جھلک سطور بالا میں پیش کی گئی ہے اس کا قرآن حکیم سے دور کا بھی تعلق نہیں۔ اس میں کچھ حقائق ہیں جن کی قرآن سے

تصدیق ہوتی ہے' کچھ اسرائیلیات ہیں جو بائیبل سے لی گئی ہیں اور کچھ کہانیاں ہیں جو زمانۂ قدیم سے لوگ سنتے چلے آ رہے ہیں۔ حقائق صرف اتنے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کو پیدا کیا' انہیں اپنا نبی بنایا' فرشتوں کو ان کی تعظیم کا حکم دیا' ابلیس نے انکار کیا اور خدا کی رحمت سے محروم کر دیا گیا' حضرت آدمؑ اور حضرت حواؑ کو ایک امر سے بچنے کا حکم دیا گیا مگر وہ اپنی بشری کمزوری کی بنا پر اس سے نہ بچ سکے کیونکہ شیطان نے ان دونوں کو ورغلا دیا' جلد ہی انہیں اپنی اس لغزش کا احساس ہو گیا' انہوں نے اللہ تعالیٰ سے توبہ کی' خدا نے ان کی توبہ قبول فرمائی اور اس جگہ سے چلے جانے کا حکم دیا جہاں ان سے یہ لغزش سرزد ہوئی تھی' باقی امور بطور استعارات بیان کئے گئے تھے جنہیں حقیقت پر محمول کر لیا گیا یعنی ان کے ظاہری معنی مراد لے لئے گئے لیکن اگر تھوڑا سا تدبر کیا جائے تو حقائق نقاب الٹ کر ہمارے سامنے آ جائیں گے۔

نظریۂ ارتقا

اس حقیقت سے تو انکار نہیں کیا جا سکتا کہ تلاش و تحقیق کا جذبہ انسانی فطرت میں ودیعت کیا گیا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو آج انسان ترقی کی اس معراج پر کبھی نہ پہنچتا۔ ہم کون ہیں؟ کب سے ہیں؟ انسان اول دن سے اپنی موجودہ شکل وصورت میں موجود تھا یا مختلف ارتقائی ادوار سے گزر کر موجودہ حالت تک پہنچا؟ اسی طرح یہ کائنات آناً فاناً معرض وجود میں آ گئی یا یہ بھی ادنیٰ حالت سے ترقی کر کے کروڑوں اور اربوں سال کے ارتقائی عمل کے نتیجے میں موجودہ حالت تک پہنچی؟ یہ وہ سوالات ہیں جو مدتوں سے انسانی ذہن میں پیدا ہوتے چلے آ رہے ہیں اور ان کے جواب بھی ہر دور کے دانشور اپنی اپنی استعداد کے مطابق دیتے چلے آ رہے ہیں۔ یہ سلسلہ معلوم نہیں کب تک جاری رہے گا کہ انسانی ذہن تلاش و تحقیق سے کبھی فارغ نہیں ہو سکتا۔

ایک بات تو نہایت واضح اور عین مطابق عقل ہے بلکہ روزمرہ کا مشاہدہ بھی جس کی شہادت دیتا ہے کہ کوئی چیز اچانک پیدا نہیں ہو جاتی' یک دم معرض وجود میں نہیں آ جاتی

یعنی ایسا نہیں ہوتا کہ کاشتکار زمین میں بیج ڈال کر ہٹے اور فوراً گندم کا پودا نمودار ہو جائے' اس میں بالیں لگ جائیں اور دوسرے لمحے خوشے پک کر کاشتکار کی جھولی میں آ گریں۔ نہ ایسا ہوتا ہے کہ مرد وعورت کی یکجائی کے دوسرے ہی لمحے تندرست وتوانا بچہ شکم مادر سے باہر آ جائے اور تیسرے لمحے وہ بالغ مرد یا بالغ عورت کی صورت میں سامنے آ کھڑا ہو۔ ہر چیز کی پیدائش کا عمل ایک طویل ارتقاء سے گزرتا ہے اس کے بعد ہی وہ چیز اپنی مکمل شکل میں ظاہر ہوتی ہے اسے مزید تکمیل کے لئے پھر کچھ اور مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ اسی طرح ہماری یہ کائنات بھی اچانک وجود میں نہیں آئی بلکہ اسے بھی ارتقائی عمل سے گزرنا پڑا۔ یہ ہمارا خود ساختہ نظریہ نہیں بلکہ قرآن حکیم اس کی تائید کرتا اور وہی ہمیں اس حقیقت کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ کاش لوگوں نے قرآن کریم کا باریک بینی سے مطالعہ کیا ہوتا چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔

''وہی (اللہ) ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ ایام میں پیدا کیا''۔ (سورہ ھود' آیت نمبر ۷)

کائنات کی یہی مدت تخلیق بائیبل میں بھی بیان کی گئی ہے چنانچہ لکھا ہے کہ ''چھ دن میں خداوند نے آسمان اور زمین کو پیدا کیا اور ساتویں دن آرام کر کے تازہ دم ہوا''۔ (بائیبل ''خروج'' باب ۳۱' آیت نمبر ۱۷)

چونکہ قرآن کا خدا تھکتا نہیں کہ اسے آرام کی ضرورت پیش آئے اس لئے قرآن نے زمین وآسمان کی تخلیق کی مدت بیان کرنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی فرما دیا کہ اللہ تھکا نہیں۔ اس کے باوجود بائیبل اور قرآن دونوں متفق ہیں کہ زمین وآسمان کی تخلیق کا عمل چھ ایام میں مکمل ہوا۔ اب دیکھئے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک ''یوم'' کی تعریف کیا ہے۔ پہلے انجیل مقدس کا بیان ملاحظہ ہو کہ وہ بھی خدا کی کتاب ہے اور تحریف کے باوجود بعض حقائق آج بھی اپنی اصل صورت میں اس کے اندر موجود ہیں چنانچہ فرمایا ''اے عزیزو! یہ خاص بات تم پر پوشیدہ نہ رہے کہ خداوند کے نزدیک ایک دن ہزار برس کے برابر ہے اور ہزار برس ایک دن کے برابر ہے''۔ (پطرس (۲) باب ۳ آیت ۸) قریباً چھ سو سال کے بعد یہی حقیقت

اللہ تعالیٰ نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہونے والے قرآن میں بیان کی اور فرمایا کہ ''ہمارا ایک دن تمہارے ایک ہزار سال کے برابر ہوتا ہے''۔ (السجدہ آیت نمبر ۵)

یعنی جب ہم کہتے ہیں کہ فلاں کام ہم نے ایک دن میں کیا تو اے لوگو! تم یہ نہ سمجھ بیٹھنا کہ اس سے ہماری مراد تمہارا ۲۴ گھنٹے کا یوم ہوتا ہے بلکہ ایک دن سے ہماری مراد ایک ہزار سال ہوتی ہے۔ گویا جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم نے زمین وآسمان کو چھ ایام میں پیدا کیا تو اس سے مراد اس کی یہ تھی کہ اس کائنات کی تخلیق کا عمل ہزاروں سال جاری رہا۔ ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ نے ایک یوم کو ہمارے پچاس ہزار سال کے برابر قرار دیا۔ (المعارج آیت نمبر ۴) گویا تخلیق کا یہ عمل لاکھوں سال جاری رہا۔ اب ظاہر ہے کہ خداوند تعالیٰ ایک سے لے کر ایک کروڑ یا ایک ارب تک گنتی تو نہیں گنتا اس نے ہمیں سمجھانے کے لئے بتا دیا کہ اس کا ایک دن کبھی ہمارے ایک ہزار سال اور کبھی ہمارے پچاس ہزار سال کے برابر ہوتا ہے اور کبھی اس سے بھی زیادہ سال کے برابر کیونکہ عربی زبان میں یوم کے معنی ہیں ''الوقت مطلق''۔ (لسان العرب جلد نمبر ۱۲ صفحہ نمبر ۶۵۰ مطبوعہ بیروت)

گویا ''وقت مطلق'' کے معنی ہیں ایسا وقت جس کی حد بندی نہ کی جا سکے جو ایک ہزار سال بھی ہو سکتا ہے اور ایک کروڑ سال، ایک ارب سال اور ایک کھرب سال بھی۔ یوم کے دوسرے معنی ہیں الدھر یعنی ''زمانہ'' ...... ''دور''۔ گویا اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کی تخلیق کا عمل چھ ادوار میں مکمل فرمایا۔ ہر دور طویل ترین مدت پر پھیلا ہوا تھا۔ اس طرح خود ارشاد خداوندی ہی سے ثابت ہو گیا کہ یہ کائنات چشم زدن یعنی پلک جھپکنے میں پیدا نہیں ہوئی بلکہ چھ ادوار کے طویل ترین ارتقائی مراحل سے گزر کر اپنی موجودہ حالت تک پہنچی۔ یہ بہت غور کا مقام ہے کہ جب یہ کائنات اچانک پیدا نہیں ہوئی تو Logic (منطق) کا تقاضا ہے کہ اس میں پائی جانے والی ہر چیز ارتقائی مراحل سے گزرے۔ ان اشیاء میں سر فہرست اور سب سے قیمتی چیز انسان ہے۔ یہ بھی اچانک پیدا نہیں ہو گیا بلکہ اسے بھی ارتقائی مراحل سے گزرنا پڑا۔

نظریۂ ارتقا کا مسلمان بانی

بظاہر یہ عجیب بات ہے کہ موجودہ سائنس کی اس حقیقت کا ادراک سب سے پہلے عالم اسلام کے عظیم مفکر اور سائنس داں علامہ ابن مسکویہؒ کو ہوا جو آج سے قریباً ایک ہزار سال قبل ایران میں پیدا ہوئے جب یورپ جہالت کی تاریکیوں میں بھٹکتا پھر رہا تھا۔ علامہ ابن مسکویہؒ نے طویل مشاہدے اور غور و خوض کے بعد اپنا یہ نظریہ پیش کیا کہ انسان موجودہ شکل و صورت اور جسمانی حالت میں اچانک ظہور پذیر نہیں ہوا بلکہ ایک طویل ارتقائی پروسیس سے گزر کر موجودہ حالت میں پہنچا چنانچہ وہ اپنی کتاب ''الفوز الاصغر'' میں اپنی تحقیق درج کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:۔

''جمادات کا آغاز بیج کے بغیر ہوتا ہے یعنی وہ کسی بیج سے پیدا نہیں ہوتے۔ انہی جمادات میں سے بعض نے ایک دور میں داخل ہو کر گھاس کی شکل اختیار کی۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ گھاس کا بھی بیج نہیں ہوتا اور یہ صرف جڑوں کے سہارے بڑھتی ہے۔ گویا گھاس جمادات کی پہلی ترقی یافتہ شکل ہے۔ اس کے بعد نباتات میں ارتقاء شروع ہوا اور وہ نباتات رونما ہوئے جو بیج سے پیدا ہوتے ہیں۔ ان کی شاخیں ہوتی ہیں، پھل پھول آتے ہیں۔ یہ خودرو ہوتے ہیں اور جنگلوں اور پہاڑوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ ان کے بعد نباتات کا مزید ارتقا ہوا اور انہوں نے اعلیٰ درجے کا پھل دینے والے درختوں کی صورت اختیار کر لی۔ انہیں دیکھ بھال، خاص موسم اور موزوں آب و ہوا کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان سے اچھا اور کثیر پھل حاصل ہوتا ہے جیسے زیتون، انار، سیب اور انجیر۔ نباتات کا یہ ارتقا جاری رہا یہاں تک کہ وہ کھجور تک پہنچ گیا۔ یہ نباتات کی آخری حد ہے اور حیوانات کی سرحد سے جا ملتی ہے۔ کھجور میں نر اور مادہ ہوتے ہیں اور جب تک نر کھجور کا برادہ مادہ کھجور پر نہ ڈالا جائے اس وقت تک مادہ کھجور پھل نہیں دیتی گویا نر کھجور مادہ کھجور کو حاملہ کرتی ہے۔ یہ نباتات کے ارتقا کی آخری منزل تھی۔ اس آخری منزل کے بعد بعض نباتات نے زمین سے اپنا پیوند توڑ لیا اور زمین سے پیوستہ رہ کر زندہ رہنے کے محتاج نہیں رہے۔ دریائی کیڑے یعنی سیپ اور

مونگے نباتات سے حیوانات کی صورت اختیار کرنے کا پہلا درجہ ہے۔ یہ آنکھ‘ ناک‘ کان اور ہاتھ پیر سے محروم ہوتے ہیں صرف جسم ہی جسم ہوتا ہے محض گوشت کا لوتھڑا البتہ ان میں حس اور معمولی سی حرکت پیدا ہو جاتی ہے۔ چنانچہ کسی زندہ سیپ یا مونگے کو ہاتھ لگایا جائے تو وہ اپنا جسم سکیڑ لیتے ہیں یا سطح زمین سے چمٹ جاتے ہیں۔ پھر اس حس و حرکت میں ارتقا شروع ہوا اور رینگنے والے کیڑے جیسے کیچوے عالم وجود میں آئے۔ یہ جسمانی ارتقاء مزید جاری رہا پھر ایسے جاندار پیدا ہوئے جن میں حواس کی قوتیں موجود تھیں جیسے چیونٹی اور شہد کی مکھی ان میں قوت بینائی بھی ہوتی ہے۔ اس سے آگے بڑھ کر مکمل حیوان جیسے گائے‘ بیل‘ بکری اور گھوڑا وغیرہ پیدا ہوئے۔ اس طرح ان حیوانوں میں جسمانی طور پر ترقی کا عمل جاری رہا اور بعض جانور بندر اور اس سے ملتی جلتی نوع کی صورت میں ظاہر ہوئے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اپنے چہرے اور حرکات کے لحاظ سے بندر کی ایک قسم اور انسان میں بہت مشابہت ہے۔ پھر حیوان اس درجے میں آ گیا کہ اس کی کمر کی ہڈی سیدھی ہو گئی اور وہ چار ہاتھوں پیروں سے چلنے کی بجائے سیدھا ہو کر دو پیروں سے چلنے لگا مگر اس میں عقل اور سمجھ بہت معمولی تھی۔ یہ درجہ حیوان کے مکمل انسان بننے کے قریب تھا۔ اس قسم کی وحشی مخلوق مثلاً افریقہ کے غیر مہذب وحشی آج بھی دنیا کے مختلف حصوں میں موجود ہیں مگر ان میں اتنی صلاحیت نہیں کہ یہ کچھ سیکھ سکیں یا دوسروں کو سکھا سکیں یہاں تک کہ چند ارتقائی ادوار کے بعد ان کی عقل و شعور میں پختگی آ گئی‘ فراست پیدا ہو گئی اور انہوں نے علم و فن میں کمال حاصل کرنا شروع کر دیا‘‘۔ (تلخیص الفوز الاصغر از علامہ ابن مسکویہؒ بحوالہ مقالاتِ شبلی)

ڈارون کا پیش رو

آج مشرق و مغرب دونوں میں ڈارون کے نظریات کا سکہ چل رہا ہے اور تعلیم یافتہ آبادی کا بہت بڑا حصہ اس نظریئے کو قبول کر چکا ہے کہ موجودہ حیوان اور انسان ہمیشہ سے موجودہ شکل و صورت کے حامل نہ تھے بلکہ ان کی ابتداء نہایت معمولی تھی۔ یہ مختلف درجوں سے گزر کر اپنی موجودہ جسمانی ساخت اور شکل و صورت تک پہنچے۔ ڈارون نے یہ

نظریہ ۱۸۵۷ء کے لگ بھگ پیش کیا مگر علامہ ابن مسکویہؒ نے آج سے ایک ہزار سال قبل یعنی ڈارون سے قریباً نوسو سال قبل یہ نظریہ بڑی شرح وبسط سے پیش کیا اور حیات انسانی کی منتشر کڑیاں تلاش کر کے انہیں باہم مربوط کیا۔ گویا وہ دنیا کا پہلا مسلمان مفکر تھا جس نے نظریۂ ارتقا اس وقت پیش کیا جب مغرب جہالت کی تاریکیوں میں ڈوبا ہوا تھا اس اعتبار سے ابن مسکویہؒ جدید فکری نظام کا نقیب اور بانی تھا۔

یہ تو نظریہ تھا مسلمان مفکر اور سائنس داں علامہ ابن مسکویہؒ کا۔ آیئے دیکھیں قرآن حکیم تخلیق آدم کے بارے میں ہماری کیا رہنمائی فرماتا ہے؟

حضرت آدمؑ پہلے انسان نہیں تھے؟

قرآن حکیم سے کہیں یہ ثابت نہیں ہوتا کہ حضرت آدمؑ دنیا کے پہلے انسان تھے اور ان سے پہلے روئے زمین پر کسی انسان کا وجود نہیں تھا کیونکہ نبی ہمیشہ کسی قوم کی طرف بھیجا جاتا ہے۔ وہ دریاؤں کی لہروں، سمندروں کی موجوں یا ریگستانوں کے ذروں کو تبلیغ کرنے اور انہیں انسانیت سکھانے نہیں آتا۔ اگر روئے زمین پر بنی نوع انسان کا وجود نہیں تھا تو حضرت آدمؑ کس کی طرف نبی بنا کر مبعوث کئے گئے؟ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت آدمؑ کی بعثت سے قبل روئے زمین پر انسان موجود تھے جن کی اصلاح کے لئے انہیں دنیا میں بھیجا گیا جس طرح ان کے بعد ہزاروں انبیاء انسانوں اور قوموں کی طرف ہی مبعوث ہوئے۔ قرآن حکیم ہی کی ایک آیت سے اس نظریئے کی تائید ہوتی ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرشتوں کے سامنے زمین پر اپنا ایک خلیفہ مقرر کرنے کے ارادے کے اظہار کا ذکر فرماتا ہے تو فرشتے اللہ تعالیٰ کی خدمت میں عرض کرتے ہیں کہ:۔

قالوا اتجعل فيها من يفسد فيها و يسفك الدماء ج (سورہ البقرہ آیت ۳۰)	(انہوں نے یعنی فرشتوں نے) ''کہا کہ آپ زمین میں فساد کرنے والوں اور خون بہانے والوں میں سے خلیفہ) بنائیں گے''۔

یعنی فرشتے اللہ تعالیٰ کے اس ارادے سے باخبر ہو کر بہ طور استفسار عرض کرتے

ہین کہ کیا تو ایسی مخلوق میں سے اپنا خلیفہ بنائے گا جو زمین میں فساد کرتی ہے اور خون بہاتی ہے۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر حضرت آدمؑ سے پہلے زمین پر انسان موجود نہیں تھے تو فرشتوں کو کیسے علم ہو گیا کہ وہ خون بہاتے اور فساد کرتے ہیں کیونکہ فرشتوں کو علمِ غیب حاصل نہیں اور نہ قرآن حکیم سے اس امر کا ثبوت ملتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو انسان کی سرشت اور اس کی فطرت سے آگاہ کر دیا تھا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت آدمؑ کے خلیفہ بنائے جانے سے پہلے روئے زمین پر بنی نوع انسان موجود تھے جو آپس میں لڑتے اور ایک دوسرے کا خون بہاتے تھے۔ انہیں باہم خوں ریزی کرتے دیکھ کر فرشتوں نے اللہ تعالیٰ کی خدمت میں عرض کیا تھا کہ کیا آپ ایسے شخص کو زمین پر اپنا نائب بنائیں گے جس کے گروہ میں فتنہ وفساد کرنے اور خون بہانے والے لوگ شامل ہیں۔ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ فرشتوں کا اشارہ حضرت آدمؑ کی طرف تھا کہ وہ خون بہائیں گے اور فتنہ وفساد کریں گے تو یہ خیال، عقیدہ اور واقعات دونوں لحاظ سے غلط ہے کیونکہ خدا کا نبی فتنہ وفساد نہیں کرتا۔ دوسرے حضرت آدمؑ نے زمین پر خدا کا خلیفہ مقرر ہونے کے بعد کبھی خون ریزی نہیں کی۔ پس اس سے ثابت ہوا کہ فرشتوں کا اشارہ ان انسانوں کی طرف تھا جو اس وقت روئے زمین پر موجود تھے۔ اگر یہ کہا جائے کہ فرشتوں کا اشارہ ان لوگوں کی طرف تھا جو حضرت آدمؑ کی نسل سے دنیا میں پیدا ہونے والے تھے تو اس پر پھر یہی اعتراض وارد ہوتا ہے کہ ابھی جبکہ حضرت آدمؑ کی نسل کا آغاز ہی نہیں ہوا تھا، فرشتوں کو کیسے معلوم ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ جس ہستی کو اپنا خلیفہ بنانے والا ہے اس کی نسل میں مفسد اور خوں ریزی کرنے والے لوگ پیدا ہوں گے۔

بشر اور آدمؑ میں فرق

دراصل یہ ساری غلط فہمیاں اس لئے پیدا ہوئیں کہ انسان، بشر اور آدم کو ایک ہی وجود سمجھ لیا گیا حالانکہ انسان، بشر اور آدم تینوں الفاظ قرآن حکیم نے مختلف معنی میں استعمال کئے ہیں مثلاً ایک مقام پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ:۔

ولقد خلقنا الانسان من صلصال من حمامسنون ٥ (سورہ الحجر آیت نمبر ۲۶)

''اور ہم نے انسان کو بجتی ہوئی مٹی سے جو سڑے ہوئے گارے سے بنی تھی پیدا کیا''۔

یہاں یہ نہیں فرمایا کہ ہم نے سڑے ہوئے گارے سے آدمؑ کو پیدا کیا بلکہ فرمایا کہ انسان کو پیدا کیا۔ آگے چل کر اسی سورت میں فرمایا کہ:۔

واذ قال ربك للملٰئكة انی خالق بشراً من صلصال من حمامسنون ٥ فاذا سویته ونفخت فیه من روحی فقعوا له سجدین ٥ (سورہ الحجر آیت نمبر ۲۸و۲۹)

(اور وہ وقت یاد کرنے کے قابل ہے)''جب آپ کے رب نے ملائکہ سے (ارشاد) فرمایا کہ میں ایک بشر کو بجتی ہوئی مٹی سے جو کہ سڑے ہوئے گارے کی بنی ہوگی پیدا کرنے والا ہوں۔ سو جب میں اس کو پورا بنا چکوں اور اُس میں اپنی (طرف سے) جان ڈال دوں تو تم سب اس کے روبرو سجدے میں گر پڑنا''۔ (اردو ترجمہ مشہور عالم دین مولانا اشرف علی صاحب تھانوی کا ہے)

یہاں بھی اللہ تعالیٰ فرشتوں کو سڑے ہوئے گارے سے جس ہستی کے پیدا کرنے کی اطلاع دیتا ہے اسے آدم کے نام سے موسوم نہیں فرماتا بلکہ اسے بشر کے نام سے موسوم فرماتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہیں اس امر کی وضاحت فرما دی کہ کہیں لوگ اس بشر کو حضرت آدمؑ نہ سمجھ لیں چنانچہ فرمایا کہ جب میں اسے پورا بنا چکوں یعنی جس وقت یہ بشر مکمل ہو جائے اور اس کے بعد جب میں اس میں اپنی روح پھونک دوں پھر تم اس کے سامنے سجدے میں گر جانا (یعنی اس کی تعظیم کرنا)۔

یہاں یہ نکتہ یاد رکھنے اور ذہن نشین کرنے کے لائق ہے کہ مندرجہ بالا آیات کی رو سے اللہ تعالیٰ انسان کی پیدائش کے تین دور مقرر فرماتا ہے:۔

(۱) پہلے وہ فرشتوں پر اپنا یہ ارادہ ظاہر فرماتا ہے کہ میں سڑے ہوئے گارے سے

ایک وجود تخلیق کروں گا مگر اسے آدم کا نام نہیں دیتا بلکہ انسان کے نام سے موسوم کرتا ہے۔

(۲) پھر فرماتا ہے کہ جب میں بشر کو مکمل کرلوں یعنی اس کی تکمیل کے دور کا ذکر کرتا ہے۔ یہاں اسے بشر کے نام سے موسوم کرتا ہے۔ آدم کا لفظ یہاں بھی استعمال نہیں فرماتا۔

(۳) اس کے بعد فرماتا ہے کہ جب اس میں اپنی روح پھونک دوں۔ یہاں اسے ''آدم'' کے نام سے موسوم کرتا ہے یہاں اسے انسان یا بشر نہیں کہتا۔

گویا اللہ تعالیٰ نے آدم کو یک دم نہیں بنایا۔ پہلے اپنے ارادے کا اظہار فرمایا' ارادہ ظاہر کرنے کے بعد فرمایا کہ اب میں نے نسلِ آدم کی پیدائش کا عمل شروع کر دیا ہے یعنی انسان سڑے ہوئے گارے سے رفتہ رفتہ جسمانی شکل اختیار کر رہا ہے کیونکہ فرماتا ہے کہ جب ''میں اسے پورا بنا چکوں''۔ یہ الفاظ ثابت کرتے ہیں کہ انسان کی ابتدا سے لے کر اس کے ''پورا بننے'' یعنی مکمل ہونے تک کچھ مدت صرف ہوئی اور اسے کئی ادوار سے گزرنا پڑا ورنہ اللہ ''اسے پورا بنا چکوں'' کے الفاظ کبھی استعمال نہ فرماتا۔ پھر فرمایا کہ جب ''میں اس میں اپنی روح پھونک دوں''۔۔۔ یعنی بشر جسمانی طور پر مکمل ہو جانے کے بعد بھی اس وقت تک مکمل نہیں ہوگا جب تک اللہ تعالیٰ اس میں اپنی روح نہ پھونک دے اور روح کا لفظ قرآن حکیم میں متعدد مقامات پر انسان میں اعلیٰ اخلاقی صفات پیدا کرنے یا روحانی تکمیل کے لئے استعمال ہوا ہے۔ یہاں مفہوم یہ ہے کہ جب انسان میں وحی والہام کو قبول کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے یعنی جب وہ اللہ تعالیٰ کی نیابت کرنے کے قابل ہو جائے اور جب میں اسے اپنا خلیفہ مقرر کر دوں پھر میں تمہیں حکم دوں گا اس وقت تم سب سجدے میں گر جانا (اس کی تعظیم کرنا) اور اس کی فضیلت کا اقرار کرنا۔

آدمی کی تخلیق کے اس تدریجی سلسلے میں اللہ تعالیٰ نے کہیں اسے انسان کے نام سے موسوم کیا کہیں بشر فرمایا۔ اس بشر کے لئے آدم کا لفظ اس وقت استعمال فرماتا ہے جب اس میں اپنی روح پھونکنے کے بعد یعنی روحانی قویٰ عطا فرمانے کے بعد اسے منصب خلافت پر مامور فرماتا ہے اور اسے علم سکھاتا ہے۔ وہ مقام یہ ہے:۔

واذ قال ربك للملٰئكة انی جاعل فی الارض خلیفة ط (سورہ البقرہ آیت نمبر ۳۰)
''اور جس وقت ارشاد فرمایا آپ کے رب نے فرشتوں سے کہ ضرور میں بناؤں گا زمین میں ایک نائب''۔

اس آیت کے فوراً بعد فرمایا کہ:

وعلم ادم الاسماء کلھا (سورہ البقرہ آیت نمبر ۳۱)
''اور علم دے دیا اللہ نے (حضرت) آدمؑ کو سب چیزوں کے نام کا''۔

یہاں سے اللہ تعالیٰ اس ہستی کو جسے وہ جسمانی و روحانی دونوں لحاظ سے مکمل کر چکا آدم کے لفظ سے موسوم کرتا ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ جس ہستی کو سڑے ہوئے گارے سے پیدا کرنے کی خبر دی گئی تھی وہ کوئی اور تھا اور جسے اللہ تعالیٰ نے آدم کے نام سے موسوم کر کے فرشتوں کو اس کی تعظیم کا حکم دیا وہ کوئی اور وجود تھا۔

چنانچہ برصغیر پاک و ہند کے مشہور عالمِ دین اور مفسرِ قرآن مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم نے بھی تخلیق آدم کے واقعے کی تشریح کرتے ہوئے انسان اور آدم دونوں کو الگ الگ وجود قرار دیا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں:۔

''پہلے انسان کے وجود کی تخلیق ہوئی۔ پھر اس کی صورت بنی۔ پھر وہ وقت آیا کہ جب آدم کا ظہور ہوا''۔ (ترجمان القرآن جلد دوم ص ۲ مولانا ابوالکلام)

مولانا انسان کی تخلیق سے لے کر آدم کے ظہور تک تین دور قرار دیتے ہیں۔ پہلے انسان تخلیق کے دور سے گزرا یعنی اس نے جسمانی ارتقا کے مراحل طے کئے۔ جب اس نے جسمانی ارتقا کا مرحلہ مکمل کر لیا تو دوسرا دور شروع ہوا۔ اس دور میں اس کی موجودہ شکل و صورت یعنی چہرے کی ساخت اور خدوخال نے ارتقائی مراحل طے کئے۔ تیسرے دور میں اس کی دماغی اور روحانی نشوو ارتقا کا عمل مکمل ہوا اور جب انسان جسمانی و روحانی لحاظ سے مکمل ہو گیا تو اس نسل سے ایک ہستی پیدا ہوئی جس کے لئے مولانا ابوالکلام آزاد ''ظہور آدم'' کی ترکیب استعمال کرتے ہیں، اسے انسان کے نام سے موسوم نہیں کرتے جبکہ پہلے

دور کے وجود کو انسان کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔

ان تصریحات کی روشنی میں یہی نظریہ درست ثابت ہوتا ہے کہ حضرت آدمؑ سے پہلے انسان موجود تھے جو جسمانی اور ذہنی لحاظ سے نامکمل تھے۔ یہ ابتدا میں پانی اور مٹی کے مرکب (دلدلوں) میں تخلیق پا رہے تھے۔ جسمانی طور پر مکمل ہونے کے بعد یہ لوگ زمین پر پھیل گئے مگر یہ ابھی تک غیر مہذب اور ناشائستہ تھے، ان میں جنگل کا قانون نافذ تھا، ایک دوسرے کو قتل کرتے اور فتنہ وفساد کرتے رہتے تھے۔ رفتہ رفتہ ان میں سے کچھ لوگ ذہنی اور دماغی طور پر مکمل ہو گئے۔ ان میں جو شخص سب سے زیادہ مکمل اور روشن دماغ تھا اللہ تعالیٰ نے اس میں اپنی روح پھونکی یعنی اسے وحی والہام کی نعمت عطا فرمائی یہ حضرت آدمؑ تھے یہی زمین پر خدا کے خلیفہ اور نائب مقرر ہوئے اور انہی کو اپنے زمانے کے لوگوں کی تربیت اور خدائے واحد کی عبادت کرنے کی دعوت دینے پر مامور فرمایا گیا۔ خدا کے یہ مقدس نبی سڑے ہوئے گارے سے تخلیق نہیں کئے گئے بلکہ ان کی بعثت سے بہت پہلے (جس کی مدت کا حقیقی علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے جو لاکھوں سال بھی ہو سکتی ہے اور کروڑوں سال بھی) ابتدائی انسانوں کی تخلیق کے عمل کا آغاز سڑے ہوئے گارے سے ہوا جس نے بہت سے ادوار سے گزر کر پہلے جسمانی تکمیل کا مرحلہ طے کیا پھر دماغی نشوو ارتقا کا، آخر میں اخلاقی اور روحانی لحاظ سے اس کی تکمیل ہوئی اور پھر وہ وحیٔ الٰہی کو قبول کرنے کے قابل ہوا انہی کو حضرت آدمؑ کے نام سے موسوم کیا گیا۔

حضرت امام رازیؒ کا نظریہ

حضرت امام فخر الدین رازیؒ قرآن حکیم کے عظیم المرتبت مفسر اور اپنے عہد کے سب سے بڑے عالم تھے۔ اس پائے کا عالم اور محقق صدیوں تک پیدا نہ ہو سکا۔ حضرت امامؒ نے بھی اس رائے کا اظہار کر دیا تھا کہ حضرت آدمؑ سے پہلے روئے زمین پر نسلِ انسانی موجود تھی چنانچہ آپؒ ''وعلم ادم الاسماء کلھا'' کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

''لعل هذه اللغات و ضعها اقوام كانوا قبل آدم عليه السلام

ثم انہ علمھا الادم علیہ السلام"۔ (التفسیر الکبیر للامام الفخر الرازیؒ الجز الاول)

حضرت امام صاحبؒ کا مفہوم یہ ہے کہ "ممکن ہے کہ یہ زبانیں اوران کے الفاظ ان اقوام نے وضع کئے ہوں جو حضرت آدمؑ سے پہلے موجود تھیں اور اللہ تعالیٰ نے یہ اسما حضرت آدمؑ کو سکھائے ہوں"۔

اس طرح حضرت امام فخر الدین رازیؒ نے علم الانسانیات کی بنیاد رکھی اور آنے والے محققین کے لئے تلاش وتحقیق کا دروازہ کھول دیا۔ آپؒ نے ہمیں علمی رنگ میں اس حقیقت سے پہلی بار روشناس کرایا کہ حضرت آدمؑ سے پہلے بھی اس روئے زمین پر نسل انسانی موجود تھی، ان لوگوں کی اپنی زبانیں تھیں، ان کے الفاظ تھے، چونکہ حضرت آدمؑ کو ان میں تبلیغ کرنی تھی اس لئے اللہ تعالیٰ نے آپؑ کو ان زبانوں کے اسما سکھائے۔ افسوس کہ حضرت امام فخر الدین رازیؒ کے اس نظریئے کو کتابوں کے انبار کے نیچے دبا دیا گیا۔ اگر اسے آگے بڑھایا جاتا اور اس پر تحقیق کی جاتی تو تخلیق آدم کے بارے میں جو افسانوی قصے ہمارے لٹریچر میں شامل ہو گئے ہیں وہ خارج ہو جاتے اور تخلیق آدم کا نظریہ سائنٹیفک صورت اختیار کر جاتا۔

یہ سعادتِ زمانۂ حال کے جن جلیل القدر مفکروں کو نصیب ہوئی ان میں سے ایک مشہور فاضل اور علامہ جمال الدین افغانی کے شاگرد رشید علامہ مفتی محمد عبدہٗ ہیں اور شاید علامہ مرحوم نے اپنی فکر کا چراغ حضرت امام رازیؒ کے چراغ سے روشن کیا۔ آپؒ نے اس رائے سے اتفاق کیا کہ حضرت آدمؑ سے پہلے روئے زمین پر انسان موجود تھے چنانچہ آپؒ اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں:۔

ذھب بعضھم الی ان ھذا اللفظ یشعر بانہٗ کان فی الارض صنف اواکثر من نوع الحیوانِ ناطق الخ

(تفسیر المنار جلد اول ص ۲۵۷)

یعنی "بعض (اہلِ علم) کی رائے ہے کہ آدم سے پہلے زمین پر حیوانِ ناطق

یعنی بنی نوع انسان کی بہت سی نسلیں موجود تھیں جن میں سے کچھ ہلاک بھی ہو چکی تھیں اور اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی اسی نسل میں سے فرشتوں کو زمین پر اپنا خلیفہ بنانے کی خبر دی تھی"۔

حضرت امام رازیؒ اور علامہ مفتی محمد عبدہ، جیسے فاضل مفکرین اور مفسرینِ قرآن کے نظریات کے بعد اس حقیقت میں کوئی شک وشبہ باقی نہیں رہتا کہ حضرت آدمؑ سے پہلے روئے زمین پر نسل انسانی موجود تھی جس میں خلافتِ الٰہی قائم کرنے کے لئے حضرت آدمؑ کو مبعوث کیا گیا تھا گویا آپؑ سلسلۂ انبیاء کی پہلی کڑی ہیں پہلے انسان ہرگز نہیں۔

آدمؑ کے لئے سجدے کی حقیقت

حضرت آدمؑ کے ظہور کا جو واقعہ بیان کیا جاتا ہے اس کا ایک جزو فرشتوں کا آدم کو سجدہ کرنا بھی ہے۔ قرآن حکیم بھی یہی فرماتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے آدمؑ میں اپنی روح پھونک دی تو ملائکہ سے فرمایا کہ آدم کے سامنے سجدہ کرو، سب نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں سجدے کا جو لفظ استعمال فرمایا ہے اس کا مفہوم ظاہری سجدہ سمجھ لیا گیا حالانکہ کسی نبی کی شریعت میں اللہ تعالیٰ کے سوائے کسی دوسرے کو سجدہ کرنا جائز نہیں۔ چنانچہ قرآن حکیم میں حضرت یوسف علیہ السلام کا ایک خواب اور اس کی تعبیر کا جو واقعہ بیان کیا گیا ہے وہ ہمارے اس نظریئے کی تائید کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوائے کسی دوسرے کو سجدہ کرنے کی کبھی اجازت نہیں دی گئی۔ سورۂ یوسف میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:۔

اذ قال یوسف لابیه یابت انی رایت احد عشر کوکبا و الشمس والقمر رایتهم لی سجدین o (سورہ یوسف آیت نمبر ۴)

"وہ وقت قابل ذکر ہے جب کہ یوسف (علیہ السلام) نے اپنے والد سے کہا کہ ابا جان میں نے (خواب میں) گیارہ ستارے اور سورج چاند دیکھے ہیں ان کو اپنے روبرو سجدہ کرتے ہوئے دیکھا ہے"۔

اس کے بعد جب اس خواب کے پورا ہونے کا وقت آتا ہے یعنی حضرت یعقوب علیہ السلام اپنے گم شدہ فرزند حضرت یوسفؑ کو پالیتے ہیں تو سب اعتراف احسان اور شکرِ نعمت کے طور پر اللہ تعالیٰ کے سامنے سجدے میں گر جاتے ہیں۔ چنانچہ قرآن حکیم اس واقعے کا اس طرح ذکر فرماتا ہے:۔

ورفع ابويه على العرش و خروا له سجداً ج (سورہ یوسف آیت نمبر ۱۰۰)

''اور (حضرت یوسفؑ نے) اپنے والدین کو تخت (شاہی) پر اونچا بٹھایا اور سب کے سب (یوسفؑ کے واقعے کی وجہ سے) سجدے میں گر گئے''۔

اس آیت کی رو سے حضرت یوسفؑ پہلے اپنے والدین کو ایک بلند تخت پر بٹھاتے ہیں اور پھر سب کے سب جن میں حضرت یوسفؑ بھی شامل ہیں سجدے میں گر جاتے ہیں۔ اس کے بعد حضرت یوسفؑ اپنے والد کی خدمت میں عرض کرتے ہیں کہ ''ابا جان یہ ہے میرے خواب کی تعبیر جو میں نے اس سے قبل ایک زمانے میں دیکھا تھا''۔ اس آیت میں حضرت یوسفؑ آگے چل کر کہتے ہیں کہ ''خدا نے میرے ساتھ احسان فرمایا کہ اس نے مجھے قید سے نکالا اور تم سب کو یعنی والدین اور بھائیوں کو جنگل سے یہاں لایا...... اے میرے رب آپ نے مجھے سلطنت میں سے بڑا حصہ عطا فرمایا اور مجھ کو خوابوں کی تعبیر دینا تعلیم فرمایا''۔ (سورہ یوسف آیت نمبر ۱۰۱)

اس آیت میں حضرت یوسفؑ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا ذکر کرتے ہیں، اس کے احسانات یاد کرتے ہیں، اپنی عبودیت کا اعتراف کرتے ہیں، ان احسانات کے نتیجے میں ضروری تھا کہ حضرت یوسفؑ اپنے والدین اور بھائیوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے حضور سجدے میں گر جاتے نہ کہ آپؑ کے والدین اور بھائی آپؑ کے سامنے سجدہ کرتے۔ یہ نہایت احمقانہ خیال ہے۔ خدا کے دو نبیوں حضرت یعقوبؑ اور حضرت یوسفؑ کے بارے میں ایسا سوچنا بھی گناہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان سب پر اس قدر احسانات کئے، ایسے انعامات سے نوازا اور انہوں نے خدا کو سجدہ کرنے کی بجائے اس کے ایک عاجز بندے کو سجدہ کیا جس کا

ان میں سے کوئی ایک نعمت نازل کرنے میں ذرہ برابر حصہ نہ تھا۔کیسی نادانی کی بات اور نہایت مشرکانہ خیال ہے کہ ایک نبی دوسرے نبی کے سامنے سجدے میں پڑا ہوا تھا' باپ بیٹے کو سجدہ کررہا تھا۔ دراصل ہمارے بعض مترجمین اور مفسرین کو حضرت یوسفؑ کے خواب کے ظاہری الفاظ سے غلط فہمی ہوگئی۔

حضرت یوسفؑ نے خواب میں دیکھا تھا کہ آپؑ کے سامنے سورج' چاند اور گیارہ ستارے سجدہ کررہے ہیں۔ اس خواب کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسفؑ اور حضرت یعقوبؑ دونوں کو بشارت دی تھی کہ ایک وقت آئے گا جب حضرت یوسفؑ صاحبِ اقتدار ہوجائیں گے' اس وقت آپؑ کے والدین اور بھائی بھی زندہ ہوں گے' وہ نہ صرف آپؑ سے ملاقات کریں گے بلکہ آپ کے دورِ اقتدار میں شہریوں کی حیثیت سے آباد ہو جائیں گے۔ اس خواب کی تعبیر بعینہٖ پوری ہوگئی کہ حضرت یوسفؑ سے نہ صرف آپؑ کے والدین اور بھائیوں کی ملاقات ہوگئی بلکہ وہ آپؑ کی حدودِ اقتدار سرزمین مصر پر آ کر آباد ہو گئے۔ ظاہر ہے کہ حاکم کے والدین اور بھائی بھی قانوناً اس کی اطاعت کرتے ہیں۔ پس تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہاں سجدے سے مراد حضرت یوسفؑ کو سجدہ کرنا نہیں تھا اور نہ خواب میں سجدہ کرنے سے ظاہری سجدہ مراد تھا کیونکہ اگر سجدے کے ظاہری معنی لئے جائیں تو اس سے بڑھ کر ناشکری اور اپنے مربی و محسن کی ہتک اور کیا ہوسکتی ہے کہ اللہ کے ایک نبی کا محبوب ترین فرزند گم ہوجاتا ہے' اسے کنویں میں ڈال دیا جاتا ہے' اللہ تعالیٰ اسے زندہ اور صحیح سلامت اس کنویں سے نکلوا لیتا ہے' پھر وہ جیل کی تنگ و تاریک کوٹھری میں بند کردیا جاتا ہے' خداوند تعالیٰ اسے اس قید سے نہ صرف رہائی دلواتا بلکہ ایک قیدی کو اقتدار عطا فرما دیتا ہے' اس کے بعد غم زدہ باپ محض اللہ کے فضل اور احسان کی بدولت اپنے گم شدہ بیٹے کو پالیتا ہے اور اپنی آنکھوں سے اسے برسرِ اقتدار دیکھ لیتا ہے۔ گویا خداوند کریم اس غم زدہ نبی پر' اس کے مصیبت زدہ بیٹے پر' اس کی اندوہ گیں ماں اور اس کے بھائیوں سب پر احسان فرماتا ہے' سب کو انعامات سے نوازتا ہے مگر وہ سب اپنے ربِ رحیم کے احسانات کا بدلہ یہ دیتے ہیں کہ ایک بندے کے سامنے سجدہ ریز ہوجاتے ہیں۔ ہر صاحبِ فہم فیصلہ کرسکتا ہے کہ یہ مقام

اللہ تعالیٰ کے حضور سر بسجود ہونے کا تھا یا اس کے ایک عاجز بندے کو سجدہ کرنے کا؟
پس معلوم ہوا کہ سورۂ یوسف کی آیت نمبر ۱۰۰ میں لہٗ سجداً کا مفہوم در حقیقت یہ ہے کہ حضرت یوسفؑ کے اس عظیم الشان واقعے کی وجہ سے ان سب نے اللہ تعالیٰ کو سجدہ کیا کیونکہ اس واقعے کی وجہ سے اس پورے خاندان پر رب کریم نے بہت احسانات فرمائے اور بڑے انعامات سے نوازا تھا۔

قرآن حکیم میں جن مقامات پر اللہ تعالیٰ کے علاوہ انسانوں کے لئے سجدہ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اس کی حقیقت سے ناواقفیت کی وجہ سے بعض حضرات نے یہ موقف اختیار کیا کہ گزشتہ اُمتوں میں انسانوں کا انسانوں کو سجدہ کرنا جائز تھا۔ ہمارے خیال میں اللہ اور اس کے نبیوں کے ساتھ اس سے زیادہ سنگین اور شرمناک مذاق اور کوئی نہیں ہو سکتا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء کا سلسلہ اسی غرض سے شروع فرمایا کہ لوگ عبادت صرف اپنے رب کریم کے لئے مخصوص کر لیں اور اس کے سوائے کسی اور کے روبرو اپنی جبینِ اطاعت خم نہ کریں، پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ ہزاروں سال تک خدا کے نبی اللہ کے بندوں کو اس کے عاجز بندوں کے سامنے سر جھکاتے بلکہ سجدے کرتے دیکھتے رہے اور اس انتہائی غلامانہ فعل سے کبھی نہ روکا جس سے بڑی انسانیت کی توہین ہو ہی نہیں سکتی۔ یہ خدا کے مقدس انبیا پر بہت بڑا افترا ہے کہ انہوں نے ایک انسان کو دوسرے انسان کے سامنے سجدہ کرنے کی اجازت دی اور وہ مقدس نبی جو صرف خدا کے حضور سر بسجود ہونے کی دعوت دینے کے لئے دنیا میں آئے تھے، شرک کی تبلیغ کرتے رہے، ایسا تصور بھی ایمان کو داغ دار بلکہ غارت کر دیتا ہے۔

یہ حقیقت بھی پیش نظر رکھنی چاہئے کہ اس کائنات میں سب سے مقدس اور عظیم ترین ہستی رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تھی کہ خدا کے بعد آپؐ ہی بزرگ و برتر ہیں۔ اگر خدا کے سوائے کسی اور کو سجدہ روا ہوتا تو حضورؐ اقدس کو سجدہ کیا جاتا مگر اللہ تعالیٰ نے فرشتوں اور اپنے بندوں میں سے کسی کو حکم نہیں دیا کہ میرے حبیبؐ مقدس کو سجدہ کرو۔ کیا حضرت آدمؑ اور حضرت یوسفؑ خدا کے محبوب ترین رسول اور خاتم الانبیاء سے بھی بلند مرتبہ کے نبی تھے؟ ظاہر ہے کہ ایسا سوچنا بھی گناہِ عظیم ہے۔

بعض اصحاب نے اس اعتراض سے بچنے کے لئے ایک نئی اختراع کر لی۔ ان حضرات نے فرمایا کہ حضرت آدمؑ کو جو سجدہ کیا گیا تھا وہ تعظیمی تھا حالانکہ نہ قرآن میں سجدۂ تعظیمی کی اصطلاح استعمال ہوئی ہے نہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ اصطلاح استعمال فرمائی۔ اگر سجدۂ تعظیمی کی کچھ حقیقت ہے تو اس قسم کا سجدہ رسولؐ خدا کو تو کبھی نہیں کیا گیا بلکہ ''ایک روز جب حضرت سلمانؓ فارسی نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا کہ وہ آپؐ کو سجدہ (تعظیمی) کرنا چاہتے ہیں تو حضورؐ اقدس نے یہ کہہ کر انہیں روک دیا کہ مخلوق کے لئے ہرگز جائز نہیں کہ وہ خداوند تعالیٰ کے علاوہ کسی اور کو سجدہ کرے''۔ (تفسیر مدارک التنزیل)

اگر فرشتے خدا کی مخلوق ہیں تو ان کے لئے کس طرح جائز تھا کہ وہ خدا کے سوائے حضرت آدمؑ کو سجدہ کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض علماء نے اس رائے کا اظہار کیا کہ یہ سجدہ دراصل اللہ تعالیٰ کو کیا گیا تھا۔ حضرت آدمؑ صرف قبلہ تھے۔ یعنی جس طرح ہم نماز پڑھتے وقت اپنا رُخ قبلہ کی طرف کر لیتے ہیں اور اُسی رُخ پر سجدہ کرتے ہیں مگر یہ سجدہ کعبۃ اللہ کو نہیں ہوتا بلکہ اللہ تعالیٰ کو ہوتا ہے اگرچہ ہمارا رُخ قبلہ کی طرف ہوتا ہے۔ اسی طرح یہ سجدہ بھی اللہ تعالیٰ کو کیا گیا تھا چنانچہ گزشتہ صدی کے مشہور فاضل اور اہلِ حدیث کے امام نواب صدیق حسن خاں صاحب نے بھی اس مکتبۂ فکر کے علماء کا نظریہ اپنی تفسیر میں درج کیا ہے چنانچہ نواب صاحب لکھتے ہیں کہ:۔

''بعض نے کہا ہے کہ یہ سجدہ اللہ تعالیٰ کو تھا۔ آدم قبلہ تھے''۔ (ترجمان القرآن بلطائف البیان جلد اول ص ۶۷ مولفہ نواب صدیق حسن خاں)

گو نواب صاحب مرحوم نے اس نظریے سے اختلاف کیا اور اپنا خیال بیان کرتے ہوئے اتنا اضافہ کر دیا کہ ''ظاہر تر یہی ہے کہ یہ سجدہ آدم کو کیا گیا تھا'' مگر یہ نواب صاحب کا ذاتی خیال ہے۔ انہوں نے علمائے سلف میں سے بعض کا نظریہ بھی پوری دیانت داری سے پیش کر دیا اور ہمیں بتا دیا کہ اُمت میں ایسے علماء بھی گزر چکے ہیں جن کی رائے میں یہ سجدہ اللہ تعالیٰ کو کیا گیا تھا۔ اس سے ثابت ہو جاتا ہے کہ نواب صاحب سے پہلے علماء

کا ایک ایسا گروہ موجود تھا جن کی رائے میں اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو آدم کے سامنے سجدہ ریز ہونے کا حکم نہیں دیا تھا بلکہ آدم کی طرف رُخ کر کے اپنی ہستی کو سجدہ کرنے کا حکم دیا تھا اور اس سے مقصود حضرت آدمؑ کی فضیلت و عظمت کا اعتراف تھا۔

دراصل یہ غلط فہمی سجدے کے اصل معنی کی طرف توجہ نہ کرنے کی وجہ سے پیدا ہوئی۔ عربی میں سجدے کے معنی ہیں تذلل اختیار کرنا' عاجزی اختیار کرنا' اطاعت کرنا۔ چنانچہ امام المحققین القاضی ناصرالدین ابی سعید الشیر ازی البیضاوی اپنی شہرہ آفاق تصنیف میں لکھتے ہیں کہ

"والسجود فی الاصل تذلل مع تطامن۔ قال الشاعر ع

تری الاکم فیھا سجداً للحوافر"۔ (۱)

(تفسیر بیضاوی۔ زیر آیت نمبر ۳۴ سورۃ البقرہ)

امام صاحبؒ کا مفہوم یہ ہے کہ سجدہ دراصل انتہائی تذلل کا مقام ہے جیسا کہ شاعر کہتا ہے کہ "تو ٹیلوں کو دیکھتا ہے کہ وہ گھوڑوں کی ٹاپوں کے آگے سجدہ ریز ہیں"۔ دوسرے لفظوں میں صحرا اور پہاڑ گھوڑوں کی ٹاپوں کے سامنے عاجزی کا اظہار کرتے ہیں۔ گویا عربی زبان میں سجدہ کے اصل معنی ہیں اپنے عجز کا اظہار کرنا' خدمت کرنا' تعاون کرنا۔

قصۂ آدم میں بھی سجدے کے یہی معنی ہیں۔ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کو اپنی خلافت عطا فرمائی تو فرشتوں کو حکم دیا کہ تم اس کی تعظیم کرو اور اس کے ذریعے زمین پر جو روحانی' اخلاقی' معاشرتی اور معاشی نظام قائم کیا جائے گا اس کی تکمیل میں اس کے ساتھ تعاون کرو۔ چنانچہ روحانیت اور ادیانِ عالم کی تاریخ گواہ ہے کہ انبیائے کرام سے لے کر بزرگانِ دین تک فرشتوں نے ان سب کے خادموں کی حیثیت سے کام کیا۔ وہ خدا اور اس کے مقدس بندوں کے درمیان رابطہ بنے اور ان کے ذریعے احکام الٰہی زمین تک پہنچائے گئے' حضرت آدمؑ کو سجدہ کرنے کا یہی مفہوم تھا۔

۱۔ یہ مصرع عرب کے مشہور شاعر زید الخلیلی الطائی کا ہے۔

عورت کو پسلی سے پیدا کرنے کا مفہوم

ظہورِ آدمؑ کے واقعے میں ایک ایسی داستان بھی شامل کر دی گئی جس کی اصلیت سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ ہمارے بعض اسلاف غلط فہمی کا شکار ہو گئے۔ ان کی نیت پر کسی قسم کا شک وشبہ نہیں کیا جا سکتا کہ یہ بڑے نیک نفس اور پاکیزہ سرشت لوگ تھے لیکن یہ خدا کے نبی نہیں تھے جن سے غلطی کا صدور ممکن نہیں' اس مسئلے کی بعض جزئیات ان کی نگاہوں سے مخفی رہیں اس لئے انہوں نے اس داستان کو ایک حقیقت کے طور پر تسلیم کر لیا۔

یہ داستان ہے حضرت حواؑ کی پیدائش کا واقعہ۔ کہا جاتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ حضرت آدمؑ کو پیدا کر چکا تو ان کی تنہائی دور کرنے کے لئے اس نے ان کے لئے ایک ساتھی پیدا کرنے کا ارادہ فرمایا۔ اس مقصد کے لئے اس نے حضرت آدمؑ کے جسم سے ایک پسلی نکال کر اس سے حضرت حواؑ کا ہیولیٰ تیار کیا اور انہیں حضرت آدمؑ کے ساتھ بیاہ دیا۔ دراصل اس داستان کی بنیاد بائبل پر ہے چنانچہ کتابِ مقدس میں لکھا ہے کہ:۔

> ''اور خداوندِ خدا نے آدم پر گہری نیند بھیجی اور وہ سو گیا اور اس نے اس کی پسلیوں میں سے ایک کو نکال لیا اور اس کی جگہ گوشت بھر دیا اور خداوند خدا اس پسلی سے جو اس نے آدم سے نکالی تھی ایک عورت بنا کر اس کے پاس لایا اور آدم نے کہا کہ یہ تو اب میری ہڈیوں میں سے ہڈی اور میرے گوشت میں سے گوشت ہے اس لئے وہ ناری کہلائے گی کیونکہ وہ نر سے نکالی گئی''۔ (پرانا عہد نامہ۔ پیدائش باب نمبر۲)

ظاہر ہے کہ یہ ایک تحریف شدہ کتاب کی روایت ہے۔ یہ درست ہے کہ تحریف شدہ آسمانی کتابوں کے سارے واقعات اور تمام روایات غلط نہیں' ان میں سے بہت سے واقعات درست اور قابل قبول ہیں' ان کی صداقت کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ قرآن حکیم نے ان کی تصدیق کر دی اور انہیں اپنے مضامین عالیہ میں شامل کر لیا۔ اگر یہ واقعہ بھی درست ہوتا تو ضرور اللہ تعالیٰ قرآنِ حکیم میں اسے بیان فرماتا مگر کتابِ مبین کی آیاتِ

بینات میں کوئی ایسی آیت نہیں جس میں اس واقعے کا ذکر تو کیا ہلکا سا اشارہ بھی ملتا ہو اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ واقعہ صرف داستان ہے' اس میں حقیقت کا شائبہ تک نہیں کیونکہ قرآن حکیم اس کی تصدیق نہیں کرتا عقلاً بھی یہ واقعہ نا قابل قبول ہے کیونکہ بائبل میں اس واقعے کی بنیاد اس مفروضے پر رکھی گئی ہے۔

''(خدا کو) آدم کے لیے کوئی مددگار (بیوی) اس کی مانند نہ ملا''۔

عقل اس خیال کو کسی طرح تسلیم نہیں کرتی کہ وہ قادر و توانا خدا جس نے اتنی بڑی کائنات تخلیق کر دی جس کی وسعتوں کی انتہا کا ادراک بھی ممکن نہیں اور سب سے بڑی بات یہ کہ اس قادر مطلق نے آدم جیسا عظیم الشان وجود پیدا کر کے اپنی صفتِ تخلیق کا کمال دکھا دیا' حیرت ہے کہ اسے آدم کے لئے اس کی مانند کوئی ساتھی نہ مل سکا اور آخر اسے آدم کے جسم سے ایک پسلی نکال کر حوا کو پیدا کرنا پڑا۔ روایات کے مطابق جس مادے سے اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کو پیدا کیا تھا کیا وہ ختم ہو چکا تھا؟ کیا وہ اتنی کم مقدار میں تھا کہ اس سے ایک اور وجود تخلیق نہیں پا سکتا تھا؟ خدا کا شکر ہے کہ اس قسم کے جادوگری کے واقعات سے قرآن حکیم پاک اور منزہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی صفتِ خالقیت کو داغ دار کر دیتے ہیں۔

ہمارے بعض مفسر حضرات کو حضرت حوّاؑ کی پیدائش کے سلسلے میں دوسری غلط فہمی قرآن حکیم کی بعض آیات پر پوری طرح تدبر نہ کرنے کی وجہ سے پیدا ہوئی۔ ان میں سے ایک آیت یہ ہے:۔

ھو الذی خلقکم من نفس واحدۃ وجعل منھا زوجھا لیسکن الیھا ج (سورہ الاعراف آیت نمبر ۱۸۹)	''وہ اللہ ہے جس نے تم کو ایک تنِ واحد سے پیدا کیا اور اسی سے اس کا جوڑا بنایا تا کہ وہ اپنے اس جوڑے سے اُنس حاصل کرے''۔

ان حضرات نے نفسِ واحد یا تنِ واحد سے حضرت آدمؑ کو مراد لے لیا اور جوڑا حضرت حوّاؑ کو قرار دے دیا اور اس عبارت کے یہ معنی کئے کہ حضرت حوّاؑ کو حضرت آدمؑ سے پیدا کیا گیا لیکن اس کے بعد کی عبارت پر غور نہیں کیا جس میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ:۔

فلمآ اثقلت دعوا اللّٰہ ربھما لئن اتیتنا صالحاً لنکونن من الشکرین ○ فلما اتھما صالحاً جعلالہٗ شرکاء فیما اتھما فتعلے اللّٰہ عما یشرکون ○ (آیت نمبر ۱۸۹و۱۹۰)

(اس جوڑے نے مباشرت کی اور) ”پھر جب وہ عورت بوجھل ہوگئی تو دونوں میاں بیوی اللہ سے جو کہ ان کا رب ہے دعا کرنے لگے کہ اگر آپ نے ہمیں صحیح وسالم اولاد دے دی تو ہم خوب شکرگزاری کریں گے سو جب اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کو صحیح وسالم اولاد دے دی تو اللہ کی دی ہوئی چیز میں دونوں اللہ کے شریک قرار دینے لگے سو اللہ تعالیٰ پاک ہے ان کے شرک سے“۔

اگر یہ آیات حضرت آدمؑ اور حضرت حوّا کی تخلیق سے متعلق ہیں تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ نعوذ باللہ دونوں مشرک تھے کیونکہ اللہ تعالیٰ ان آیات میں فرماتا ہے کہ جب ہم نے اس جوڑے کو ان کی دعا کے نتیجے میں صحیح وسالم بچہ دے دیا تو وہ دونوں اللہ کی ذات میں دوسروں کو شریک کرنے لگے۔ کیا کوئی مسلمان یہ تسلیم کرے گا کہ حضرت آدمؑ اور حضرت حوّا نے شرک کیا؟ ظاہر ہے کہ اس قسم کا تصور بھی گناہ ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ تنِ واحد سے مراد نہ حضرت آدمؑ ہیں اور نہ اس تنِ واحد سے پیدا ہونے والی حضرت حوّا ہیں بلکہ یہاں اللہ تعالیٰ انسان کی پیدائش کا ایک عام اصول وقانون بیان فرمارہا ہے کہ ہم ایک مرد اور ایک عورت کے ملاپ سے انسان کو تخلیق کرتے ہیں، جب وہ صاحب اولاد ہوجاتے ہیں تو ان میں سے بعض شرک کرنے لگتے ہیں۔ ان آیات سے حضرت حوّا کا حضرت آدمؑ کی پسلی سے پیدا ہونا ہرگز ثابت نہیں ہوتا۔

حضرت حوّا کی پیدائش اسی معروف طریقے سے ہوئی جس طرح دنیا کے انسان پیدا ہوتے ہیں۔ حضرت آدمؑ کے زمانے میں جو چند اچھے اور نیک کردار لوگ تھے ان میں سے ایک نیک خاتون سے حضرت آدمؑ نے شادی کی، یہ نیک خاتون حضرت حوّا تھیں، پسلی سے پیدا کرنے کا واقعہ محض بائیبل کا افسانہ ہے۔ حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

نے اس مسئلے کو بڑے لطیف پیرائے میں حل فرمادیا۔ آپؐ کا ارشادِ مبارک ہے کہ:۔

''عورتوں سے حسن سلوک سے پیش آؤ کیونکہ عورت پسلی سے پیدا کی گئی ہے''۔(مسلم باب الوصیۃ بالنساء)

خیال رہے کہ یہاں حوا نہیں فرمایا بلکہ لفظ عورت استعمال فرمایا ہے۔

اس طرح حضور اقدسؐ نے اس غلط خیال کی تردید فرمادی کہ حضرت حواؑ واقعی حضرت آدمؑ کی پسلی سے پیدا کی گئی تھیں۔ آپؐ کے ارشاد کا مفہوم یہ ہے کہ عورتوں کے ساتھ حکمت عملی سے پیش آؤ کیونکہ ان کی فطرت مردوں سے مختلف ہے۔ اگر ان کے ساتھ ہر موقع پر سختی کا سلوک کرو گے تو وہ دل برداشتہ ہو جائیں گی' ان کے نازک احساسات کو ٹھیس لگے گی۔ جس طرح پسلی کو اگر طاقت سے سیدھا کرنے کی کوشش کی جائے تو وہ ٹوٹ جاتی ہے۔ حضورؐ نے عورت کو پسلی سے تشبیہ دے کر ہمیں ایک اور حقیقت کی طرف متوجہ کیا ہے وہ یہ کہ جس طرح پسلی انسان کے جسم کا بڑا قیمتی اور ضروری حصہ ہے جو اس کے بعض اعضائے رئیسہ کی حفاظت کرتا ہے اور انسانی جسم بلکہ زندگی کے لئے محافظ کی حیثیت رکھتا ہے اسی طرح عورت مرد کے لئے ایک لازمی ضرورت ہے جس کے بغیر اس کی زندگی نامکمل اور غیر محفوظ رہتی ہے جس طرح پسلی انسان کے جسم سے الگ نہیں ہو سکتی اسی طرح عورت کو بھی مرد سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے جذبات اور احساسات وہی ہیں جو مرد کے ہیں' اس کے حقوق وہی ہیں جو مرد کے ہیں۔ اس طرح حضور اقدسؐ نے عورت کو ایک بلند مقام عطا فرمایا اور عرب کے قدیم معاشرے میں جس طرح عورتوں کی تذلیل کی جاتی تھی اس صنفِ لطیف کو اس سے نجات دے کر عزت کے مرتبے پر فائز کر دیا۔

مشہور شارح حدیث اور عالم اسلام کے جید عالم حضرت امام محمد طاہرؒ اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:۔

''حدیث میں عورت کو پسلی سے پیدا کرنے کا ذکر استعارے کے طور پر آیا ہے (یعنی حقیقتاً عورت کو پسلی سے پیدا نہیں کیا گیا) اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کی فطرت اور طبیعت میں ناز و انداز کا عنصر غالب ہوتا ہے'' (اس

لئے مرد کو ممکن حد تک ان کی ناز برداری کرنا چاہیے نہ کہ سختی کر کے ان کے نازک احساسات کو مجروح کیا جائے)۔ (مجمع البحار جلد اول)

عورت کے بارے میں حضورؐ کی ایک اور حدیث ہے جس میں آپؐ نے اس صنفِ نازک کو کانچ کے شیشوں سے تشبیہہ دی ہے چنانچہ محدث امام مسلمؒ اپنی صحیح میں لکھتے ہیں کہ ایک سفر کے دوران کچھ مستورات ایک اونٹ کی محمل میں بیٹھی تھیں اور ناقہ بان اونٹ کی مہار پکڑے چل رہا تھا۔ اثنائے سفر میں وہ حُدی خوانی کرنے لگا یعنی ایسے اشعار پڑھنے لگا جنہیں سن کر اونٹ مست ہو کر اپنی رفتار تیز کر دیتے ہیں۔ یہ دیکھ کر حضورؐ اقدس نے حدی خواں سے فرمایا کہ ''دیکھو کانچ کے ان ظروف کو توڑ نہ دینا''۔ یعنی ایسا نہ ہو کہ اونٹ بھاگنا شروع کر دے اور اس پر سوار عورتوں کو چوٹ لگ جائے۔ یہاں حضورؐ عورت کو نازک شیشہ سے تشبیہہ دیتے ہیں جس طرح اس سے پہلی حدیث میں پسلی سے تشبیہہ دی تھی کیا اس سے یہ ثابت ہوگا کہ عورت کانچ کے شیشے سے بنی ہے؟ ظاہر ہے کہ حضورؐ کا اشارہ عورت کی فطری نزاکت اور صنفی کمزوری کی طرف تھا۔

شیخ الحدیث حضرت امام محمد طاہرؒ کی تشریح اور حضرت امام مسلمؒ کی مندرجہ بالا حدیث نے فیصلہ کر دیا کہ حضرت حواؑ کو پسلی سے پیدا کرنے کا واقعہ محض افسانہ ہے۔ اُن کی پیدائش اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ عام قانون کے مطابق عمل میں آئی۔

حضرت آدمؑ کی جائے پیدائش

ہماری روایات کہتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کو پیدا کرنے کے بعد جنت میں رکھا۔ بلاشبہ قرآن حکیم اس روایت کی تائید فرماتا ہے اور اس مقام کو جنت کے نام سے موسوم کرتا ہے جہاں حضرت آدمؑ مقیم تھے مگر وہ جنت کون سی تھی؟ مشہور عقیدہ یہ ہے کہ وہ جنتِ ارضی نہیں بلکہ وہی جنت تھی جس میں انسان موت کے بعد اپنے حسنِ عمل کی بنا پر داخل کیا جائے گا۔ یہ روایت بھی پہلی روایت کی طرح غلط فہمی پر مبنی ہے۔ اس کا مفہوم سمجھنے میں صحیح تدبر سے کام نہیں لیا گیا اور اس کی تشریح کرتے ہوئے ان روایات کو قبول کر لیا گیا

جو زمانہ قدیم سے مشہور چلی آ رہی ہیں اور بعض تحریف شدہ آسمانی کتابوں کا جزو بن چکی ہیں۔

سب سے پہلی اور غور طلب بات تو یہ ہے کہ جیسا کہ ہم گزشتہ صفحات میں ثابت کر چکے ہیں کہ جب حضرت آدمؑ اسی زمین پر پیدا کئے گئے اور اسی زمین پر بسنے والوں کی ہدایت کے لئے انہیں مبعوث کیا گیا تو انہیں جنت میں لے جانے کی کیا ضرورت تھی۔ دوسری بات یہ کہ حضرت آدمؑ کے قصے میں جو واقعات بیان کئے جاتے ہیں ان کا جنت میں پیش آنا اس پاکیزہ مقام کے شایانِ شان نہیں بلکہ اس سے جنت کی ہتک ہوتی ہے مثلاً کہا جاتا ہے کہ حضرت آدمؑ کو تخلیق کرنے کے بعد جنت میں رکھا گیا' جنت میں ابلیس داخل ہو گیا حالانکہ اللہ تعالیٰ کا معتوب ہونے کے بعد ابلیس پر جنت حرام ہو گئی تھی۔ اس کی کیا جرأت تھی کہ وہ جنت کا رُخ بھی کرتا مگر روایات کے مطابق وہ دھوکا دے کر اور سانپ کی پیٹھ پر سوار ہو کر اس پاک مقام کی حدود میں داخل ہو گیا' اس نے حضرت حواؑ کو ورغلایا' حضرت حواؑ نے اس کے دام فریب میں گرفتار ہو کر حضرت آدمؑ کو بھی اللہ تعالیٰ کی عدول حکمی پر آمادہ کیا' پھر دونوں کو اسی جنت میں یہ سزا ملی کہ ان کے جسموں سے جنتی لباس اتار لیا گیا' اسی جنت سے ان کو نکال دیا گیا۔ اگر یہ واقعات اسی طرح پیش آئے اور جنت میں پیش آئے تو اس سے لازم آئے گا کہ گناہ کا آغاز جنت میں ہوا' یہیں بدی کا بیج بویا گیا' اسی جنت میں حضرت آدمؑ اور حضرت حواؑ کو ننگا کر دیا گیا حالانکہ ایسا تو کوئی شریف اور معقول انسان اس دنیا میں بھی نہیں کرتا کہ کسی کے کپڑے اتار کر برہنہ کر دے اور پھر برہنہ بھی عورت کو کر دے؟

غرض جس پہلو سے دیکھا جائے یہ روایات ناقابلِ قبول ہیں اور ظاہری الفاظ کو حقیقت پر محمول کر دینے سے یہ ساری پیچیدگیاں پیدا ہوئیں ورنہ حقیقت یہ ہے کہ جس جنت میں حضرت آدمؑ پیدا کئے گئے وہ جنتِ آسمانی نہ تھی اور نہ یہ واقعات اس طرح پیش آئے جس رنگ میں انہیں بیان کیا جاتا ہے۔ حضرت آدمؑ اسی دنیا کے کسی خطے میں پیدا ہوئے جو اپنی سرسبزی و شادابی کے وجہ سے جنت نظیر تھا۔ ہمارے اس نظریے کی تائید عہدِ حاضر کے

مشہور عالم اور مفسرِ قرآن مولانا مفتی نعیم الدین صاحب مراد آبادی کی تشریح سے بھی ہوتی ہے چنانچہ مولانا لکھتے ہیں:۔

''حضرت آدمؑ اور حواؑ اور ان کی ذریت کو جوان کے صلب میں سے تھی جنت سے زمین پر اترنے کا حکم ہوا''۔(تفسیر القرآن از مولانا مفتی نعیم الدین صاحب مراد آبادی زیر آیت نمبر ۲۳ سورہ البقرہ)

مولانا ہم پر ایک بہت بڑی حقیقت منکشف فرماتے ہیں جس کی طرف بہت کم لوگوں کی نظر گئی کہ جس جنت سے حضرت آدمؑ اور حضرت حواؑ کو نکالا گیا اس میں صرف یہی دو افراد نہ تھے بلکہ ایک پوری نسل پیدا ہو چکی تھی۔ اس اولاد کی تعداد کتنی تھی؟ اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا اس کا حقیقی علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے۔ یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ حضرت آدمؑ اپنی زوجہ اور اولاد کے ساتھ کتنی مدت جنت میں رہے اور جنت میں آغازِ قیام سے لے کر شیطان کے بہکانے تک کی درمیانی مدت کتنی تھی۔ ہو سکتا ہے کہ وہ سوا یا ڈیڑھ سو سال ہو یا اس سے کم یا کچھ زیادہ ہو۔ بہر حال مولانا مفتی نعیم الدین صاحب کی تحقیق کے مطابق اس دوران حضرت آدمؑ کے ذریعے حضرت حواؑ کے بطن سے اولاد ہوئی اور وہ اپنے بیٹوں، بیٹیوں، پوتوں، پوتیوں، بہوؤں اور نواسے نواسیوں کا قافلہ لے کر جنت سے نکلے۔

یہاں یہ نکتہ بڑا غور طلب ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پیدائش انسانی کا ایک خاص طریقہ مقرر فرمایا ہے یعنی جب تک مرد اور عورت کا جسمانی ملاپ نہ ہو اس وقت تک اولاد پیدا نہیں ہوتی لیکن کیا جنت میں مباشرت یا ہم بستری کا سلسلہ اس مادی جسم کے ساتھ ممکن بھی ہے؟ جنت میں حیض و نفاس کا خون جاری ہونا کیا اس مقام کی پاکیزگی کے شایانِ شان ہے؟ ظاہر ہے کہ اس مادی جسم کے ساتھ توالد و تناسل کے یہ بکھیڑے اسی دنیا سے تعلق رکھتے ہیں، جنتِ سماوی میں نہ اس مادی جسم کا وجود ممکن ہے نہ وہاں اس کی موجودہ حوائج و ضروریات لاحق ہو سکتی ہیں۔ پس اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت آدمؑ اپنی بیوی اور صلبی اولاد کے ساتھ جس جنت سے نکالے گئے وہ جنت سماوی نہیں ہو سکتی۔

مولانا مفتی نعیم الدین صاحب اپنی دینی بصیرت سے اس حقیقت تک تو پہنچے

میں کامیاب ہو گئے کہ جس مقام پر حضرت آدمؑ وحواؑ مقیم تھے وہاں ان سے نسل چلی اور جب وہ اس مقام سے نکالے گئے تو ان کی ذریت موجود تھی جسے مولانا حضرت آدمؑ کی صلبی اولاد قرار دیتے ہیں۔ اس سے آگے چل کر مولانا نے بعض ایسی تفاسیر کا سہارا لے لیا جس میں روایتی داستانیں بیان کی گئی ہیں اور موصوف نے حضرت آدمؑ کی پیدائش کو جنتِ سماوی کا واقعہ قرار دیا ورنہ حقیقت وہی ہے جس کی طرف مولانا مفتی نعیم الدین صاحب نے اپنی تفسیر میں اشارہ فرمایا ہے کہ حضرت آدمؑ اور حضرت حواؑ جس مقام پر مقیم تھے وہاں ان سے اولاد پیدا ہوئی اور ظاہر ہے کہ مرد اور عورت کے جسمانی ملاپ سے اولاد ہماری اسی دنیا میں پیدا ہوتی ہے۔ پس ثابت ہوا کہ حضرت آدمؑ وحواؑ کو اسی دنیا کے کسی خطے میں پیدا کیا گیا اور وہیں ان سے اولاد پیدا ہوئی جسے لے کر وہ کسی دوسرے مقام کی طرف ہجرت کر گئے کیونکہ یہاں دشمن (ابلیس) نے ان کے لئے حالات کو ناسازگار بنا دیا تھا۔ گویا ہجرت جو سنت انبیاء ہے اس کا آغاز حضرت آدمؑ سے ہوا۔

حضرت آدمؑ کی جائے پیدائش اور اکابرِ اسلام

علامہ امام فخر الدین رازیؒ نے اپنی تفسیر کبیر میں حضرت آدمؑ کی جائے پیدائش کے سلسلے میں جو تحقیق کی ہے افسوس کہ اس کی طرف توجہ نہیں دی گئی اور زیادہ معروف روایتوں کو جو کمزور تھیں قبول کر لیا گیا شائد اس لئے کہ ان روایتوں میں افسانویت کا عنصر غالب تھا اور بد قسمتی سے ہم حقیقت سے زیادہ افسانے سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ چنانچہ امام فخر الدینؒ رازی فرماتے ہیں کہ:۔

''ابوالقاسم بلخیؒ اور ابو مسلم اصفہانیؒ کا نظریہ ہے کہ جس جنت میں حضرت آدمؑ کو پیدا کیا گیا وہ زمین پر تھی۔ اُترنے سے مراد ایک مقام سے دوسرے مقام کی طرف منتقل ہونا ہے جیسا کہ قرآن حکیم میں ارشادِ خداوندی ہے کہ "اھبطوا مصراً" (کسی شہر کی طرف چلے جاؤ)''۔ (التفسیر الکبیر للامام فخر الدین رازیؒ آیت نمبر ۳۵ سورہ البقرہ)

عالم اسلام کے دو جلیل القدر مفکرین ومفسرین کی آراء بیان کرنے کے بعد امام

رازیؒ حضرت آدمؑ کو جنت میں پیدا کئے جانے کی روایتی داستان پر تنقید کرتے ہوئے اس پر چھ اعتراض کرتے ہیں:۔

(۱) جس جنت میں حضرت آدمؑ کو پیدا کیا جانا بیان کیا جاتا ہے اگر وہ جنت اُخروی ہوتی تو اس میں شیطان حضرت آدمؑ کو دھوکا نہیں دے سکتا تھا۔

(۲) اُخروی جنت میں داخل ہونے والے کو ارشادِ قرآنی کی رُو سے اس جنت سے نکالا نہیں جاسکتا جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ "وما ھم منھا بمخرجین" (اور وہ اس (جنت) میں سے نکالے نہیں جائیں گے)۔

(۳) اگر یہ جنت اُخروی ہوتی تو ابلیس جو انکارِ سجدہ کی وجہ سے ملعون اور غضبِ الٰہی کا مورد ہو چکا تھا جنت الخلد تک رسائی نہیں پا سکتا تھا۔

(۴) جنت دار الثواب ہے، جس کی نعمتیں کبھی ختم نہیں ہوسکتیں لیکن جب حضرت آدمؑ اس میں سے نکلے تو ساری نعمتیں اور راحتیں ان سے چھن گئیں۔

(۵) یہ امر اللہ تعالیٰ کی حکمت کے منافی ہے کہ وہ انسان کو ابتدا ہی میں ایسی جنت میں پیدا کرے جس میں اس کے لئے تکلیف تو کوئی نہ ہو مگر اسے جزا ضرور ملے۔

(۶) اس امر میں کوئی نزاع نہیں کہ حضرت آدمؑ کو زمین پر پیدا کیا گیا اور اس قصے میں کہیں ذکر نہیں کہ اللہ تعالیٰ پھر انہیں آسمان کی طرف لے گیا اگر ایسا ہوتا تو آسمان پر لے جانے کا ذکر بہت زیادہ ضروری تھا کیونکہ زمین سے آسمان کی طرف جانا بہت بڑی نعمت تھی لیکن اس کا کوئی ذکر نہیں پس اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت آدمؑ جس جنت میں مقیم تھے وہ اُخروی جنت نہیں تھی بلکہ اس کے علاوہ کوئی اور جنت تھی۔ (التفسیر الکبیر زیر آیت نمبر ۳۵ سورہ البقرہ للامام الفخر الرازیؒ)

عالمِ اسلام کے سب سے جلیل القدر مفسرِ قرآن نے حضرت آدمؑ کی جائے پیدائش پر جس عالمانہ رنگ میں اظہار خیال کیا ہے اور روایات پر جرح و تنقید کر کے جو نتیجہ نکالا ہے اس سے یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح ثابت ہو جاتی ہے کہ حضرت آدمؑ کو جنت

سماوی میں پیدا کرنے کا واقعہ محض افسانہ ہے۔ آپؑ کو اسی دُنیا کے کسی خطے میں پیدا کیا گیا۔ عہد حاضر کے فاضل جلیل اور مصر کے مفتیٔ اعظم علامہ مفتی محمد عبدہٗ حضرت آدمؑ کی جائے پیدائش کی تحقیق کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:۔

''اہل السنّت کے محققین کی رائے ہے کہ حضرت آدمؑ جس جنت میں پیدا کئے گئے وہ اسی دنیا کا ایک ایسا خطہ تھا جس میں کثرت سے درخت تھے''۔(تفسیر المنار جلد نمبر ا آیت نمبر ۳۵ سورۃ البقرہ از مفتی محمد عبدہٗ)

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی عالمانہ تصنیف ''تاویل الاحادیث'' کا ایک ایڈیشن مدت ہوئی حیدرآباد سندھ سے شائع ہوا تھا۔ اس کتاب کے مقدمہ میں بھی فاضل مقدمہ نگار نے یہی نظریہ پیش کیا ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ محدثؒ کے علاوہ امت مسلمہ کے متعدد اکابر نے حضرت آدمؑ کی پیدائش کو اسی دنیا کا واقعہ قرار دیا ہے چنانچہ مقدمہ نگار لکھتے ہیں:۔

''علامہ (عبید اللہ) سندھی نے جو فلسفۂ ولی الٰہی کے شارح ہیں یہ رائے ظاہر کی ہے کہ جنت اسی زمین کا کوئی قطعہ تھا اور اس رائے میں وہ تنہا نہیں ہیں بلکہ حضرت ابی ابن کعبؓ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت وہبؒ بن منبہ اور حضرت سفیانؒ بن عینیہ کا نظریہ بھی یہی ہے۔ حضرت قاضی منذر بن سعید البلوطیؒ نے اپنی تفسیر میں اسی قول کو اختیار کیا ہے۔ قاضی منذر نے حضرت امام ابوحنیفہؒ اور ان کے اصحاب کی طرف بھی یہی قول منسوب کیا ہے۔ ابوعبداللہ محمد بن عمر رازی ابن خطیب الری نے بھی اپنی تصنیف میں اسی رائے کا اظہار کیا ہے''۔ (کہ حضرت آدمؑ کو جس جنت میں پیدا کیا گیا وہ اسی زمین کا کوئی خطہ تھا)۔ (مقدمہ تاویل الاحادیث ص اا مرتب الاستاذ غلام مصطفٰی القاسمی)۔

گویا جلیل القدر صحابۂ رسولؐ کے بعد حضرت امام ابوحنیفہؒ جیسا فاضل اجل اور عالم اسلام کے ممتاز علماء و مفکرین کی بہت بڑی تعداد اسی رائے کی حامل ہے کہ حضرت آدمؑ کی پیدائش اسی دنیا کا واقعہ ہے، اس کا جنت سماوی سے کوئی تعلق نہیں۔ اس تحقیق کی روشنی میں وہ تمام روایات غلط ثابت ہوتی ہیں جنہوں نے قصۂ آدم و ابلیس کو افسانوی رنگ دے

کر دنیا کے سامنے اسلامی تعلیمات ومعتقدات کا ایسا تصور پیش کیا ہے جس کی بنا پر معترضین کو اس مقدس تعلیم پر زبانِ طعن دراز کرنے کا موقع ملا اور عوام الناس نے ایک داستان کو حقیقت کے طور پر تسلیم کر لیا جس کا کوئی وجود نہیں۔

آدمؑ وحوّاؑ کی عریانی؟

اس واقعے کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ قرآن حکیم میں ایک اور نکتہ بیان فرماتا ہے کہ:

فاکلا منھا فبدت لھما سواتھما وطفقا یخصفن علیھما من ورق الجنة (سورہ طٰہٰ آیت نمبر ۱۲۱)

''سو (اس شیطان کے بہکانے سے) ان دونوں نے اس درخت سے کھا لیا تو ان دونوں کے ستر ایک دوسرے کے سامنے کھل گئے اور (اپنا بدن ڈھانکنے کو) دونوں اپنے اوپر جنت کے (درختوں کے) پتے چپکانے لگے''۔

ان الفاظ کو بھی ظاہری معنی پر محمول کر دیا گیا اور اس کے یہ معنی کر لئے گئے کہ وہ دونوں ننگے ہو گئے اور جنت کے درختوں کے پتوں سے اپنا ننگ ڈھانکنے لگے۔ پہلی بات تو یہ کہ کسی درخت کے قریب جا کر اس کا پھل کھانے سے آدمی ننگا کیسے ہو سکتا ہے؟ اس کے جواز کے لئے یہ واقعہ اختراع کیا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ اور حضرت حواؑ کو ایک خاص قسم کا جنتی لباس پہنا دیا تھا جو اس درخت کا پھل کھانے سے اُتر گیا۔ حضرت آدمؑ اور حضرت حواؑ کو اس قسم کا لباس پہنانے کا کوئی ذکر سارے قرآن میں کہیں نہیں ملتا۔ اس لئے یہ روایت ہی بے اصل ہے۔ اصل واقعہ یہ ہے کہ جب آدمؑ وحواؑ اس امر ممنوعہ کے مرتکب ہو گئے تو انہیں اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ ستر کھلنے کا مفہوم یہی ہے کہ ان پر ان کی کمزوریاں ظاہر ہو گئیں اور انہیں معلوم ہو گیا کہ وہ بے عیب نہیں ہیں۔ بے عیب ذات صرف اللہ تعالیٰ کی ہے چنانچہ ممتاز عالم دین علامہ شبیر احمد عثمانی مرحوم نے جنتی لباس کی تفسیر وتشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:۔

''جنتی لباس حقیقت میں لباسِ تقویٰ کی ایک محسوس صورت ہوتی ہے۔

کسی ممنوع کے ارتکاب سے جس قدر لباسِ تقویٰ میں رخنہ پڑے گا اسی قدر جنتی لباس سے محرومی ہوگی۔ غرض شیطان نے کوشش کی کہ عصیاں کرا کرآدم کے بدن سے بطریق مجازات جنت کا خلعتِ فاخرہ اترواد ے۔ یہ میرا خیال ہے''۔ (سورۃ الاعراف آیت نمبر ۲۲۔ تفسیر علامہ شبیر احمد عثمانی مرحوم)

مولانا شبیر احمد عثمانی مرحوم کے اس تفسیری نوٹ سے ہمارے اس نظریے کی تائید ہوتی ہے کہ شیطان کے دامِ فریب میں گرفتار ہو جانے کے بعد حضرت آدمؑ کو جس لباس سے محروم ہونا پڑا وہ ظاہری لباس نہ تھا بلکہ لباسِ تقویٰ تھا جسے ضعف پہنچا۔ کیونکہ مولانا موصوف فرماتے ہیں کہ شیطان آدم کے بدن سے جنت کا لباسِ فاخرہ بطریقِ مجازات اتروانا چاہتا تھا۔ یہاں علامہ عثمانی اس لباس کے لئے مجاز کا لفظ استعمال فرماتے ہیں اسے حقیقی اور ظاہری لباس قرار نہیں دیتے۔

آگے چل کر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جب حضرت آدمؑ اور حضرت حواؑ کے ستر ایک دوسرے کے سامنے کھل گئے تو وہ جنت کے اوراق سے اپنی برہنگی چھپانے لگے۔ اس حصۂ آیت کی تفسیر کرتے ہوئے ہمیں بتایا گیا کہ حضرت آدمؑ اور حضرت حواؑ نے انجیر کے درخت کی لنگیاں سی کر اپنا ستر ڈھانکا۔ پہلی بات تو یہ کہ یہ روایت بائیبل کی ہے۔ قرآن حکیم اس کی تائید نہیں کرتا۔ دوسری بات یہ کہ علامہ شبیر احمد عثمانی کی تفسیر کے مطابق جب حضرت آدمؑ اور حضرت حواؑ حقیقی لباس سے محروم ہی نہیں ہوئے تو انہیں انجیر کے درختوں کے پتے سی کر لنگیاں بنانے اور اپنا ستر ڈھانپنے کی کیا ضرورت تھی' ان کے تو لباس تقویٰ میں رخنہ پیدا ہوا تھا' تقویٰ کے نقصان کی تلافی جسم پر انجیر کے پتے چپکانے سے تو نہیں ہوسکتی۔ اس کی تلافی ایسے اعمال اور ایسے طریق سے ہوسکتی ہے جن سے قربِ خداوندی حاصل ہو سکے۔ اس لئے تسلیم کرنا پڑے گا کہ ''ورق الجنتہ'' سے مراد درختوں کے پتے نہیں بلکہ اس سے ایسے اعمال مراد ہیں جو انسان کو جنت کا سزاوار بنا دیتے ہیں مثلاً اپنے گناہ کا اعتراف کرنا' اپنی کمزوریوں اور لغزشوں پر اللہ تعالیٰ سے توبہ و استغفار کرنا اور آئندہ ان سے مکمل طور پر باز

رہنے کا عہد کرنا۔ یہی وہ امور ہیں جو انسان کی غلطیوں کا کفارہ بن جاتے ہیں اور توبہ و استغفار کرنے سے انسان اللہ تعالیٰ کی رضامندی حاصل کر لیتا ہے جس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ اس کے لئے جنت واجب کر دیتا ہے اور یہی حضرت آدمؑ نے کیا کیونکہ جیسا کہ ہم پہلے بھی عرض کر چکے ہیں کہ یوں بھی یہ امر اللہ تعالیٰ کی شان کے خلاف ہے کہ وہ ایک نبی اور اس کی بیوی کا لباس ظاہری اتروا کر انہیں برہنہ کر دے اور برہنہ بھی عورت کو؟ ایسی شرمناک سزا تو ہماری دنیا کی عدالتیں چوری، زنا، ڈاکے اور قتل کے مجرموں کو بھی نہیں دیتیں۔

شجر ممنوعہ کی حقیقت

اللہ تعالیٰ قرآن حکیم میں فرماتا ہے کہ:۔

وقلنا یادم اسکن انت و زوجک الجنة و کلا منها رغدا حیث شئتما ولا تقربا هذه الشجرة فتکونا من الظلمین ٥ (سورہ البقرہ آیت ۳۵)

''اور ہم نے حکم دیا کہ اے آدم رہا کرو تم اور تمہاری بیوی بہشت میں۔ پھر کھاؤ دونوں اس میں سے بافراغت جس جگہ سے چاہو اور نزدیک نہ جائیو اس درخت کے ورنہ تم بھی نقصان اٹھانے والوں میں شمار کئے جاؤ گے''۔

کہا جاتا ہے کہ حضرت آدمؑ اور ان کی بیوی کو شیطان نے بہکا دیا اور دونوں اس درخت کے پاس چلے گئے اور اس کا پھل کھا لیا۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ اور ان کی بیوی کو جس درخت کے قریب جانے اور اس کا پھل کھانے سے روکا تھا کہا جاتا ہے کہ وہ گندم کا درخت تھا حالانکہ قرآن حکیم میں اس درخت کو کہیں گندم کا درخت قرار نہیں دیا گیا بلکہ صرف شجر کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ شجر کے لفظ سے ہمارے مفسرین کو یہ غلط فہمی ہو گئی کہ اس کا مفہوم کوئی ٹہنیوں اور پھل پھول والا درخت ہے حالانکہ ایسا نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے یہ لفظ استعارے کے طور پر استعمال فرمایا ہے اور شجر سے مراد نسل ہے۔ ہم اپنی بول چال میں آج بھی شجرۂ نسب کی ترکیب استعمال کرتے ہیں۔ ''اپنا شجرہ بیان کرو''۔ ''اپنا شجرہ دکھاؤ''۔ یہ الفاظ ہماری گفتگو میں رات دن استعمال

ہوتے ہیں اور ان سے کوئی درخت مراد نہیں لیتا۔ دراصل اللہ تعالیٰ نے ھذہ الشجر ''اس درخت'' کے الفاظ استعمال کر کے حضرت آدمؑ کو ابلیس کے گروہ، اس کی نسل اور ذریت سے دور رہنے کا حکم دیا تھا چنانچہ عالم اسلام کے عظیم مفکر، مصر کے مفتیٔ اعظم اور علامہ جمال الدین افغانی کے شاگرد رشید علامہ مفتی محمد عبدہٗ لفظ شجر کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> ''شجر سے مراد ہٹ دھرمی اور برائی لینا چاہئے کیونکہ اللہ تعالیٰ قرآن حکیم میں دوسرے مقامات پر (مثلاً سورہ ابراہیم میں) کلمۂ طیبہ کو شجرۂ طیبہ اور کلمۂ خبیثہ کو شجرۂ خبیثہ قرار دیتا ہے۔ (تفسیر المنار زیر آیت نمبر ۳۵ سورہ البقرہ از علامہ مفتی محمد عبدہٗ)

یعنی قرآن حکیم میں شجر کا لفظ بعض دوسرے مقامات پر صفت کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے جیسے برے کلمہ کو خبیث درخت سے اور اچھے کلمہ کو پاک درخت سے تشبیہہ دی گئی ہے۔ عالم اسلام کے ایک ممتاز عالم دین اور مفکر کی تشریح سے ہمارے اس نظریئے کی تائید ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کو ایک درخت سے دور رہنے کا حکم دے کر دراصل ابلیس اور اس کی ذریت سے دور رہنے کا حکم دیا تھا کیونکہ وہ اور اس کے ساتھی مجسم برائی تھے۔

⌘⌘⌘
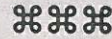
ابلیس اور جن کی حقیقت

ابلیس کے بارے میں قرآن حکیم ہمیں جو کچھ بتاتا ہے اس کے مطابق حضرت آدمؑ کو منصبِ خلافت عطا ہونے کے بعد جس وجود نے سب سے پہلے فضیلتِ آدم کا انکار کیا وہ ابلیس تھا۔ اس نے نہ صرف حضرت آدمؑ کے شرف و بزرگی کا اعتراف نہ کیا بلکہ اللہ تعالےٰ کی خدمت میں یہ بھی عرض کیا کہ اسے مہلت دی جائے تا کہ وہ بندگان خدا کو گمراہ کر سکے۔ اللہ تعالےٰ نے اسے مہلت دی مگر ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ جو میرے فرماں بردار بندے ہیں ان پر تو ہرگز قابو حاصل نہیں کر سکے گا۔ قرآن حکیم میں ابلیس کی سرکشی و نافرمانی کا ذکر کم سے کم گیارہ مقامات پر کیا گیا ہے۔ سب سے پہلے اس کا ذکر سورۂ بقرہ میں آتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے کہ:۔

واذقلنا للملئکة اسجد والادم فسجدوآ الا ابلیس ط (سورہ البقرہ آیت نمبر ۳۴)

''اور جس وقت ہم نے حکم دیا فرشتوں کو کہ تعظیم کرو آدم کی تو سب نے تعظیم کی سوائے ابلیس کے''۔

کیا ابلیس فرشتہ تھا؟

یہاں بہت سے لوگوں کے ذہن میں شبہ پیدا ہوتا ہے کہ شائد ابلیس بھی فرشتہ تھا کیونکہ اسے فرشتوں کے ساتھ تعظیم کرنے کا حکم دیا گیا تھا اس لئے یہ غلط خیال لوگوں کے ذہنوں میں راسخ ہو گیا کہ ابلیس نہ صرف فرشتہ تھا بلکہ فرشتوں کا معلم اور استاد بھی تھا' حالانکہ عقلی لحاظ سے بھی یہ خیال غلط ہے اور قرآن حکیم سے بھی اس کی تردید ہوتی ہے۔ عقلی لحاظ

سے یہ خیال اس لئے غلط ہے کہ فرشتوں کی فطرت میں سرکشی و نافرمانی کا مادہ رکھا ہی نہیں گیا۔ ان کا کام صرف اور صرف اللہ تعالےٰ کی حمد وثنا کرنا اور اس کے حکم کی تعمیل میں مصروف رہنا ہے۔ انسان کو فرشتوں پر اسی لئے فضیلت اور برتری حاصل ہے کہ انسان میں بدی کرنے کی قدرت موجود ہے مگر اس کے باوجود وہ خوفِ خدا کی وجہ سے بدی کے ارتکاب سے اجتناب کرتا ہے اور فرشتہ اس لئے بدی اور خدا تعالےٰ کی نافرمانی نہیں کرتا کہ وہ ایسا کرنے پر قادر ہی نہیں، وہ ایسا کر سکتا ہی نہیں۔ پس جب فرشتے میں بدی کرنے کی قدرت رکھی ہی نہیں گئی تو برائی کا ارتکاب نہ کرنے کی وجہ سے اسے انسان پر کوئی فضیلت حاصل نہیں ہوسکتی۔ اس لئے اگر ابلیس کو فرشتہ تسلیم کرلیا جائے تو ساتھ ہی یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ فرشتے بھی نافرمانی اور گناہ کر سکتے ہیں اس صورت میں ان پر انسان کی فضیلت ختم ہو جائے گی۔ دوسرے خود قرآنِ حکیم نے اس کا فیصلہ کردیا۔ چنانچہ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے کہ:۔

''اور جب ہم نے ملائکہ کو حکم دیا کہ آدم کی تعظیم کروتو سب نے تعظیم کی سوائے ابلیس کے کیونکہ وہ جنوں میں سے تھا''۔

واذقلنا للملئكة اسجد والادم فسجدوآ الا ابليس ط كان من الجن الخ (سورہ الکھف آیت نمبر ۵۰)

قرآن حکیم کی اس آیت نے ہمیشہ کے لئے اس غلط خیال کی تردید کردی کہ ابلیس فرشتوں میں سے تھا۔ اللہ تعالےٰ نے صاف اور غیر مبہم الفاظ میں وضاحت فرمادی کہ ابلیس فرشتہ نہیں تھا بلکہ جن تھا۔ اس وضاحت کے بعد ایک مسئلہ حل طلب رہ جاتا ہے کہ کیا ابلیس کوئی مستقل وجود تھا جو قیامت تک زندہ رہے گا؟ اس سوال کا جواب معلوم کرنے کے لئے پہلے ابلیس کے لفظ پر غور کرنا ہوگا۔

ابلیس کا مادہ اَبلَسَ ہے اور اَبلَسَ کے معنی لغت کی مشہور کتاب ''اقرب الموارد'' میں یہ لکھے ہوئے ہیں کہ ''جس میں سے خیر وفلاح جاتی رہے۔ جو مایوس ہو جائے۔ جو غم واندوہ سے مغلوب ہو جائے''۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ابلیس کا یہ نام ذاتی نہیں بلکہ صفاتی ہے۔ یہ کوئی ایسا فرد تھا جو حضرت آدمؑ کے منصبِ خلافت پر فائز کئے جانے کے بعد اپنی سرکشی و نافرمانی کی وجہ سے خیر اور فلاح سے محروم ہوگیا۔ مایوسی اور غم واندوہ نے اسے

اللہ تعالیٰ کے حکم کی نافرمانی پر آمادہ کیا اس لئے اس نے ابلیس کا نام پایا' قرآنِ حکیم اسے جن قرار دیتا ہے۔ وہ خود بھی یہی کہتا ہے کہ ''مجھے آگ سے پیدا کیا گیا ہے''۔ آگ سے پیدا کرنے کے یہ معنی سمجھ لئے گئے کہ جنوں کو ظاہری آگ سے تخلیق کیا گیا ہے' حالانکہ قرآن حکیم کی تعلیم کی رو سے یہ نظریہ بھی درست ثابت نہیں ہوتا مثلاً اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

(۱) خلق الانسان من عجل ط (سورہ الانبیاء آیت نمبر ۳۷)

(۲) اللہ الذی خلقکم من ضعف ط (سورہ الروم آیت نمبر ۵۴)

(۳) والجآن خلقنه من قبل من نار السموم ہ (سورہ الحجر آیت نمبر ۲۷)

(۱) ''انسان جلدی سے پیدا کیا گیا ہے''۔

(۲) ''اللہ نے تم کو ضعف سے پیدا کیا ہے''۔

(۳) ''اور ہم نے اس سے پہلے جنوں کو آگ کی طرح گرم ہوا سے پیدا کیا''۔

ان تین آیات میں پیدائش یا تخلیق کا ذکر کیا گیا ہے اور فرمایا گیا ہے کہ (۱) ''ہم نے انسان کو جلدی سے پیدا کیا''۔ (۲) ''ہم نے انسان کو ضعف سے پیدا کیا''۔ (۳) ''اور ہم نے جنوں کو آگ سے پیدا کیا''۔ اگر جلدی سے پیدا کرنے کے ظاہری معنی مراد لئے جائیں تو تسلیم کرنا پڑے گا کہ ایک مادہ تھا جس کا نام ''جلدی'' تھا اس مادے سے انسان کو پیدا کیا گیا۔ اسی طرح ماننا پڑے گا کہ ''ضعف'' بھی ایک مادہ تھا جس سے انسان کو تخلیق کیا گیا کیونکہ پیدائش کی تینوں اقسام یا تینوں طریقوں کا ایک ہی رنگ میں ذکر کیا گیا ہے یعنی ہم نے انسان کو ''جلدی'' سے پیدا کیا' اسے ''ضعف'' سے پیدا کیا' جنوں کو آگ سے پیدا کیا۔ ظاہر ہے کہ ایک معمولی عقل کا آدمی بھی یہ معنی قبول نہیں کرے گا کہ ''جلدی'' یا ''ضعف'' کے نام کے کوئی مادے موجود ہیں یا موجود تھے جن سے انسان کو بنایا گیا بلکہ تمام مفسرین نے اس کے یہی معنی کئے ہیں کہ جلدی سے پیدا کرنے کا مفہوم یہ ہے کہ انسان کی فطرت میں جلد بازی کا مادہ رکھا گیا ہے اسی طرح ضعف سے پیدا کرنے کے معنی یہ ہیں کہ انسان طبعاً کمزور واقع ہوا ہے' یعنی اس کی فطرت میں کمزوری کو بھی دخل ہے اس لئے لفظ ''جن'' کے بھی یہی معنی ہوں گے کہ اس کی فطرت میں آگ کی خاصیت رکھی گئی ہے نہ کہ

اسے ظاہری آگ سے پیدا کیا گیا ہے۔ چنانچہ دور حاضر کے مشہور و ممتاز عالم اور مفسر قرآن جناب مولانا اشرف علی صاحب تھانوی ''جن'' کے عام اور معروف معنی کے علاوہ اس کے ایک اور معنی بھی بیان کرتے ہیں۔ مولانا فرماتے ہیں کہ:-

''اول کے جن کی پیدائش کا ذکر آیت میں ہے۔ پھر ان میں بھی مثل انسان کے توالد و تناسل ہونے لگا اور غالب یہ ہے کہ نار سے پیدا کرنے کا مطلب یہ ہے کہ جزو غالب نار ہے۔ جیسا انسان میں سب عناصر ہیں مگر غالب تراب ہے اور اگر یہ شبہ ہو کہ جب اور عناصر مل گئے تو خالص نار کہاں؟ جواب یہ ہے کہ اول خالص ہوگی مگر بعد دیگر عناصر کے خالص نہ رہی''۔ (تفسیر القرآن از مولانا اشرف علی تھانوی سورۃ الحجر زیر آیت ولقد خلقنا الانسان من صلصال الخ)

مولانا کا مفہوم یہ ہے کہ اس آیت میں سب سے پہلے پیدا ہونے والے جن کا ذکر کیا گیا ہے مگر کچھ مدت گزرنے کے بعد جنوں کی پیدائش بھی انسانوں کی طرح نر اور مادہ کے باہم ملاپ سے ہونے لگی۔ مولانا فرماتے ہیں کہ جن کو نار سے پیدا کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ان کے اجزائے بدن میں سب سے بڑا جزو آگ ہے جیسے کہ انسان میں سب عناصر ہیں مگر سب سے بڑا عنصر مٹی ہے۔ آگے چل کر مولانا اس اعتراض کا جواب دیتے ہیں کہ اگر سب عناصر باہم مل گئے تو خالص آگ کہاں رہی؟ مولانا فرماتے ہیں کہ ابتدا میں خالص آگ ہوگی مگر بعد میں دوسرے عناصر کے ملنے سے خالص نہیں رہی۔

مولانا اشرف علی صاحب تھانوی کی تصریحات سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ دنیا میں ہزاروں سال سے جو مخلوق ''جن'' کے نام سے پائی جاتی ہے وہ خالص آتشیں مخلوق نہیں ہے بلکہ اس کا جسم انسانوں کی طرح بہت سے عناصر سے مل کر بنا ہے البتہ اس میں جزو غالب آگ ہے۔ اس صورت میں تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہ جن ظاہری جسم رکھتے ہیں اور نظر آتے ہیں۔

جنوں کے بارے میں مفکرین اسلام کا نظریہ

''جنوں'' کے بارے میں یہ تخیل نیا نہیں۔ کئی صدی قبل جب دنیائے اسلام میں جدید انداز سے غور وفکر اور تدبر کرنے والوں کا طبقہ پیدا ہوا اور مسلمان فلاسفہ اور مفکرین نے بہت سے مروجہ نظریات کو عقل وفکر کی کسوٹی پر پرکھا تو انھوں نے جنوں کے معروف ومقبول تصور کو قبول نہیں کیا اور وسیع مطالعے اور غور وخوض کے بعد اس قسم کے جنوں کا وجود تسلیم کرنے سے انکار کر دیا جو لوگوں کو چمٹ جاتے ہیں، گھروں میں پتھر پھینکتے ہیں، مختلف انسانی شکلوں میں نظر آتے ہیں عورتوں کے جسم میں داخل ہو جاتے ہیں اور مفاد پرست عامل انہیں دھونی دے کر باہر نکالتے ہیں۔ ان مسلمان فلاسفہ ومفکرین نے اس قسم کے تصورات کو ڈھکوسلا قرار دیا اور واضح طور پر یہ نظریہ پیش کیا کہ اس قسم کے جنوں کا دنیا میں کہیں وجود نہیں۔ چنانچہ عالم اسلام کے مشہور مفکر اور مفسر قرآن حضرت امام فخر الدین رازیؒ نے بھی مسلمان اہل علم کے اس طبقے کے نظریات اپنی تفسیر میں درج کئے ہیں۔ چنانچہ امام صاحبؒ فرماتے ہیں:۔

> ''اس مکتبۂ فکر کا استدلال یہ ہے کہ کسی چیز کے وجود کا ثبوت تین طریقوں سے دیا جا سکتا ہے۔ اول حس سے، دوم خبر سے، سوم دلیل سے۔ ان تینوں ذرائع میں سے کسی ایک ذریعے سے بھی ایسے جنوں اور شیاطین کا وجود ثابت نہیں ہوتا۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہم نے ایسے جنوں یا شیاطین کی آوازیں سنیں یا انہیں دیکھا وہ دو قسم کے لوگ ہو سکتے ہیں ایک تو ایسے لوگ جن کے دماغ میں خلل ہوتا ہے (یعنی جن پر وہم اور مراق کا غلبہ رہتا ہے) دوسرے وہ لوگ جو دروغ گوئی اور غلط بیانی سے کام لیتے ہیں۔ انبیاء اور رسولوں کے اخبار سے ایسی مخلوق کے مستقل وجود کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔ دلیل کی رو سے بھی جنوں اور شیاطین کا ثبوت ناممکن ہے''۔
> (التفسیر الکبیر للامام الفخر الرازیؒ جلد نمبر ا صفحہ نمبر ۷۷۶ و ۷۷)۔

اگر چہ حضرت امام رازیؒ نے اس مکتبۂ فکر کے علماء و مفکرین کے نظریہ سے اتفاق نہیں کیا بلکہ ان کی تردید کی مگر اس سے اتنا تو ثابت ہو جاتا ہے کہ حضرت امامؒ کے دور میں بھی اور آپؒ سے قبل بھی اس نقطہ نظر کے حامل اہل علم موجود تھے جو جنوں کے روایتی وجود کے منکر تھے۔ ان سے اختلاف کرنے کے باوجود امام رازیؒ نے انہیں کافر یا زندیق قرار نہیں دیا۔ ان اہل علم اور مسلمان مفکرین کے نزدیک ''جن'' انسانوں سے الگ کوئی مستقل مخلوق نہیں جو ظاہری جسم سے محروم ہونے کے باوجود جب چاہے انسانی پیکر اختیار کرلے اور ظاہری آنکھوں سے نظر آنے لگے۔

جن کا روایتی پس منظر

جنوں کے بارے میں یہ ساری غلط فہمیاں اس لئے پیدا ہوئیں کہ اس لفظ کے روایتی پس منظر پر غور نہیں کیا گیا اور نہ انسانی فطرت کی بعض کمزوریوں کو پیش نظر رکھا گیا۔ انسان میں جہاں بہت سی اعلیٰ درجے کی صفات موجود ہیں وہاں اس کی فطرت میں بعض کمزوریاں بھی ہیں انہی میں خوف اور وہم بھی شامل ہیں۔ زمانۂ جاہلیت میں جب انسان کا شعور خام تھا وہ بعض خیالی چیزوں سے خوف کھاتا تھا' دیو' بھوت' جن اور آسیب کے تصورات اسی دور کی پیداوار ہیں' خاص طور پر ویرانوں' سنسان جنگلوں' بوسیدہ' غیر آباد اور قدیم عمارتوں کی وحشت سے کمزور اعصاب والے اور ضعیف الاعتقاد لوگ خوفزدہ ہو جاتے تھے اور رات کو ذراسی آہٹ یا کسی چیز کا سایہ ان کے وہم کو اس یقین میں تبدیل کر دیتا تھا کہ یہاں ضرور کوئی مافوق الفطرت مخلوق موجود ہے۔ اسی وہم نے بھوتوں اور دیوؤں کا ایک مستقل وجود تخلیق کرلیا۔ رفتہ رفتہ اس قسم کے توہمات نے روایات کی شکل اختیار کرلی جو ایک نسل سے دوسری نسل کی طرف منتقل ہوتی گئیں۔ عربوں میں بھی یہ تصورات و توہمات زمانۂ قدیم سے چلے آرہے تھے اور وہ اس قسم کی خیالی مخلوق کو اپنی زبان میں ''جن'' کے نام سے موسوم کرتے تھے' اسے غیر معمولی طاقتور مگر نظر نہ آنے والی مخلوق سمجھتے تھے۔ ان کا اعتقاد تھا کہ یہ مخلوق حسبِ ضرورت انسانی پیکر اختیار کرسکتی ہے اور قافلے کے قافلے تباہ کرسکتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جب عرب لوگ دورانِ سفر کسی ویرانے یا سنسان جنگل میں رات بسر کرنے کی غرض سے قیام کرتے تھے تو جنوں کے سرداروں سے پناہ لے لیا کرتے تھے اور سمجھتے تھے کہ اب انہیں کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا۔ ظاہر ہے کہ یہ سب زمانۂ جاہلیت کے تصورات تھے مگر چونکہ یہ تصورات موجود تھے اس لئے عربوں کی شاعری اور ان کی تاریخی داستانوں میں بھی ان کا ذکر آتا ہے۔ عربوں کی لغت میں بھی ''جن'' کا لفظ موجود ہے اور اس کے معنی پوشیدہ رہنے والے کے ہیں کیونکہ عربوں کی روایت کے مطابق یہ جن عام طور پر نظر نہیں آتے۔ چونکہ جن ایک طاقتور اور ناقابل تسخیر مخلوق سمجھی جاتی تھی اور ان کی قوت کے بارے میں عجیب وغریب داستانیں مشہور تھیں اس لئے عرب لوگ اپنے بعض قبائل اور ان کے طاقتور افراد کو بھی ''جن'' کے نام سے موسوم کرتے تھے۔ قرآن حکیم کے سب سے پہلے مخاطب چونکہ عرب تھے اس لئے اللہ تعالیٰ نے انہیں سمجھانے کی غرض سے انہی کی اصطلاحات میں گفتگو فرمائی اور بعض جگہ طاقتور اور پہاڑوں میں رہنے والی اقوام اور افراد کو ''جن'' کے نام سے موسوم فرمایا' کہیں پوشیدہ طور پر یعنی چھپ کر آنے والوں کو ''جن'' کے نام سے یاد فرمایا لیکن اس کے ساتھ ساتھ انداز بیان ایسا اختیار فرمایا کہ ذرا سے تدبر سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ''جن'' کا لفظ استعمال فرما کر کسی فرضی مخلوق کی طرف اشارہ نہیں کر رہا۔

قرآن حکیم انبیاء کے ذکر کے سلسلے میں جہاں بھی ''جن'' کا لفظ استعمال کرتا ہے اس سے مختلف مقامات پر مختلف معنی مراد ہوتے ہیں۔ بعض مقامات پر قوی ہیکل اور غیر معمولی جسمانی طاقت رکھنے والے افراد پر اس لفظ کا اطلاق کیا گیا ہے جیسے سورۂ نمل میں ''قال عفریت من الجن'' کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں' یہاں غیر معمولی قوت رکھنے والا وہ شخص مراد ہے جس نے حضرت سلیمان علیہ السلام سے عرض کیا تھا کہ اگر آپؑ فرمائیں تو قبل اس سے کہ آپؑ دربار برخاست کریں ملکہ کا تخت آپؑ کے سامنے لا کر رکھ دوں گا (سورہ النمل آیت نمبر ۳۹) مگر عجیب بات یہ ہے کہ جن ہونے کے باوجود یہ مشکل اور اہم ترین کام وہ انجام نہیں دیتا بلکہ حضرت سلیمانؑ کے دربار کا ایک عالم انسان یہ فریضہ سرانجام

دیتا ہے چنانچہ قرآن حکیم میں ہے کہ جنوں میں سے اس عفریت کی پیش کش سن کر ''ایک شخص نے جو اللہ کی کتاب کا علم جانتا تھا حضرت سلیمانؑ سے عرض کیا کہ میں پلک جھپکنے سے پہلے یہ کام کرسکتا ہوں''۔ (سورالنمل آیت نمبر ۴۰) اور پھر اسی آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ وہی انسان جو اللہ کی کتاب (تورات) کا عالم تھا ملکۂ سبا کا تخت حضرت سلیمانؑ کے دربار میں لے آیا۔ (مگر پلک جھپکنے سے پہلے نہیں لایا یہ لفظ محاورے کے طور پر استعمال کیا گیا ہے جس کا مفہوم ہے جلد سے جلد، سرعت سے، تیزی سے، جیسے فارسی میں کہتے ہیں چشم زدن)

اگر یہاں جن سے مراد وہی ''جن'' ہوتے جن کا تصور ہمارے دماغوں میں بٹھا دیا گیا ہے اور جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ حضرت سلیمانؑ کے تابع فرمان کر دیئے گئے تھے (۱) تو ہزاروں میل دور سے منوں وزنی تخت اٹھا کر لانے کا کام اسی جن یا جنوں کی جماعت کو سرانجام دینا چاہئے تھا مگر قرآن حکیم کہتا ہے کہ ایسا نہیں ہوا بلکہ ایک انسان نے یہ کام کیا۔ پس اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ جن جس نے حضرت سلیمانؑ سے ملکۂ سبا کا تخت لانے کی پیش کش کی تھی کسی علیحدہ اور پوشیدہ مخلوق کا فرد نہیں تھا بلکہ وہ بھی انسان تھا اس کی غیر معمولی صلاحیتوں کی وجہ سے اسے جن قرار دیا گیا۔

قرآن حکیم میں لفظ ''جن'' کا دوسرا استعمال قوم کے سرداروں اور بااثر اور دولت مند افراد کے لئے کیا گیا ہے۔ بعض مقامات پر یہ لفظ غیر متمدن، آتش مزاج اور جنگلوں اور پہاڑوں میں رہنے والوں کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔ جب ہم عربی زبان کے محاورات اور دورِ جاہلیت کے شعراء کے کلام کی طرف رجوع کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اہلِ عرب ''جن'' کا اطلاق پہاڑوں میں رہنے والے لوگوں پر بھی کرتے تھے۔

عربی ادب اور محاورہ میں لفظِ جن کا استعمال

چنانچہ پانچویں صدی ہجری کے مشہور فاضل ابوالفضل احمد بن محمد بن احمد المیدانیؒ جو عربی زبان ولغت کے بہت بڑے عالم تھے اپنی کتاب ''مجمع الامثال'' میں لفظ جن کی

مثال دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اجن اللّٰہ جبالہ' ای الجبال التی لیسکنھا ای اکثر اللّٰہ فیھا الجن ای اوحشھا" ۔(مجمع الامثال للمیدانی جلد نمبر ا ص ۱۷۰)

یعنی "اللہ تعالیٰ نے جنوں کو پہاڑوں میں پیدا کیا یعنی وہ جوان میں سکونت رکھتے ہیں اور جنہیں اللہ تعالیٰ نے کثیر تعداد عطا کی جو وحشی ہیں"۔

علامہ میدانیؒ کے ان الفاظ سے صاف طور پر ثابت ہوتا ہے کہ عرب لغت اور محاورے میں "جن" پہاڑوں میں رہنے والے انسانوں کو بھی کہتے تھے اور چونکہ یہ وحشی تھے یعنی غیر مہذب اس لئے انہیں "جن" کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا۔ اس نظریے کی مزید تائید ایک تاریخی واقعے سے بھی ہوتی ہے چنانچہ دیوانِ نابغہ کا شارح لکھتا ہے:

"قال الوزیر بن ابی بکر قال ابو الحسن ارادالنعمان ان یغزو "بنی جن" وھم قوم من بنی عذرۃ ۔(شرح دیوانِ نابغہ جلد اول ص ۴۶)

یعنی "وزیر بن ابوبکر نے بیان کیا کہ ابوالحسن کہتے ہیں کہ نعمان نے "بنوجن" پر حملہ آور ہونے کا ارادہ کیا اور بنوجن بنوعذرہ میں سے ایک قوم کا نام ہے"۔

کوئی صاحبِ عقل وفہم اس عبارت سے یہ نتیجہ نہیں نکالے گا کہ نعمان نے "جنوں" کے لشکر پر حملہ آور ہونے کا ارادہ کیا تھا کیونکہ آگے چل کر اسی عبارت میں وضاحت موجود ہے کہ "بنوجن" دراصل قبیلۂ بنوعذرہ کی ایک شاخ تھی۔ پس اس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ عرب لوگ اپنے افراد اور قبیلوں کو "جن" کے نام سے بھی موسوم کیا کرتے تھے اور یہ انسان ہی ہوتے تھے' چنانچہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا سب سے مستند اور قدیم سیرت نگار بیان کرتا ہے کہ ایک روز حضورؐ اقدس منیٰ کے مقام پر قبائل کو تبلیغ کرنے تشریف لائے۔ جب آپؐ تقریر ختم کر چکے تو عبدالعزیٰ بن عبدالمطلب یعنی ابولہب نے حضورؐ کے عقب سے کھڑے ہو کر قبائل کو مخاطب کیا اور کہا کہ:۔

"یا بنی فلان ان ھذا انمایدعو کم الی أن تسلخوا اللات والعزیٰ من اعناقکم و حلفاء کم من "الجن" من بنی مالک بن اقیش الخ"۔(السیرۃ النبویۃ لابن ھشام الجز الثانی ص ۶۵ مطبوعہ مصر)

یعنی "اے بنو فلاں تم اس شخص کی بات نہ ماننا یہ تمہیں اس امر کی دعوت دیتا ہے کہ تم لات وعزیٰ کی عبادت کا جُوا اپنی گردنوں سے نکال دو اور قبیلۂ بنی مالک بن اقیش کو چھوڑ دو جو "جنوں" میں سے ہیں اور تمہارے حلیف ہیں"۔

اس تقریر میں ابولھب قبیلۂ بنی مالک بن اقیش کو جنوں میں سے قرار دیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ قبیلۂ بنی مالک بن اقیش عرب کا ایک مشہور قبیلہ تھا اور یہ سب انسان تھے مگر ابولھب نے کہا کہ یہ جنوں میں سے ہیں۔ معلوم ہوا کہ عرب کے لوگ "جن" کا لفظ انسانوں کے لئے بھی استعمال کرتے تھے اور یہ استعمال اتنا عام تھا کہ جب مجالس، اجتماعات اور روزمرہ گفتگو میں جن کا لفظ بولا جاتا تھا تو مخاطب کا ذہن کبھی ہوائی اور خیالی جنوں کی طرف نہیں جاتا تھا۔

اب عربوں کی شاعری کی طرف آیئے۔ زمانۂ جاہلیت کا ایک باکمال اور مشہور شاعر ہے جدع بن سنان الغسانی۔ وہ اپنی ایک نظم میں کہتا ہے۔

اتوا ناری فقلت منون انتم — فقالو الجن فقلت عموا صباحا

نزلت بشعب وادئ الجن لما — رایت اللیل قد نشر الجناحا

نحرت لھم وقلت الاھلموا — کلوا مما طھیت لکم سماحا ☆

("خزانۃ الادب" تالیف الشیخ عبدالقادر بن عمر البغد ادی ص ۶ الجز الثالث دار الثقافۃ بن عمر بیروت)

(ترجمہ) "وہ میرے الاؤ کے نزدیک آئے تو میں نے ان سے پوچھا کہ

☆ مکمل نظم الشیخ عبدالقادر بن عمر البغدادی کی محولہ بالا کتاب میں ملاحظہ فرمایئے۔ (مولف)

تم کون ہو؟انہوں نے جواب دیا کہ ہم جن ہیں، میں نے کہا تم پر اچھی صبح طلوع ہو۔

میں اس گھاٹی میں اترا تھا جس کا نام ''وادیٔ الجن'' ہے۔ اس وقت رات اپنے بازو پھیلا چکی تھی۔ میں نے ان (جنوں) کے لئے اونٹ ذبح کیا اوران سے کہا کہ آؤ اور میں نے جو کچھ اپنے دل کی خوشی سے پکایا ہے اسے کھاؤ۔

میرے پاس قاشر اوراس کے باپ کے بیٹے آئے۔ اس وقت اندھیرا ہو چکا تھا اور رات خوب ظاہر ہو گئی تھی۔ انہوں نے شراب کا پیالہ ایک دوسرے سے چھیننے کی کوشش کی۔ میں نے اس شراب میں شہد کی آمیزش کی تھی''۔

یہ سارے اشعار ثابت کرتے ہیں کہ شاعر جس وادی میں اترا تھا اس میں انسان بودوباش رکھتے تھے جنہیں شہر سے دور پہاڑوں میں رہنے اور غیر مہذب ہونے کی وجہ سے جن کے نام سے موسوم کیا گیا کیونکہ:

(۱) شاعر نے ان کے لئے اونٹ ذبح کیا، شراب اور شہد سے ان کی تواضع کی۔ ظاہر ہے کہ اونٹ کا گوشت انسان کھاتے ہیں اور شراب بھی وہی پیتے ہیں، شہد بھی انسان ہی استعمال کرتے ہیں۔ جنوں کے متعلق کہیں ثابت نہیں ہوتا کہ وہ گوشت اور شہد کھاتے ہوں یا شراب پیتے ہوں۔ اگر ایسا ہوتا تو روئے زمین پر جتنے باورچی خانے، ہوٹل اور شراب کی بھٹیاں ہیں ان سب کا صفایا ہو جاتا اور انسانوں کو نہ گوشت نصیب ہوتا، نہ شراب خوروں کو شراب ملتی اور نہ شہد کے چھتوں میں شہد باقی رہتا، لیکن کبھی کسی آبادی نے شکایت نہیں کہ اس کے گھروں میں پکا ہوا گوشت جن کھا گئے، نہ شراب کی دکانوں سے کبھی جنوں نے بوتلیں اڑائیں، نہ انہوں نے شہد کے چھتوں پر ہاتھ صاف کیا۔

(۲) شاعر کے ساتھ جن افراد نے کھانا کھایا وہ ان کے نام بتاتا ہے ''قاشر اوراس کے بیٹے''۔ اس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ وہ انسان تھے اوران کے نام بھی انسانوں جیسے تھے۔

عربوں کی لغت، عرب محاورات اور عربی شعر وادب کے علاوہ خود قرآن حکیم نے جس انداز سے جنوں کا ذکر فرمایا ہے اس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ جہاں بھی انسانوں یا انبیاء کے ساتھ جنوں کا ذکر آیا ہے وہاں انسان ہی مراد ہیں مثلاً اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

ویوم یحشرھم جمیعاً یٰمعشر الجن قد استکثرتم من الانس الخ

(سورہ الانعام آیت نمبر ۱۲۸)

ممتاز عالم دین مولانا ابوالکلام آزاد اس آیت کا ترجمہ ان الفاظ میں کرتے ہیں:۔

''اور اس دن کیا ہوگا جب خدا ان سب کو جمع کرے گا (اور فرمائے گا) اے گروہِ جن! تم نے انسانوں میں سے بڑی تعداد اپنے ساتھ لے لی تھی اور انسانوں میں سے جو لوگ ان کے ساتھی رہے ہیں وہ کہیں گے اے پروردگار! ہم ایک دوسرے سے فائدہ اٹھاتے رہے (یعنی گمراہ انسانوں نے شیطانوں کا ہاتھ بٹایا اور شیطانوں نے انسانوں کا اور بالآخر) میعاد کی اس منزل تک پہنچ گئے جو تو نے ہمارے لئے ٹھہرا دی تھی''۔ (ترجمان القرآن صفحہ نمبر ۴۹۶ مولانا ابوالکلام آزاد)

قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کی جنوں اور انسانوں سے جو گفتگو ہوگی اس آیت میں اس کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس کے مطابق جب اللہ تعالیٰ جنوں کی جماعت کو مخاطب کر کے فرمائے گا کہ تم نے میرے بہت سے بندوں کو گمراہ کر کے اپنے ساتھ ملا لیا تھا تو اس کے جواب میں وہ انسان جو جنوں کے ساتھ تعلق رکھتے تھے عرض کریں گے کہ اے اللہ ہم نے ان کا ساتھ اس لئے دیا تھا کہ یہ ہمیں اور ہم انہیں فائدہ پہنچاتے تھے یعنی دنیوی فائدے کی خاطر ہم ان کی پیروی کرتے تھے۔ اگر یہ جن وہی ہیں جو عام طور پر مراد لئے جاتے ہیں تو وہ انسانوں کو کیا فائدہ پہنچا سکتے ہیں اور یہ جن انسانوں سے کیا فائدہ حاصل کر سکتے ہیں؟ ہماری معاشرتی اور معاشی زندگی میں انسان، انسان سے تو فائدہ حاصل کرتا ہے مگر جن انسان سے یا انسان جن سے کوئی معاشرتی یا معاشی فائدہ نہیں اٹھاتا۔ پس اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس آیت میں جن سے مراد طاقتور اور با اثر لوگ ہیں جو انبیاء کے مخالف تھے۔ یہ لوگ اللہ تعالیٰ

کے ارشادات کوقبول کرنے کی بجائے اس کے بندوں کواپنی اطاعت پر آمادہ کرتے تھے اور دنیا پرست لوگ ذاتی فائدے کی خاطر ان کی پیروی کر کے خود بھی دنیوی مفاد حاصل کرتے تھے اور ان کی پیروی کرنے والے گروہ میں شامل ہو کر ان کی طاقت کو بھی مضبوط کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انسانوں کے یہ دونوں گروہ اللہ تعالیٰ کے سامنے اعتراف کریں گے کہ وہ دنیوی زندگی میں ایک دوسرے سے فائدہ اٹھاتے رہے۔

اس آیت میں ایک اور بلیغ نکتہ قابل غور ہے کہ اللہ تعالیٰ سوال تو جنوں کی جماعت سے کرتا ہے کہ تم نے انسانوں میں سے اکثر لوگوں کو اپنے ساتھ ملا لیا تھا مگر جواب انسان دیتے ہیں۔

اس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ جنوں کی وہ جماعت جس کا اس آیت میں ذکر کیا گیا ہے انسانوں سے الگ کوئی اور نوع نہیں تھی بلکہ انسانوں ہی میں سے ایک گروہ تھا' ورنہ ان کی طرف سے کوئی الگ جواب دیا جاتا۔

قرآن سننے والے جن؟

قرآن حکیم کے دو مقامات ایسے ہیں جہاں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس جنوں کے آنے اور کلام الٰہی سن کر اسلام قبول کرنے کا ذکر آتا ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

واذصرفنا الیک نفرا من الجن یستمعون القران ج (سورہ احقاف آیت نمبر ۲۹)

''اور جب کہ ہم جنات کی ایک جماعت کو آپ کی طرف لے آئے جو قرآن سننے لگے تھے۔ غرض جب وہ اس مقام کے پاس آئے جہاں قرآن پڑھا جا رہا تھا (تو آپس میں) کہنے لگے کہ خاموش رہو اور پھر جب قرآن پڑھا جا چکا تو وہ لوگ اپنی قوم کو خبر دینے کے لئے واپس گئے (اور) کہا کہ اے بھائیو! ہم ایک کتاب سن کر آئے ہیں جو موسیٰؑ کے بعد نازل کی گئی جو اپنی پہلی کتابوں کی تصدیق کرتی ہے حق اور راہِ راست کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ اے بھائیو! اللہ کی طرف

بلانے والے کا کہنا مانو اور اس پر ایمان لے آؤ اللہ تعالیٰ تمہارے گناہ معاف کردے گا اور تم کو دردناک عذاب سے محفوظ رکھے گا''۔

مولانا نواب صدیق حسن خاں اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

عن الزبير قال اذصرفنا اليک نفراً من الجن بنخلة و رسول الله صلى الله عليه وسلم يصلى العشاء الاخرة كادوا يكونون عليه بعد وكانوا تسعة نفراً من اهل نصيبين الخ

(تفسیر فتح البیان جلد نمبر ۸ زیر آیت واذصرفنا الیک نفرا من الجن)

یعنی حضرت زبیرؓ روایت کرتے ہیں کہ جنات کے ایک گروہ نے نخلہ کے مقام پر حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے قرآن سنا جب کہ آپؐ عشاء کی نماز پڑھ رہے تھے۔ ان کی تعداد ۹ تھی اور یہ نصیبین کے رہنے والے تھے جو یمن کا ایک مقام ہے۔ ان کے ساتھ ان کا سردار بھی تھا اور یہ لوگ حضورؐ کے پاس قرآن سننے کے لئے دوبار آئے تھے اور واپس جا کر اپنی قوم کو حضورؐ کا پیغام پہنچایا تھا یعنی اسلام کی تبلیغ کی تھی۔

قرآن حکیم کے ارشاد اور صاحب تفسیر ''فتح البیان'' کی تشریح سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ لوگ قوم یہود سے تعلق رکھتے تھے۔ یمن کے مقام نصیبین کے باشندے تھے کیونکہ:۔

(۱) ان کا یمن کے مقام نصیبین کا باشندہ ہونا ثابت کرتا ہے کہ یہ انسان تھے' اس لئے کہ شہروں اور قصبات میں انسانوں کی آبادیاں ہوتی ہیں جنوں کو تو ہوائی اور نظر نہ آنے والی مخلوق قرار دیا جاتا ہے اُن کا جسم ہی نہیں ہوتا اس لئے ان کا کسی خاص قصبے یا شہر سے مستقل سکونت کا تعلق نہیں ہوسکتا۔

(۲) وہ اپنی قوم کے پاس جا کر کہتے ہیں کہ ہم ایک ایسی کتاب سن کر آئے ہیں جو موسیٰؑ کے بعد نازل ہوئی ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ حضرت موسیٰؑ کے پیرو تھے۔ اگر وہ عیسائی ہوتے تو کہتے کہ ہم ایک ایسی کتاب سن کر آئے ہیں جو انجیل کے بعد نازل ہوئی ہے مگر وہ حضرت موسیٰؑ کے بعد نازل ہونے والی کتاب کا ذکر کرتے ہیں۔ اس سے ان کا یہودی ہونا ثابت ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ حضرت موسیٰؑ کی شریعت کی پیروی یہودی

کرتے تھے اور یہودی انسان تھے۔ جنوں کا کسی شریعت کے تابع ہونا بعض مفسرین کا ذاتی خیال ہے جو ضعیف روایات پر مبنی ہے قرآن حکیم یا کسی مستند حدیث سے اس کا ثبوت نہیں ملتا کہ ان خیالی جنوں نے کوئی خاص مذہب اختیار کیا ہو۔

حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس جنوں کا قرآن سننے کے لئے آنے کا دوسرا واقعہ ''سورۂ جن'' میں بیان ہوا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

قل اوحی الی انہ استمع نفر من الجن فقالو آ انا سمعنا قرآناً عجباًo (سورہ الجن آیت نمبر ۱)

''آپ ان لوگوں سے کہہ دیجئے کہ میرے پاس اس بات کی وحی آئی ہے کہ جنات میں سے ایک جماعت نے قرآن سنا' (پھر اپنی قوم میں واپس جا کر انہوں نے) کہا کہ ہم نے ایک عجیب قرآن سنا ہے جو راہِ راست بتاتا ہے سو ہم تو اس پر ایمان لے آئے اور اب ہم اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہیں بنائیں گے اور (انہوں نے یہ بھی بیان کیا کہ) ہمارے پروردگار کی بڑی شان ہے۔ اس نے نہ کسی کو بیوی بنایا اور نہ اولاد اور ہم میں سے جو احمق ہیں وہ اللہ کی شان میں حد سے بڑھی ہوئی باتیں کہتے تھے''۔

جنوں کا یہ دوسرا گروہ جس نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے قرآن سنا پہلے گروہ سے مختلف تھا کیونکہ دونوں کا الگ الگ ذکر ہوا ہے اور دونوں کے دینی عقائد بھی ایک دوسرے سے مختلف تھے مثلاً پہلی بار جس گروہِ جنات نے قرآن سنا وہ حضرت موسیٰؑ کی شریعت کے پیرو تھے کیونکہ قرآن حکیم کے ارشاد کے مطابق انہوں نے کلام الٰہی سن کر کہا تھا کہ ہم ایک ایسی کتاب سن کر آئے ہیں جو (حضرت) موسیٰؑ کے بعد نازل کی گئی ہے گویا یہ شریعت موسوی کے پیرو یعنی یہود تھے مگر مندرجہ بالا آیت میں جنات کے جس گروہ کا ذکر کیا گیا ہے وہ اپنی قوم میں واپس جا کر کہتے ہیں کہ:۔

(۱) ہم نے جو قرآن سنا ہے وہ راہِ راست بتاتا ہے' اب ہم کسی کو اپنے رب کے ساتھ شریک نہیں بنائیں گے۔

(۲) اللہ نے نہ کسی کو اپنی بیوی بنایا ہے اور نہ بیٹا۔

(۳) ہم میں احمق لوگ اللہ تعالیٰ کی شان میں ایسی باتیں کہتے ہیں۔

ان تینوں امور سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ لوگ عیسائی تھے کیونکہ وہ عہد کرتے ہیں کہ ''اب ہم اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہیں بنائیں گے''۔ یہ عقیدہ عیسائیوں کا تھا کہ وہ خدا کے ساتھ حضرت عیسیٰؑ اور حضرت مریمؑ کو بھی شریک کرتے تھے۔ پھر وہ کہتے ہیں کہ اللہ نے نہ کسی کو اپنی بیوی بنایا ہے اور نہ بیٹا۔ یہ عقیدہ بھی بعض عیسائیوں کا تھا۔ وہ حضرت مریمؑ کو نعوذ باللہ خدا کی بیوی اور حضرت عیسیٰؑ کو خدا کا بیٹا قرار دیتے تھے۔ آخر میں جنات کا یہ گروہ کہتا ہے کہ ہم میں سے احمق لوگ اللہ تعالیٰ کی شان میں ایسی باتیں کہتے ہیں یعنی خدا کی بیوی اور بیٹا قرار دینے والے لوگ احمق ہیں اور وہ ہم میں سے ہیں یعنی عیسائی ہیں۔

ان آیات نے واضح طور پر فیصلہ کر دیا کہ جن لوگوں نے حضورؐ اقدس سے قرآن سنا وہ عیسائی تھے اور جنات ہندو، مسلمان، سکھ یا عیسائی نہیں ہوتے جیسا کہ قبل ازیں عرض کیا جا چکا ہے جنوں کو کسی خاص فرقے یا مذہبی عقیدے کا پیرو قرار دینا بعض مفسر حضرات کی ذاتی رائے ہے قرآن حکیم، مستند احادیث اور عقلِ سلیم اس خیال کو درست تسلیم نہیں کرتے۔

اب رہ گیا یہ سوال کہ ان لوگوں کے لئے ''جن'' کا لفظ کیوں استعمال ہوا تو اس کی حقیقت یہ ہے کہ پہلی بار جس گروہِ جنات کا ذکر آتا ہے کہ اس نے ''نخلہ'' میں حضورؐ سے قرآن سنا اس کے متعلق تفسیر فتح البیان کے فاضل مفسر کی رائے ہے کہ ''وہ یمن کے شہر نصیبین کے باشندے تھے''۔ چونکہ یہ لوگ اپنی قوم سے چھپ کر حضورؐ کے پاس آئے تھے اس لئے قرآن نے انہیں ''جن'' کے لفظ سے یاد کیا کیونکہ عربی زبان میں ''جن'' کے معنی ہیں پوشیدہ رہنے والی چیز یا مخلوق۔ دوسری بار جہاں اللہ تعالیٰ حضورؐ کو مخاطب کر کے فرماتا ہے کہ (ان لوگوں سے) کہہ دیجئے کہ مجھے خدا نے وحی کے ذریعے اطلاع دی ہے کہ میرے پاس کچھ جن آئے اور انہوں نے قرآن سنا۔ (سورۃ الجن آیت نمبر ۱) اس کی تفسیر کرتے ہوئے ایک فاضل مفسر نے بڑی صحیح رائے ظاہر کی ہے کہ کفارِ مکہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شدید مخالفت کرتے تھے اور لوگوں کو آپؐ کے پاس جانے اور گفتگو کرنے سے

روکتے تھے۔ کچھ افراد تک حضورؐ کا پیغام پہنچا وہ کفارِ مکہ کی آنکھ بچا کر آئے اور رات کے وقت چھپ کر حضورؐ کو قرآن کی تلاوت کرتے سنا اور ایمان لے آئے۔ چونکہ یہ چھپ کر آئے تھے اور حضورؐ اقدس کو بھی ان کی آمد کا علم نہیں تھا اس لئے اللہ تعالیٰ نے انہیں ''جن'' کے نام سے موسوم کیا اور حضورؐ کو وحی کے ذریعے ان کے قرآن سننے کی خبر دی۔ (تفسیر الجن والجان مانی القرآن مطبوعہ مفید عام پریس۔ آگرہ)

اب حدیث کی طرف آیئے۔ حضرت عبداللہؓ بن عباس اور حضرت عبداللہؓ بن مسعود دونوں بڑے پایے کے صحابی اور مستند ترین راویانِ حدیث میں سے ہیں۔ علم قرآن میں بھی ان دونوں جلیل القدر صحابیوں کا نہایت بلند مقام ہے۔ حضرت عبداللہؓ بن عباس سے ایک حدیث مروی ہے:۔

''عن ابن عباس قال ماقرأ رسول الله صلى الله عليه وسلم على الجن ولا رآهم (ترمذی)

یعنی ''حضرت عبداللہؓ بن عباس نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جنوں کے سامنے نہ قرآن پڑھا اور نہ آپؐ نے انہیں دیکھا''۔

عجیب بات یہ ہے کہ اس حدیث میں ایک طویل روایت بیان کی گئی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ جب شیاطین نے دیکھا کہ انہیں آسمانی خبریں ملنی بند ہوگئی ہیں تو انہوں نے مشرق و مغرب میں دوڑ نا شروع کیا تا کہ وہ اسباب معلوم کریں جن کی بنا پر وہ آسمانی خبروں سے محروم ہو گئے ہیں چنانچہ اسی تلاش میں ان کا رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے گزر ہوا دیکھا کہ آپؐ نمازِ فجر ادا کر رہے ہیں۔ ان شیاطین نے قرآن سنا اور اپنی قوم میں جا کر اسلام کی تبلیغ کی۔

اس روایت میں دو باتیں غور طلب ہیں۔ پہلی یہ کہ اس میں بتایا گیا ہے کہ شیاطین کو آسمانی خبریں ملا کرتی تھیں۔ شیاطین کو ایک پلید مخلوق قرار دیا جاتا ہے جو خود بھی گمراہ ہیں اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتے ہیں۔ ایسی پلید مخلوق پر آسمانی خبروں کے دروازے کیسے کھل سکتے ہیں؟ پھر قرآن ان لوگوں کو جنہوں نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے

کلام الٰہی سنا جن قرار دیتا ہے اور اس روایت میں انہیں شیاطین کہا گیا ہے۔ یہ دونوں باتیں باہم متضاد ہیں۔ اس لئے روایت کا یہ حصہ قطعاً ناقابل قبول ہے اور صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ اصل روایت میں اس کا اضافہ کردیا گیا۔ دوسری روایت حضرت عبداللہؓ بن مسعود سے مروی ہے:۔

"عن ابن مسعود سُئل صحب البنی صلی الله علیه وسلم
لیلة الجن منکم احد قال ماصحبه منا احد"۔ (ترمذی)

یعنی "حضرت عبداللہؓ بن مسعود سے دریافت کیا گیا کہ لیلۃ الجن (جس رات جنوں نے حضورؐ اقدس سے قرآن سنا) میں آپ لوگوں میں سے کوئی شخص نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ تھا؟ حضرت عبداللہؓ بن مسعود نے جواب دیا کہ نہیں کوئی شخص حضورؐ کے ساتھ نہیں تھا"۔

پھر اسی حدیث میں بیان کیا گیا ہے کہ ایک رات کا واقعہ ہے کہ حضورؐ ہم لوگوں سے بچھڑ گئے۔ یہ رات ہم لوگوں نے بہت مصیبت میں گزاری یہاں تک کہ جب صبح ہوئی تو حضورؐ حرا کی طرف سے تشریف لا رہے تھے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ جنوں کا ایلچی میرے پاس آیا پھر میں ان کے پاس گیا' ان کے سامنے قرآن پڑھا۔ راوی بیان کرتا ہے کہ اس کے بعد حضورؐ میرے ساتھ تشریف لے گئے اور ہمیں جنوں کے نشانات اور ان کے الاؤ دکھائے اور یہ بھی فرمایا کہ جنوں نے مجھ سے خوراک مانگی اور وہ جزیرہ کے باشندے تھے۔ اس روایت میں چار باتیں غور طلب ہیں:۔

(۱) جنوں کے ایلچی کا حضورؐ کے پاس تنہا آنا اور حضورؐ کا کسی کو اطلاع دیئے بغیر اس کے ساتھ جنوں کی جماعت کے پاس جانا۔

(۲) جنوں کی قیام گاہ کے نشانات اور ان کے الاؤ کا موجود ہونا اور حضورؐ کا راوی کو یہ نشانات دکھانا۔

(۳) جنوں کا حضورؐ سے کچھ کھانے کے لئے طلب کرنا۔

(۴) ان کا جزیرہ نامی مقام کا باشندہ ہونا۔

یہ چاروں امور ثابت کرتے ہیں کہ وہ جن انسان تھے اور چونکہ پوشیدہ طور پر آئے تھے اس لئے قرآن حکیم اور حضورؐ اقدس نے انہیں جن کے نام سے موسوم کیا۔ انہوں نے اپنی آمد کو اس حد تک پوشیدہ رکھا تھا کہ حضورؐ نے بھی کسی صحابی کو اپنے ہمراہ لے جانا مناسب نہ سمجھا جیسا کہ ترمذی کی اس حدیث میں حضرت عبداللہؓ بن مسعود نے بیان کیا کہ اس رات صحابہ میں سے کوئی شخص حضورؐ کے پاس نہیں تھا۔ اگر وہ روایتی جن ہوتے تو ان کے ایلچی کو حضورؐ کے پاس آکر آپؐ کو تنہا اپنے ساتھ لے جانے کی کیا ضرورت تھی اور ان کے ساتھی شہر سے باہر پڑاؤ کیوں کرتے جب کہ ہمیں بتایا جاتا ہے کہ جن تو ایک ہوائی مخلوق ہے جو کسی کو نظر نہیں آتی وہ تو حضورؐ سے آپؐ کے در دولت پر یا عبادت گاہ میں ملاقات کر سکتے تھے اور کوئی انہیں دیکھ بھی نہ سکتا تھا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ روایتی جن کوئی ہوائی مخلوق نہیں تھی بلکہ نظر آنے والے انسان تھے جو اس ڈر سے مکہ سے باہر مقیم ہوئے تھے کہ کفار مکہ انہیں دیکھ نہ لیں۔

روایت کے مطابق حضورؐ نے راوی کو ان جنوں کی قیام گاہ کے نشانات اور الاؤ دکھائے۔ اس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ یہ مادی اور جسمانی مخلوق تھی جس کے قیام کے نشانات بھی موجود تھے اور انہوں نے آگ بھی جلائی تھی۔ روایتی جنوں کو جنہیں ہوائی اور آتشیں مخلوق قرار دیا جاتا ہے ان امور سے کیا تعلق؟

پھر انہوں نے حضورؐ سے کھانے کے لئے کچھ طلب کیا۔ اس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ وہ انسان تھے کیونکہ روایتی جنوں کو انسانی خوراک کی ضرورت نہیں ہو سکتی۔

حضورؐ نے فرمایا کہ وہ جزیرہ نامی مقام سے آئے تھے اس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ وہ باشندگانِ جزیرہ کی کسی قوم سے تعلق رکھتے تھے۔

قرآن حکیم کے سب سے بڑے مفسر اور عالم اسلام کے عظیم مفکر حضرت امام فخرالدین رازیؒ نے اپنی تفسیر کبیر میں ایک روایت درج کی ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ:۔

"وذکر الحسن ان فیھم یھودا و نصاری و مجوسا و مشرکین"۔ (التفسیر الکبیر للامام الفخر الرازیؒ ص ۱۵۴ جلد نمبر ۲۹، ۳۰)

مطبوعہ جامع ازہر مصر)

یعنی ''حسنؒ بیان کرتے ہیں کہ (جن لوگوں نے حضورؐ سے چھپ کر قرآن سنا) ان میں یہودی، عیسائی، مجوسی اور مشرکین شامل تھے''۔

اگر یہ لوگ وہی جن ہوتے جنہیں ہوائی اور نظر نہ آنے والی مخلوق قرار دیا جاتا ہے تو اس روایت میں اس کی صراحت کی جاتی اور انہیں یہودی، عیسائی، مجوسی اور مشرک قرار نہ دیا جاتا۔

غرض حضرت عبداللہؓ بن عباس اور حضرت عبداللہؓ بن مسعود کی روایتوں نے اس قضیئے کا ہمیشہ کے لئے فیصلہ کر دیا کہ جنوں کی جس جماعت نے حضورؐ اقدس سے قرآن سنا اور جو گروہ حضورؐ سے ملنے آیا وہ قصوں، کہانیوں والے یا روایتی جن نہیں تھے بلکہ یہودی اور عیسائی لوگ تھے، کیونکہ حضرت عبداللہؓ بن عباس کہتے ہیں کہ حضورؐ نے ''جن'' نامی مخلوق کے سامنے نہ قرآن پڑھا اور نہ انہیں دیکھا۔ حضرت عبداللہؓ بن عباس بیان کرتے ہیں کہ جس رات جنوں کا ایلچی حضورؐ سے ملنے اور آپؐ کو اپنی جماعت کے ساتھ لے جانے کے لئے حاضر خدمت ہوا اس رات کوئی صحابی حضورؐ کے ساتھ نہیں گیا تھا گویا یہ پوشیدہ ملاقات تھی چونکہ یہ لوگ چھپ کر حضورؐ سے ملے تھے اس لئے قرآن حکیم نے انہیں ''جن'' کے لفظ سے موسوم کیا۔ اسی طرح حضرت امام رازیؒ کی روایت سے بھی یہ خیال محض واہمہ ثابت ہوتا ہے کہ جن لوگوں نے حضورؐ اقدس سے چھپ کر قرآن حکیم سنا وہ روایتی جن تھے، امام رازیؒ کی پیش کردہ روایت کی رو سے وہ بعض غیر مسلم اقوام کے افراد تھے جو پوشیدہ طور پر حضورؐ سے ملاقات کرنے آئے تھے اس لئے انہیں ''جن'' کے نام سے موسوم کیا گیا۔

جنوں کے لئے انسانوں میں سے رسول؟

جن لوگوں کا خیال ہے کہ زمین پر جن بھی آباد ہیں وہ یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ حضرت سلیمانؑ ان کے لئے بھی بطور رسول مبعوث ہوئے تھے اسی طرح کچھ اور انبیاء کو بھی جنوں اور انسانوں دونوں کی طرف رسول قرار دیا جاتا ہے لیکن ان لوگوں کے یہ خیالات محض

قصوں اور کہانیوں پر مبنی ہیں قرآن حکیم انہیں بے بنیاد قرار دے دیتا ہے چنانچہ سورۂ بنی اسرائیل میں اللہ تعالیٰ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے انکار کی ایک وجہ بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ:۔

وما منع الناس ان یؤمنوا اذجاء ھم الھدی الا ان قالوا ابعث اللّٰہ بشرا رسولا ٥ (سورہ بنی اسرائیل آیت نمبر ۹۴)

''جس وقت ان لوگوں (مشرکین مکہ) کے پاس ہدایت آ چکی تو اس وقت ان کو ایمان لانے سے بجز اس کے اور کسی چیز نے نہ روکا کہ انہوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے ایک بشر کو رسول بنا کر بھیجا''۔ (کسی فرشتے کو کیوں نہ بھیجا)

مشرکین مکہ کے اس اعتراض کے جواب میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:۔

قل لو کان فی الارض ملئکۃ یمشون مطمئنین لنزلنا علیھم من السماء ملکا رسولا ٥ (سورہ بنی اسرائیل آیت نمبر ۹۵)

(اے رسول آپؐ) ''فرمادیجئے کہ اگر زمین پر فرشتے رہتے ہوتے اور اس میں اطمینان سے چلتے بستے تو ہم ضرور ان پر آسمان سے کسی فرشتے کو رسول بنا کر بھیجتے''۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ اس خیال کی تردید فرمارہا ہے کہ زمین پر فرشتے مستقل طور پر آباد ہیں اور ہمارے درمیان چلتے پھرتے ہیں بلکہ فرماتا ہے کہ یہاں ذی شعور اور مستقل وجود رکھنے والوں میں سے صرف انسان آباد ہیں اور اللہ تعالیٰ نے انہی میں سے یعنی انسانوں میں سے رسول بنا کر لوگوں کی طرف بھیجے۔ اس ارشاد نے ہمیشہ کے لئے فیصلہ کر دیا کہ اللہ تعالیٰ ایک مخلوق کی طرف کسی دوسری مخلوق میں سے رسول بنا کر نہیں بھیجتا۔ جس طرح فرشتوں کے لئے انسانوں میں سے رسول بنا کر نہیں بھیجے جاتے اسی طرح جنوں کی طرف بھی انسانوں میں سے رسول مبعوث نہیں کئے جاتے اگر زمین پر جن آباد ہوتے تو اللہ تعالیٰ جنوں ہی میں سے رسول بنا کر بھیجتا۔

یہ نکتہ بھی پیش نظر رکھنا چاہئے کہ قرآن حکیم میں متعدد مقامات پر جنوں کا ذکر آتا

ہے مگر اُن کی طرف بھیجے جانے والے کسی نبی یا رسول کا ذکر نہیں آتا اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جہاں بھی جن کا لفظ استعمال کیا ہے وہاں انسانوں ہی کے بعض گروہ اور اقوام مراد ہیں، ورنہ یہ کیسے ممکن تھا کہ جنوں کے نام سے زمین پر ایک مستقل اور ذی شعور مخلوق آباد ہوتی جس میں اولاد کا سلسلہ بھی جاری ہوتا اور خدا تعالیٰ اس مخلوق کو ہدایت سے محروم رکھتا۔ اس کی دو ہی صورتیں تھیں یا تو اسی مخلوق میں سے نبی اور رسول بھیجے جاتے یا انسانوں میں سے بعض رسولوں کو جنوں کی طرف بھی مبعوث کر دیا جاتا تاکہ وہ ان کی راہنمائی کرتے مگر قرآن حکیم ان دونوں صورتوں کا انکار کرتا ہے۔ سورۂ بنی اسرائیل میں جس کا ابھی سطور بالا میں ذکر کیا گیا ہے اللہ تعالیٰ صاف طور پر فرما رہا ہے کہ ہم ایک نوع یا مخلوق کے لئے دوسری مخلوق میں سے رسول نہیں بھیجا کرتے جیسا کہ فرمایا کہ ''اگر زمین پر فرشتے بستے ہوتے تو ہم انہی میں سے رسول بنا کر بھیجتے''۔ یعنی فرشتوں کے لئے انسانوں میں سے رسول مبعوث نہیں ہو سکتے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اگر روایتی جنوں کا کوئی وجود ہوتا تو ان کے لئے انسانوں میں سے رسول نہ بھیجے جاتے بلکہ جنوں کے لئے جنوں ہی میں سے رسول آتے مگر قرآن حکیم متعدد مقامات پر جنوں کا ذکر کرنے کے باوجود ان کی طرف مبعوث کئے جانے والے کسی ''جن نبی کا کہیں ذکر نہیں کرتا۔ پس ثابت ہو گیا کہ ہمارے لٹریچر میں جنوں کی جو داستانیں بیان کی گئی ہیں وہ سب غلط فہمی پر مبنی ہیں۔

اس مسئلے پر ایک اور زاویہ سے غور فرمایئے۔ ''جن'' نام کی مخلوق کو انسانوں سے بالکل الگ ایک نظر نہ آنے والی مخلوق قرار دیا جاتا ہے۔ لازمی امر ہے کہ اس مخلوق کے مسائل اور معاملات بھی انسانوں سے مختلف ہوں گے۔ ان کی ضروریات بھی الگ ہوں گی، ان کی معاشرت اور ان کے اقتصادی مسائل بھی انسانوں سے جداگانہ ہوں گے۔ اس صورت میں ضروری تھا کہ ان کے لئے بھی قرآن حکیم میں احکامات بیان کئے جاتے مگر سارے قرآن میں کوئی ایک حکم بھی جنوں کے لئے بیان نہیں ہوا۔ ان کے مسائل کا کوئی حل موجود نہیں جبکہ ہم دیکھتے ہیں کہ انسانوں میں سے مردوں اور عورتوں کے لئے الگ الگ احکام موجود ہیں حالانکہ دونوں ایک ہی نوع کے دو حصے ہیں مگر جنوں کے بارے میں جو

انسانوں سے بالکل جداگانہ مخلوق قرار دی جاتی ہے کوئی مسئلہ' کوئی حکم' کوئی ہدایت موجود نہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ قرآن جن لوگوں کو ''جن'' قرار دیتا ہے اور جن کا انبیاء کے سلسلے میں ذکر آتا ہے وہ انسانوں ہی کا ایک حصہ ہیں اور جب اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ **وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون** ٥ (سورہ ذاریات آیت نمبر ٥٦) ''اور ہم نے جنوں اور انسانوں (دونوں) کو اپنی عبادت کے لئے پیدا کیا ہے'' تو اس سے مراد انسانوں ہی کے دو گروہ ہیں۔ اس آیت کریمہ میں پہلے جن کا ذکر کیا گیا ہے اور پھر انس کا۔ یہاں جن سے بادشاہ' امراء اور طاقتور لوگ مراد ہیں اور انس سے عوام الناس۔ چونکہ عوام بادشاہوں' امراء اور طاقتور لوگوں کے تابع ہوتے ہیں اس لئے پہلے انہی ذی اثر لوگوں کو مخاطب کیا گیا کہ ان پر سب سے زیادہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ اس آیتِ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ پہلے بادشاہوں اور ذی اثر لوگوں اور پھر عوام الناس کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ خواہ دنیا کا بڑے سے بڑا انسان ہو خواہ چھوٹے سے چھوٹا ہر شخص کا فرض ہے کہ وہ میری عبادت کرے' میرے احکام کی تعمیل کرے اور میرے انبیاء پر ایمان لائے' اس حکم سے کوئی مستثنیٰ نہیں' تم میں سے جو صاحبِ اقتدار اور دولت مند لوگ ہیں وہ یہ نہ سمجھیں کہ اپنے اقتدار' طاقت اور دولت کی وجہ سے وہ عامتہ الناس سے افضل و برتر ہیں اور ان پر میرا حکم نہیں چلتا' فرماتا ہے کہ ایسا نہیں ہے تم میں سے بڑے سے بڑا شخص بھی میرے سامنے حقیر ہے اور اس کا فرض ہے کہ مودب ہو کر میری بارگاہ میں حاضر ہو اور سر خم کر کے میری اطاعت کرے۔

جنوں کا وجود مسلم ہے

یہاں اس امر کی صراحت ضروری ہے کہ گو ایسے جنوں کا وجود ثابت نہیں ہوتا جنہیں انسانوں سے الگ ایک مستقل مخلوق قرار دیا جاتا ہے' جو ظاہری جسم سے محروم ہونے کے باوجود جب چاہتی ہے انسانی پیکر اختیار کر لیتی ہے اور ظاہری آنکھوں سے نظر آنے لگتی ہے' پھر انسانوں کو چمٹ جاتی ہے' ان کی عورتیں نسلِ انسانی کے مردوں پر عاشق ہو جاتی ہیں

اوران سے جنسی تعلق قائم کر لیتی ہیں اور جب ان جن عورتوں کے سرداروں کو اس جنسی تعلق کا علم ہو جاتا ہے تو وہ دنیا میں آ کر ایسے مردوں کو تلاش کر کے انہیں اٹھا لے جاتے ہیں' طرح طرح کی اذیتیں دیتے اور پھر انہیں قتل کر ڈالتے ہیں۔ اس قسم کے جنوں کا وجود قصوں کہانیوں کی کتابوں میں تو ہے حقیقت کی دنیا سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ اس کے باوجود ہم ایسی مخلوق کے وجود کا انکار نہیں کرتے جو ظاہری آنکھوں سے نظر نہ آنے کے باوجود دنیا میں موجود ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی صرف وہی مخلوق نہیں جو ہم ظاہری آنکھوں سے دیکھتے ہیں' اس کی مخلوق کی اقسام اور ان کی تعداد ہمارے اندازے سے کہیں زیادہ ہے۔ یہ صرف ہمارے کرۂ ارض ہی پر نہیں بلکہ نظام شمسی کے اور بہت سے کروں میں بھی موجود ہو سکتی ہے کیونکہ یہ پوشیدہ ہونے کی وجہ سے ہمیں نظر نہیں آتے مگر وہ ہمارے روایتی جنوں سے کوئی تعلق نہیں رکھتے۔ حضرت آدمؑ' حضرت سلیمانؑ اور حضور اقدسؐ کے ذکر میں جس قسم کے جنوں اور شیاطین کا ذکر آتا ہے ان کا تعلق ہماری دنیا میں پائے جانے والے انسانوں سے ہے۔ جنہیں اللہ تعالیٰ ان کی فطری سرکشی اور آتش مزاجی کی وجہ سے آگ سے مشابہ قرار دیتا ہے کیونکہ یہ کسی نیکی اور بھلائی کو قبول نہیں کرتے' نہ یہ لوگ آسانی سے کسی کی اطاعت پر آمادہ ہوتے ہیں' کسی قانون اور قاعدے کی پابندی کرنا انہیں سخت ناگوار ہوتا ہے' ایسے لوگ آج بھی ہم اپنے گردوپیش اور اپنے معاشرے میں دیکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کو خلافتِ ارضی عطا کی تو اس آتش مزاج اور سرکش طبقے کے سردار ابلیس نے حضرت آدمؑ کی تعظیم کرنے سے انکار کر دیا اور اس تعلیم کو قبول نہ کیا جو اللہ تعالیٰ اس عہد کے مفسد لوگوں کو دینا چاہتا تھا۔ ابلیس نہ صرف اپنی آتشیں فطرت کی بنا پر فضیلتِ آدم سے مشتعل ہو گیا بلکہ حضرت آدمؑ کا مدمقابل بن کر کھڑا ہو گیا اسی روز سے خیر و شر کے معرکے کا آغاز ہوا چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ہر نبی کے مقابلے میں ایک یا چند بااثر سردار ہر دور میں صف آ[illegible] ہے مثلاً رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مقابلے میں ابوجہل اپنا گروہ لے کر آ گیا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مقابلے میں اس زمانے کے کچھ یہود علما اٹھ کھڑے ہوئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقابلے میں فرعون اپنے سرداروں قارون اور ہامان

کے ساتھ صف آراء ہو گیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مقابلے میں نمرود اپنے امراء اور روٗسا کے ساتھ آپؑ کی مخالفت پر کمربستہ ہو گیا۔ اسی طرح حضرت آدم علیہ السلام کے مقابلے میں ابلیس کھڑا ہو گیا۔ گویا ابلیس انبیاء کے مخالفین کے سرداروں کے سلسلے کی پہلی کڑی ہے۔

شیطان اور شیاطین

یہی وجہ ہے کہ شیاطین کو بھی جو ابلیس کی ذریت ہیں قرآن حکیم میں باغی اور سرکش قرار دیا گیا ہے اور یہ لفظ بھی کتاب اللہ میں استعارے کے طور پر استعمال کیا گیا۔ ہر وہ شخص جو حق و انصاف سے روگردانی کرے اور حق پرستوں کے مقابلے میں کھڑا ہو جائے قرآن حکیم کی اصطلاح میں شیطان ہے۔ قرآن حکیم ہی ہمارے اس دعوے کا ثبوت فراہم کرتا ہے چنانچہ حضرت ایوب علیہ السلام کے تذکرے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ:۔

واذکر عبدنا ایوب اذ نادی ربه انی مسنی الشیطن بنصب وعذاب o (سورہ ص آیت نمبر ۴۱)

''اور ایوب کو یاد کرو جب اس نے اپنے رب سے فریاد کرتے ہوئے کہا کہ مجھے شیطان نے بہت رنج اور تکلیف پہنچائی ہے''۔

حضرت ایوب علیہ السلام کے جواب میں اللہ تعالیٰ انہیں ہدایت فرماتا ہے کہ:۔

وخذبیدک ضغثا فاضرب به ط (سورہ ص آیت نمبر ۴۴)

''اپنے ہاتھ میں ایک ٹہنی لے لو اور اس سے (اپنی سواری کے جانور کو) مار مار کر دوڑاؤ تا کہ دشمن کی گرفت میں آنے سے محفوظ رہو''۔

اس آیت میں ''ضغثا'' اور ''ضرب'' کے الفاظ وضاحت طلب ہیں اور ان الفاظ کے معنی پر پوری طرح غور و فکر نہ کرنے کی وجہ سے ہمارے بعض مفسر حضرات کو ایسی ایسی داستانیں بیان کرنی پڑیں جنہیں سن کر موجودہ دور کے تعلیم یافتہ لوگ ہنستے ہیں یا ان کے دلوں میں اللہ کے مقدس نبیوں کے متعلق عقیدت و محبت کی بجائے وحشت پیدا ہوتی ہے مثلاً

ضغثاً اور ضَرَب کے عام معنی کو سامنے رکھ کر یہ داستان بیان کی گئی کہ حضرت ایوب علیہ السلام نے بیماری کے دنوں میں یہ قسم کھائی تھی کہ صحت یاب ہو کر اپنی بیوی کو جس سے آپؑ ناراض ہو گئے تھے سو لکڑیاں ماریں گے۔ ساتھ ہی یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ وہ بیوی بے قصور تھیں اور بیماری میں آپؑ کی رفیق رہی تھیں، حالانکہ معمولی کردار کے لوگ بھی حالتِ بیماری میں اللہ تعالیٰ سے دعائیں کرتے ہیں اور اگر کوئی عہد کرتے ہیں تو یہ کہ صحت یاب ہو کر صدقہ و خیرات کریں گے اور اپنے اللہ کو راضی کرنے والے کام کریں گے مگر خدا کا یہ نبی حالتِ بیماری میں قسم کھاتا ہے کہ اگر خدا نے اسے صحت عطا فرما دی تو وہ اپنی اُس بیوی کے سو ڈنڈے مارے گا جو بیماری کی حالت میں اس کی رفیق بھی رہ چکی تھی اور ان مفسروں کے نزدیک بے تقصیر بھی تھی۔ اللہ کے ایک نبی کے کردار کا یہ نقشہ کھینچا گیا ہے! انا اللہ وانا الیہ راجعون ط۔ پھر اپنی قسم پوری کرنے کے لئے اس مقدس پیغمبر نے جو طریقہ اختیار کیا بلکہ جسے آپؑ سے منسوب کیا گیا وہ بھی کس درجہ مضحکہ خیز اور ہیر پھیر والا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ایوبؑ کو حکم دیا کہ اپنی قسم اس طرح پوری کرلو کہ سو لکڑیوں کی بجائے سو تنکوں کا ایک مٹھا بنا کر وہ اپنی بیوی کے مار دو، مگر مارو ضرور۔ اللہ جزائے خیر عطا فرمائے ''فتح البیان'' کے فاضل مفسر کو جنہوں نے متعلقہ الفاظ کے عام معنی کے علاوہ ایک اور معنی بیان کر کے خدا کے ایک مقدس پیغمبر کے کردار کو داغ دار ہونے سے بچالیا۔

ضغثاً اور ضَرَب کے کئی معنی ہیں۔ مفسر ''فتح البیان'' نے ضغث کے معنی ایسی شاخ کے لکھے ہیں جس کے آخری سرے پر پتے ہوتے ہیں (جلد نمبر ۸ زیر آیت مندرجہ بالا) اور جنگلوں میں رہنے والے لوگ سواری پر بیٹھ کر اس قسم کی شاخ سواری کو دوڑانے کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ ''اقرب الموارد'' میں ضَرَب کے ایک معنی سفر کرنا بھی بیان کئے گئے ہیں۔ پس ان معنی کی رو سے اس آیت کا یہی ترجمہ درست ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ایوبؑ کی فریاد سن کر آپؑ کو ہدایت فرمائی کہ سواری پر بیٹھ کر سفر پر روانہ ہو جاؤ اور کسی درخت کی شاخ ہاتھ میں لے کر اس سے سواری کو مارو تاکہ وہ تیزی سے دوڑے اور تم دشمن کی گرفت سے نکل جاؤ۔ یہاں نہ بیوی کا کوئی قصہ ہے نہ اس کے سو ڈنڈے لگانے کا۔ یہ

ساری پیچیدگیاں ان دو الفاظ کے صرف ایک معنی کو سامنے رکھنے سے پیدا ہوئیں۔

ابلیس کی حیاتِ دُنیوی

ایک اور بڑا لطیف نکتہ جس کی طرف توجہ نہیں دی گئی خاص طور سے قابل غور ہے۔ قرآن حکیم میں جہاں بھی حضرت آدمؑ کی مخالفت بلکہ ان کے لئے سجدہ کرنے کا ذکر آتا ہے ابلیس کا بھی ذکر آتا ہے مگر جب حضرت آدمؑ کا ذکر ختم ہو جاتا ہے تو ابلیس بھی غائب ہو جاتا ہے، پھر اس کے لشکر، اس کی ذریت، شیطان اور شیاطین نمودار ہوتے ہیں۔ قرآن حکیم میں درجنوں نبیوں کا ذکر آیا ہے مگر ان میں سے کسی ایک نبی کے ساتھ بھی ابلیس کا ذکر نہیں آتا، ہر نبی کے ساتھ اس کے دُنیوی مخالفوں کا ذکر آتا ہے یا شیطان اور شیاطین کا۔ آخر ابلیس کہاں چلا گیا؟ اگر وہ کوئی مستقل وجود تھا تو اسے ہر نبی کے زمانے میں موجود ہونا چاہئے تھا اور ہر نبی کے ساتھ اس کا ذکر آنا چاہئے تھا، اس کی سرگرمیاں صرف حضرت آدمؑ کے دور تک کیوں محدود رہیں؟ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ابلیس حضرت آدمؑ کے مخالفین کا سردار تھا اور انسان تھا جو حضرت آدمؑ کے عہدِ خلافت و نبوت کے ساتھ ہی ختم ہو گیا البتہ اپنے گمراہ کن خیالات اور اپنی نسل چھوڑ گیا، بدی اور نافرمانی کا وہ بیج بو گیا جس کے بارے میں اس نے اللہ تعالیٰ سے کہا تھا کہ میں قیامت تک تیرے بندوں کو گمراہ کرتا رہوں گا (۲)۔ یہ بیج پھلا، پھولا اور بارآور ہوا۔ قیامت تک گمراہ کرنے کے یہی معنی ہیں کہ میں ایسے لوگ پیدا کر جاؤں گا جو نسل در نسل بندگانِ خدا کو گمراہ کرتے رہیں گے۔ ان کا قرآن حکیم میں بار بار ذکر آتا ہے اور ہر مسلمان جو قرآن پڑھتا ہے، نماز پڑھتا ہے نماز کے آغاز میں ان الفاظ میں خدا سے پناہ مانگتا ہے کہ اعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم۔

یہ بھی بڑی غور طلب بات اور بڑا اہم نکتہ ہے کہ قرآن شریف کی تلاوت سے قبل شیطان سے خدا کی پناہ مانگنے کا حکم دیا گیا ہے مگر ابلیس سے پناہ مانگنے کی ہدایت نہیں فرمائی گئی حالانکہ اصل مجرم اور سارے فتنہ و فساد کی جڑ تو ابلیس تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پناہ اس کے ظلم اور مکر و فریب سے مانگی جاتی ہے جو موجود ہو، جو دنیا سے جا چکا ہو اس سے کوئی ذی

ہوش اور صاحب عقل پناہ نہیں مانگتا۔ پس اس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ ابلیس فانی شخص تھا اس کا وجود باقی نہیں رہا البتہ اس کے خیالات اور اس کی نسل موجود ہے جسے قرآن حکیم شیطان یا شیاطین کے نام سے موسوم کرتا ہے اور انہی کے شر سے محفوظ رہنے کی دعا کی جاتی ہے۔

اس مقام پر بعض لوگوں کے ذہن میں یہ خیال پیدا ہوگا کہ ابلیس کو تو اللہ تعالیٰ قیامت تک زندہ رہنے کی مہلت عطا فرما چکا ہے اس لئے وہ کیسے مر سکتا ہے۔ یہ خیال درست نہیں۔ قرآن حکیم میں تین مقامات پر ابلیس کو مہلت دیئے جانے کا ذکر ملتا ہے۔ وہ مقامات یہ ہیں:

(۱) قال انظرنی الی یوم یبعثون ٥قال انک من المنظرین ٥ (سورہ الاعراف آیت نمبر۱۴ و۱۵)

(۱) (ابلیس نے) ''کہا کہ مجھے مہلت دیجئے اس دن تک جب لوگوں کو اٹھایا جائے گا۔ فرمایا (اللہ تعالیٰ نے) جا تجھے مہلت دی گئی''۔

(۲) قال ارءیتک ھذاالتی کرمت علی لئِن اخرتن الی یوم القیمة لا حتنکن ذریته الا قلیلاً ٥(سورہ بنی اسرائیل آیت نمبر۶۲)

(۲) (ابلیس نے) ''کہا کہ آپ نے اس شخص (آدم) کو مجھ پر فوقیت دی ہے۔ بھلا بتایئے (یعنی کیا یہ مناسب تھا) خیر اگر آپ نے مجھے قیامت کے زمانہ تک مہلت دی تو بجز قلیل لوگوں کے اس کی تمام اولاد کو بس میں کر لوں گا''۔ (اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جا ان میں سے جو شخص تیری پیروی کرے گا تو تم سب کی سزا جہنم ہے)

(۳) قال رب فانظرنی الی یوم یبعثون٥قال فانک من المنظرین ٥ الی یوم الوقت المعلوم٥ (سورہ الحجر آیت نمبر۳۶ تا ۳۸)

(۳) (ابلیس) ''کہنے لگا کہ تو پھر مجھ کو مہلت دیجئے قیامت کے دن تک ارشاد ہوا (جا) تجھ کو معین وقت کی تاریخ تک مہلت دی گئی''۔

ان تین مقامات میں سے دو مقامات پر ابلیس اللہ تعالیٰ سے قیامت تک زندہ رہنے کی مہلت طلب کرتا ہے۔ تیسرے مقام پر وہ قیامت تک کی مہلت طلب نہیں کرتا بلکہ ایک مفروضہ بیان کرتا ہے جو ''اگر'' کے لفظ سے شروع ہوتا ہے یعنی ''اگر تو نے مجھے قیامت تک بھی مہلت دے دی تو بھی میں تیرے بندوں کو گمراہ کرنے سے باز نہیں آؤں گا'' مگر اللہ تعالیٰ ان تین مقامات میں سے کسی ایک مقام پر بھی اسے قیامت تک زندہ رہنے کی مہلت نہیں دیتا۔ آیت (۱) میں فرماتا ہے کہ جا تجھے مہلت دی گئی مگر مہلت کی مدت مقرر نہیں فرماتا۔ آیت (۲) میں فرماتا ہے کہ جا جو شخص تیری پیروی کرے گا تو تیرا بھی اور تیری پیروی کرنے والوں کا بھی ٹھکانہ جہنم ہے۔ یہاں بھی قیامت تک مہلت دینے کا کوئی ذکر نہیں بلکہ اتنا فرمایا کہ ''جا'' یعنی دور ہو جا۔ آیت (۳) میں فرمایا کہ جا تجھے معیّن وقت کی تاریخ تک مہلت دی جاتی ہے۔ یہاں بھی اسے قیامت تک مہلت دینے کا قطعاً ذکر نہیں بلکہ ایک مقررہ مدت تک (جسے معین وقت کہا گیا ہے) مہلت دی گئی۔ ظاہر ہے کہ ہر شخص کی عمر کی ایک حد مقرر ہوتی ہے جسے مدتِ معینہ کہتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں اللہ تعالیٰ ابلیس کی اس درخواست کے جواب میں کہ مجھے قیامت تک مہلت دیجئے فرماتا ہے کہ تجھے قیامت تک مہلت نہیں دی جاسکتی البتہ ہم فوری طور پر تیری گرفت نہیں کریں گے بلکہ تجھے اس وقت تک مہلت دیتے ہیں جب تک تیری عمر کے معین وقت کی آخری تاریخ نہیں آ جاتی۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ابلیس کو فوری طور پر عذاب دے کر ہلاک نہیں کیا گیا بلکہ اس کی مقررہ عمر تک اسے ڈھیل دے دی گئی تھی۔ ابلیس نے کتنی عمر پائی ستر برس، اسی برس، سو برس یا دو سو برس؟ اس کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے۔

....

حواشی :

(۱) بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے جنوں کو حضرت سلیمانؑ کے تابع فرمان کر دیا تھا مگر ان جنوں سے مراد طاقتور اور سرکش قومیں ہیں نہ کہ نوعِ انسانی سے کوئی الگ مخلوق۔ (مولف)

(۲) ابلیس کا ذکر حضرت آدمؑ کے واقعے کے علاوہ ایک جگہ اور آتا ہے مگر براہ راست نہیں بلکہ ابلیس کے لشکروں (جنود ابلیس) کا ذکر آتا ہے کہ وہ قیامت کے دن دوزخ میں منہ کے بل گرا دیے جائیں گے (الشعراء آیت نمبر ۹۴و۹۵) اسی طرح قوم سبا کے سلسلے میں بھی ابلیس کا ذکر آتا ہے کہ ابلیس نے گمراہوں سے جو توقعات وابستہ کی تھیں وہ پوری ہوئیں۔ان دونوں مقامات میں کہیں بھی ابلیس کے ذاتی طور پر موجود ہونے کا کوئی ذکر نہیں۔(مولف)

⌘⌘⌘

Mian Abdul Latif Shahkoti
Tamga Khidmat Pakistan

رُوح کی حقیقت

اللہ تعالیٰ نے یہ کائنات تخلیق کر کے انسان کے سپرد کر دی تا کہ وہ اسے نکھارے سنوارے، علم وفن اور آگہی وخدا پرستی کا گہوارہ بنائے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے خالقِ کائنات نے انسان کو اعلیٰ درجے کی طاقتیں اور صلاحیتیں عطا فرمائیں۔ جب سے تاریخِ تہذیب کا سراغ ملتا ہے اس وقت سے آج تک انسان نے اس کائنات کو سنوارنے اور اپنی زندگی کو خوب سے خوب تر بنانے کے لئے ان طاقتوں اور صلاحیتوں سے بھرپور کام لیا لیکن انسانی زندگی اور اس کی تہذیب کا یہ سب سے بڑا المیہ ہے کہ انہی طاقتوں اور صلاحیتوں نے تہذیب کائنات اور حیاتِ انسان کو غارت بھی کیا۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ جب دنیا کے کسی حصے کی زمامِ اقتدار ایسے لوگوں کے ہاتھ میں آ گئی جو خود اپنی تہذیبِ نفس میں خام تھے تو اس خطے میں تعمیر نے تخریب کا روپ دھار لیا۔ یہ عمل بار بار دہرایا گیا لیکن ہر تباہ شدہ تہذیب کی راکھ میں ایسی چنگاریاں ضرور موجود رہیں جن سے تہذیبِ کائنات کے چراغ پھر روشن ہو گئے۔ تعمیر اور تخریب کا یہ عمل اسی طرح ہزاروں سال سے جاری ہے اور معلوم نہیں کب تک جاری رہے گا۔

تہذیبِ کائنات کے عمل میں، جن افراد نے حصہ لیا انہیں دو طبقوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک وہ مقدس نفوس جن کے پاس وحی والہام کی روشنی تھی۔ دوسرا طبقہ ان فلسفیوں اور دانشوروں کا جنہوں نے صرف عقل وفکر سے کام لے کر تہذیب کے چراغ روشن کئے۔ ان دونوں طبقوں نے پہلو بہ پہلو انسانیت اور تہذیب کی خدمت کی۔ فرق

صرف اتنا ہے کہ جن مقدس نفوس کے ساتھ وحی والہام کی روشنی تھی ان کا قدم کبھی راہ راست سے اِدھر اُدھر نہ ہوا کیونکہ ان کی تعلیم ونظریات صرف اُن کی ذات کی فکر کا پرتو نہ تھے بلکہ ایک غیبی طاقت جو تمام عقل و دانش کا سرچشمہ ہے ان کی راہنمائی کر رہی تھی' اس لئے ان کے افکار میں کبھی کجی پیدا نہ ہوئی اور ان کے ہر اقدام کے درست اور صحیح نتائج نکلے جن سے انسانیت پوری طرح بہرہ ور ہوئی' مگر دانشوروں اور فلسفیوں کے افکار نے بعض دفعہ ٹھوکریں بھی کھائیں اور انسانیت کا قافلہ جادۂ مستقیم سے ہٹ گیا کیونکہ ان کے پاس صرف عقل تھی جس کے ساتھ وحی والہام کی روشنی نہ تھی۔ اس کے باوجود انہوں نے ہماری تہذیب کو بہت کچھ دیا بھی۔ اپنی عمریں اس گتھی کو سلجھانے میں صرف کر دیں کہ انسان کو انسانیت کے بلند مقام پر کس طرح فائز کیا جائے؟

یہاں ایک نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ بنیادی طور پر انسان کا خمیر ایک ہی مادّے سے اٹھایا گیا' یعنی اس کی تخلیق ایک ہی قسم کے عناصر سے ہوئی۔ اسی زمین پر اور اسی آب وہوا میں وہ پروان چڑھا اور یہیں اس کے فکر وشعور نے آنکھ کھولی اس لئے اس کی سوچ کا انداز بھی مشترک رہا۔ یہی وجہ ہے کہ بعض صداقتیں اور فکر کی بعض بنیادیں ہر زمانے' ہر قوم اور ہر ملک میں یکساں رہیں۔ اس کی ایک بڑی اور اصل وجہ یہ ہے کہ ابتدائی طور پر تہذیبِ کائنات کا چراغ روشن کرنے والے انبیاء اور روحانی مصلح تھے۔ یہ سب ایک ہی ہستی کی طرف سے ایک ہی پیغام لے کر مبعوث ہوئے تھے۔ اس لئے ان کی تعلیم میں ایک سی بنیادی صداقتیں موجود رہیں۔ فلسفی اور دانشور ان کے بعد پیدا ہوئے جنہوں نے روحانیت سے براہِ راست متعلق نہ ہونے کے باوجود روحانی شخصیتوں کے افکار سے اثر ضرور قبول کیا کیونکہ یہ ناممکن ہے کہ کسی جگہ ایک چراغ روشن ہو اور آنکھ رکھنے والا شخص اس روشنی کو نہ دیکھے اس لئے غیر شعوری طور پر ہی سہی انبیاء و روحانی مصلحین کے نورِ افکار سے ان فلسفیوں اور دانشوروں نے روشنی ضرور حاصل کی۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے بہت سے افکار آپس میں مشترک ہیں۔ ان میں جہاں اختلاف ہے وہ ان کی ذاتی فکر اور عقلی و علمی استعدادوں کے فرق کا نتیجہ ہے۔ ان فلسفیوں اور دانشوروں نے اس کائنات اور اس کے

مسائل پر غور وفکر کیا۔ یہ کائنات کب سے ہے؟ اس کی حقیقت کیا ہے؟ اسے کس نے پیدا کیا یا خود بخود عالم وجود میں آ گئی؟ انسان کیا ہے؟ روح کی حقیقت کیا ہے؟ علم کا سرچشمہ کہاں ہے؟ نیکی کیا ہے؟ بدی کیا ہے؟ نفس انسانی کی کیا حقیقت ہے؟ علم و آگہی کیسے حاصل کی جا سکتی ہے؟ خواہشات رذیلہ کیوں پیدا ہوتی ہیں اور ان پر کیسے قابو پایا جا سکتا ہے؟ ان مسائل پر غور کرنے اور ان کا حل دریافت کرنے کا نام فلسفہ ہے۔

روح کی حقیقت کے بارے میں فلاسفہ کے افکار

خالق کائنات کی ہستی پر غور کرنے اور اس کا سراغ لگانے کے بعد روح ہمارے مفکرین اور فلاسفہ کے فکر و فلسفہ کا موضوع بنی کیونکہ اصلِ کائنات یہی روح ہے جس کی حقیقت و ماہیت سمجھ لینے سے انسان میں اس کے نفس کا شعور بیدار ہو جاتا ہے۔ شعور کی اسی بیداری سے اس میں خدا کا خوف پیدا ہو جاتا ہے' اس کی تہذیبِ نفس ہوتی ہے اور وہ انسانیت کے لئے سراپا خیر و فلاح بن جاتا ہے۔ روح کی حقیقت پر قدیم ہندی' یونانی اور مسلمان فلاسفروں نے طویل بحثیں کیں اور اپنے نظریات بڑی شرح و بسط سے پیش کئے۔ اس طرح ان فلاسفہ نے علم کے ذخیرے میں قابلِ قدر اضافہ بھی کیا اور ایک حقیقت کے سمجھنے میں بہت سی نئی حقیقتیں معلوم کیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ ان فلسفیوں نے روح کی تحقیق میں بعض مقامات پر ٹھوکریں بھی کھائیں' اس کی وجہ ان کی ایک بنیادی غلطی تھی جس پر ہم انشاءاللہ آئندہ صفحات میں اظہارِ خیال کریں گے۔

ہند کے قدیم فلاسفروں کے نظریات

ہند کے قدیم فلسفیوں میں ایک بہت بڑا مفکر گوتم نامی گزرا ہے یہ وہ گوتم نہیں جو مہاتما بدھ کے نام سے مشہور ہے اور بدھ مذہب کا بانی ہے بلکہ یہ ایک اور مفکر ہے جس نے ''نیایہ سوترا'' کے نام سے ایک ضخیم کتاب بھی لکھی تھی جو پانچ جلدوں پر مشتمل ہے۔ یہ گوتم ایک مستقل فلسفے کا بانی تھا جو ''فلسفۂ نیایہ'' کے نام سے مشہور ہوا۔ یہ روح پر بحث کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ''روح ایک جوہر لطیف کا نام ہے جو نفس اور جسم دونوں سے الگ وجود رکھتا

ہے۔عقل اور علم اسی سے ظہور میں آتے ہیں۔ ہر شخص کی روح علیحدہ ہوتی ہے۔ روح زماں ومکاں کی قید سے ماوراء ہے اور کبھی فنا نہیں ہوتی۔ روح ایک ایسا جوہر ہے جو نہ ٹوٹ سکتا ہے اور نہ اس کے اجزاء الگ ہو سکتے ہیں۔ روح، نفس، حواس اور جسم میں گہرا ربط ہے۔ روح یا جان عقل وعلم کو جنم دیتی ہے یا یوں کہا جاسکتا ہے کہ یہ دونوں اس کی صفات ہیں۔ روح جب نفس سے مل جاتی ہے تو اس پر علم کی کرنیں اپنا نور پھیلاتی ہیں۔ علم کی روشنی سے نفس میں زندگی پیدا ہوتی ہے، نفس حواس کو روشنی بخشتا ہے، حواس کی روشنی سے اشیاء میں تابندگی پیدا ہوتی ہے اس طرح ہم خدا کے عرفان تک پہنچ جاتے ہیں جو اس کائنات کی تخلیق کے اسباب میں سے سبب اول ہے، لیکن وہ (یعنی خدا) کسی چیز کو عدم سے وجود میں نہیں لاتا بلکہ غیر منظم اور منتشر مادے کو منظم کر کے کائنات کو وجود بخشتا ہے''۔ یہاں پہنچ کر فلسفی گوتم کی فکر نے ٹھوکر کھائی اور اس نے اس حقیقت کا انکار کر دیا کہ خدا مادّے کا بھی خالق ہے۔

قدیم ہندی فلاسفروں میں دوسرا فلسفی کپیلا (Capella) ہے۔ اس کے ایک شاگرد آسوری نے کپیلا کے فلسفے کی تشریح کی۔ کپیلا کا فلسفہ ''فلسفۂ سانکھیہ'' کے نام سے مشہور ہوا۔ اس فلسفے کی رو سے روح ایک ایسی قوت ہے جو خدا اور مادے کے درمیان ہے یعنی نہ ہم اسے خدا کہہ سکتے ہیں اور نہ کوئی مادی شے قرار دے سکتے ہیں۔ جب یہ قوت حرکت میں آتی ہے اور خدا سے ربط قائم کرتی ہے تو خدا کے وجود میں بھی حرکت پیدا ہوتی ہے۔ اس کے نتیجے میں اشیائے عالم کا ظہور ہوتا ہے۔ روح مادّے کے تغیر سے اثر پذیر نہیں ہوتی، یہ ابدی ہے لیکن اس کے باوجود خدا سے الگ اپنا ایک مستقل وجود رکھتی ہے۔ کپیلا کہتا ہے کہ اس کائنات میں دو حقیقتیں بنیادی حیثیت کی حامل ہیں ایک روح اور دوسری ''پراکرتی''۔ کپیلا ''پراکرتی'' کا نام اس قوت کو دیتا ہے جو اس کائنات کی پیدائش کا سبب اول ہے جسے ہم خدا کہہ سکتے ہیں۔ کپیلا کے نظریئے کے مطابق مادّہ اور خدا ایک دوسرے سے الگ نہیں ہیں بلکہ کائنات خدا کی صورت میں ظہور پذیر ہوئی۔ خدا اور اس کائنات کے درمیان بے شمار اسباب وعلل ہیں۔ اسباب وعلل کا یہ سلسلہ ایک مقام پر جا کر ختم ہو جاتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں سب سے پہلا سبب کائنات یعنی خدا صورت اور جسم کی حدود

سے نکل کر صرف ایک غیر مادّی قوت بن جاتا ہے۔ یہی ''پراکرتی'' ہے' کپیلا کہتا ہے کہ روح کو نہ اسباب میں شامل کیا جا سکتا ہے اور نہ اسے اسباب کے نتیجے میں پیدا ہونے والا وجود یعنی مادّہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ کپیلا کی رائے میں علم روح سے الگ کوئی چیز نہیں بلکہ روح میں ہی شامل ہے۔ وہ کہتا ہے کہ روح میں تین قوتیں ہیں۔ ایک نیکی کی قوت' دوسری شجاعت کی قوت' تیسری جہالت وخود غرضی کی قوت۔ یہ تینوں قوتیں دریا کی لہروں کی طرح ساتھ ساتھ رہتی ہیں اور ایک دوسرے پر غالب آنے کی کوشش کرتی رہتی ہیں۔ ان میں سے انسان پر جس قوت کا غلبہ ہو جاتا ہے اس کی شخصیت اسی قوت کے تابع ہو جاتی ہے مثلاً اگر نیکی کی قوت شجاعت اور جہالت وخود غرضی کی قوتوں پر غالب آ جائے تو انسان نیک ہو جاتا ہے۔ یہی اثر دوسری قوتوں کا ہوتا ہے۔ انہی قوتوں کی کارفرمائی سے انسانی وجود اور یہ کائنات قائم ہے۔

قدیم ہندی فلاسفروں میں پتنجلی (Patanjali) بہت بڑا فلسفی گزرا ہے۔ اس کا فلسفہ اتنا مقبول ہوا کہ برصغیر کے علاوہ یونان اور اسکندریہ کے فلسفی بھی اس سے متاثر ہوئے۔ پتنجلی روح کو ایک مستقل حقیقت قرار دیتا ہے جو ہر نقص سے پاک ہے۔ یہ تین واسطوں سے جسم کے ساتھ تعلق پیدا کرتی ہے۔ عقل' نفس' حواس۔ روح میں تغیر نہیں ہوتا اور ذاتی طور پر یہ ہر قسم کی حرکت سے منزہ اور غیر متحرک ہے لیکن جب جسم میں داخل ہوتی ہے تو عقل سے اتصال کی وجہ سے متحرک محسوس ہوتی ہے۔ روح اور جسم کا بڑا گہرا تعلق ہے اگر جسم صحت مند ہوگا تو روح بھی صحت مند ہوگی' بیمار جسم میں روح بھی بیمار ہوگی۔

یہ سارے فلسفے کسی نہ کسی رنگ میں ویدانی مذہب سے تعلق رکھتے ہیں۔ پھر ایک دور آیا جب ویدانی مذہب پر تنقید کی گئی' اس کی تعلیمات کے بعض حصوں سے اختلاف کیا گیا۔ اس طرح ایک نیا مذہب وجود میں آیا جو ''جین مت'' کے نام سے مشہور ہوا۔ پارس ناتھ اس مذہب کا بہت بڑا مفکر تھا جو حضرت مسیحؑ کی ولادت سے آٹھ یا نو صدی قبل پیدا ہوا۔ جین مذہب کا دوسرا ممتاز مفکر مہاویر وردمان تھا' ان مفکروں نے جو فلسفہ پیش کیا اس میں روح کی تحقیق اور اس پر غور وخوض کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ بعد کے فلاسفہ جن میں

یونانی فلسفی سرِفہرست ہیں روح کے جینی فلسفے سے بہت متاثر ہوئے بلکہ فلسفۂ یونان پر تو اس فلسفہ کے اثرات صاف طور پر دیکھے جا سکتے ہیں۔ جینی فلسفے کی رو سے روح ایک جوہر ہے جو جسم سے الگ وجود رکھتا ہے۔ روح جسم کی طرح تغیر کے مراحل سے نہیں گزرتی۔ روح کے چار درجے ہیں۔ پہلا درجہ وہ جب یہ جمادات میں ہوتی ہے مگر اس درجے میں روح غیر محسوس ہوتی ہے۔ دوسرا درجہ وہ ہے جب یہ نباتات میں کارفرما ہوتی ہے۔ جمادات کے مقابلے میں نباتاتی روح کسی قدر محسوس ہوتی ہے، مگر یہ بھی اس کی ناتوانی کا درجہ ہے۔ تیسرا درجہ وہ ہے جب روح حیوانات کے جسم میں داخل ہوتی ہے اس درجے میں روح زیادہ توانا ہوتی ہے۔ چوتھا درجہ وہ ہے جب روح انسانی جسم میں قرار پکڑتی ہے، یہاں آ کر وہ سب سے زیادہ توانا ہو جاتی ہے۔ یہی روح انسانی زندگی کو متحرک کرتی اور اس سے مختلف قسم کے اعمال و افعال صادر کرواتی ہے۔ روح لافانی ہے مگر اس سے جو حرکات سرزد ہوتی ہیں انہیں دوام حاصل نہیں۔ انسانی جسم میں تغیر و تبدل ہوتا رہتا ہے۔ اس لئے یہ فانی ہے مگر روح میں کوئی تغیر و تبدل نہیں ہوتا اس لئے یہ فنا کی دستبرد سے محفوظ ہے۔

رامانوج بارہویں صدی عیسوی کا فلسفی ہے اور یہ ویدانی مذہب سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ فلسفی روح کی حقیقت بیان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ روح ایک تابناک جوہر ہے جو غیر معمولی عقل رکھتا ہے۔ روح کا خدا سے الگ اپنا ایک مستقل وجود ہے اور جسم سے جدا ہونے کے بعد یہ خدا سے واصل نہیں ہوتی کیونکہ روح ایک محدود جوہر ہے جبکہ خدا ایک لامحدود ہستی ہے۔ محدود لامحدود سے اتصال پیدا نہیں کر سکتا۔ موت جسم کو فنا کر دیتی ہے مگر جسم کے مرنے سے روح نہیں مرتی بلکہ اسے جس قسم کے بدن سے رغبت ہوتی ہے اس میں داخل ہو جاتی ہے۔ یہاں پہنچ کر رامانے آواگون کا غیر حقیقی نظریہ پیش کر دیا۔ تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو:۔

(1) "Out Lines of Indian Philosophy" by P.T. Srinivasa Iyenger.

(2) "Hindu Psychology. Its Meaning for the West"

by Swami Akhila Nanda.

(3) "Hindu Philosophers of Evolution" by Doctor Bal Krishna

یونانی فلسفیوں کے نظریات

یونانی فلاسفہ نے روح کی حقیقت دریافت کرنے کی جو کوششیں کیں ان پر ہند کے قدیم فلسفیوں کے اثرات بھی نظر آتے ہیں۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ یونان کے فلاسفہ ہندی فلاسفہ کے مقابلے میں زیادہ زیرک، وسیع النظر اور کثیر المطالعہ تھے۔ انہوں نے ذاتی تدبر کے علاوہ دنیا کے دوسرے فلاسفہ کے افکار و خیالات سے بھی استفادہ کیا۔ روح کے بارے میں یونان کے قدیم فلسفی ڈیموکریٹس (DEMOCRITUS) نے سب سے الگ اور منفرد نظریہ پیش کیا وہ کہتا ہے کہ روح مخلوق ہے اور باریک در باریک ذرات سے وجود میں آئی۔ یہ ذرات آتشیں خاصیت رکھتے ہیں۔ روح کے مختلف مدارج اور قیام گاہیں ہیں اور ہر درجے اور ہر قیام گاہ میں اُس کا عمل مختلف ہوتا ہے جب یہ دماغ میں ہو تو عقل کہلاتی ہے اور اس سے حکمت و دانش کا ظہور ہوتا ہے۔ جب یہ دل میں قیام کرے تو شجاعت اور عالی ہمتی کی صفات ظاہر ہوتی ہیں اور جب یہ جگر میں چلی جائے تو خواہشاتِ نفسانی مثلاً شہوت و ظلم کے لوازم کا ظہور ہوتا ہے۔

یونان کے سب سے بڑے فلسفی سقراط نے روح کے بارے میں یہ نظریہ پیش کیا کہ روح ایک مستقل وجود کی حامل ہے اور یہ جسم سے بالکل الگ ہے۔ جسم پر موت وارد ہونے سے روح فنا نہیں ہوتی بلکہ یہ جسم کی قید سے آزاد ہو جاتی ہے اس لئے موت سے خوفزدہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔

سقراط کے بعد اس کے شاگرد اور یونان کے عظیم فلسفی افلاطون نے روح کی حقیقت پر زیادہ باریک بینی سے غور کیا۔ اس نے بھی اپنے استاد سقراط کی طرح روح کو جسم سے ایک الگ وجود قرار دیا۔ افلاطون کہتا ہے کہ روح دراصل وہ طاقت ہے جو جسم میں زندگی پیدا کرتی ہے۔ یہ اس سوار کی طرح ہے جو گھوڑے کو اپنے قابو میں رکھتا ہے اور اپنی

مرضی کے مطابق جسم کا رُخ موڑتا رہتا ہے۔ اس کی رائے میں روح انسانی افعال و اعمال کی نگران ہے اور انسانی جسم جو حرکت و ارادہ یا فعل کرتا ہے وہ روح کے تابع ہوتا ہے۔

افلاطون کے شاگرد ارسطو نے اپنے استاد کے فلسفیانہ خیالات سے اختلاف بھی کیا اور بعض جگہ ان پر اضافے بھی کئے۔ بعد کے تمام یونانی فلسفیوں حتیٰ کہ بہت سے مسلمان فلاسفروں اور مفکروں نے بھی ارسطو کے فلسفے سے نہایت گہرا اثر قبول کیا۔ ارسطو روح کے بارے میں اپنے استاد سے زیادہ شرح و بسط سے اپنے نظریات پیش کرتا ہے۔ علامہ ابنِ رُشد نے ''کتاب الروح'' کے نام سے ارسطو کے افکار کی تشریح کرتے ہوئے روح کے بارے میں یونان کے اس عظیم فلسفی کے جو نظریات پیش کئے ہیں ان کی رو سے روح اس قوت کا نام ہے جس پر جسم کی بقا کا دارومدار ہے۔ روح وہ اصل ہے، جس سے جسم کا پیکر وجود میں آتا ہے، جسم کے ہر حصے کی علیحدہ صورت ہوتی ہے اس طرح یہ بہت سے اعضاء کا مجموعہ ہوتا ہے۔ یہ روح ہی ہے جو جسم کو وحدت عطا کرتی ہے اور اس کے اعضا ایک دوسرے سے مربوط ہو کر زندگی کا عمل سرانجام دیتے ہیں۔ اپنے نظریئے کی مزید تشریح کرتے ہوئے ارسطو کہتا ہے کہ روح ایک ایسا جوہر بے مثال ہے جس کے افعال کا دارومدار جسمانی ساخت پر منحصر ہے جب یہ نباتات میں ہوتی ہے تو ان کی نشوونما کا باعث بنتی ہے۔ اس مرحلے میں یہ غذائیت کی محتاج ہوتی ہے۔ عالم نباتات ارتقائی مراحل سے گزر کر جب مکمل ہو جاتا ہے تو روح عالمِ حیوانی میں آ جاتی ہے۔ حیوان میں حس و حرکت اسی روح کی بدولت رونما ہوتی ہے۔ عالم حیوانی سے نکل کر جب روح انسان میں داخل ہوتی ہے تو اس میں عقل کی قوت پیدا ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسانوں کے حواس حیوانوں سے کہیں زیادہ مکمل ہوتے ہیں۔ ارسطو بھی اپنے پیش رو فلسفیوں کی طرح یہی نظریہ پیش کرتا ہے کہ موت نفس کو فنا کر دیتی ہے لیکن اس کا جوہر یعنی روح فنا نہیں ہوتی۔

ارسطو کہتا ہے کہ روح دراصل چار اجزاء کا مجموعہ ہے۔ شائد اس سے ارسطو کا مفہوم یہ ہے کہ روح میں چار قسم کی قوتیں پائی جاتی ہیں۔ ایک قوتِ حیات یعنی وہ قوت جس سے جسم غذا کو ہضم کرتا ہے، حرکت کرتا ہے اور اپنی نسل بڑھاتا ہے۔ یہ قوت انسانوں اور

حیوانوں دونوں میں پائی جاتی ہے۔ روح کی دوسری قوت کا نام قوتِ ادراک ہے۔ یہ وہ قوت ہے جس کے ذریعے جسم دیکھنے، سننے، چکھنے اور چھونے کا فریضہ سرانجام دے کر ان ذرائع سے علم حاصل کرتا ہے۔ ان حسوں میں ایک مشترک حس ہوتی ہے جس سے یہ ساری حسیں ترکیب پا کر اپنا وظیفۂ زندگی انجام دینے کے قابل ہو جاتی ہیں۔ روح کی تیسری قوت کا نام قوتِ حرکت ہے یعنی یہ قوت جسم کو حرکت و عمل پر ابھارتی ہے۔ جب ہم کسی چیز کی خواہش کرتے ہیں، کسی کام کا ارادہ کرتے ہیں تو ان کی تہہ میں یہی قوت کارفرما ہوتی ہے۔ روح کی چوتھی قوت کا نام قوتِ عقلیہ ہے۔ یہ اپنی ذات میں ایک الگ قوت ہے اور اس کی بنیاد محسوسات پر نہیں یعنی یہ حواس سے بالکل الگ ایک قوت ہے یہ باقی تینوں قوتوں پر غالب اور ان کو محیط ہے۔ اس قوت کو نفس ناطقہ بھی کہتے ہیں۔ ان چاروں قوتوں کے مجموعے کا نام روح ہے مگر ان میں سے چوتھی قوت یعنی قوت عقلیہ صرف انسانوں میں پائی جاتی ہے۔ جسم کی موت کے نتیجے میں باقی تینوں قوتیں یعنی قوتِ حیات، قوتِ ادراک اور قوتِ حرکت فنا ہو جاتی ہیں کیونکہ ان کی بنیاد کسی نہ کسی رنگ میں احساس پر ہوتی ہے مگر قوتِ عقلیہ فنا نہیں ہوتی کیونکہ یہ قوت احساس پر مبنی نہیں۔ گویا ارسطو قوتِ عقلیہ کو روح کی اصل قرار دیتا ہے یا اسے حقیقی روح سمجھتا ہے۔

مسلمان مفکروں کا فلسفۂ روح

اسلام میں عبادات و معاملات، اخلاق و معاشرت اور معاشیات و سیاسیات کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ابتدائی عہد کے مسلمان اہل علم اکابر نے اپنی ساری توجہ انسان کو عظمت انسانی سے روشناس کرانے اور دنیا میں امن وخوش حالی کے قیام اور بندوں کو اپنے خدا کا پرستار بنانے پر مرکوز رکھی مگر جب بنوعباس کا دور آیا تو عباسی خلفا نے اسلامی علوم وفنون کے سرمائے میں اضافے کرنے پر توجہ مرکوز کی۔ اگرچہ اس کا آغاز بنوامیہ کے عہد ہی میں ہو گیا تھا مگر بنوعباس کے عہد میں یہ عمل معراج کمال کو پہنچ گیا اور سنسکرت، عبرانی، یونانی اور دنیا کی دوسری زبانوں کی کتبِ علم وحکمت کے عربی زبان میں

تراجم کئے گئے۔اس طرح دوسری اقوام اور مذاہب کے مفکروں اور فلاسفروں کے فلسفے سے عرب اور مسلمان مفکر روشناس ہوئے۔ بنوامیہ اور پھر بنوعباس نے جس سلسلۂ علم وحکمت کا آغاز کیا تھا وہ بدستور جاری رہا اور آگے چل کر یعقوب الکندی، فارابی، ابن سینا، ابن مسکویہ، غزالی، ابن باجہ، ابن طفیل اور ابن رشد جیسے اکابر عالم اور فلسفی پیدا ہوئے جنہوں نے یونانی فلسفے سے گہرا اثر قبول کیا مگر خود بھی ایک فلسفے کی بنیاد ڈالی۔امام غزالیؒ نے اگرچہ یونانی فلسفے پر سخت تنقید کی مگر اس تنقید نے بھی ایک ایسے فلسفے کی صورت اختیار کرلی جس پر یونانی اثرات تو نہ تھے مگر روح اور مادہ کی بحث اس فلسفے کے قابل ذکر اجزاء تھے۔اس طرح قدامت پسند مسلمان علما نے روح کی حقیقت پر بحث وگفتگو کی ممانعت کر کے اور اسے اسلامی تعلیمات کے خلاف قرار دے کر جو بند باندھا تھا وہ ان مسلمان مفکرین خصوصاً حضرت امام غزالیؒ کے ہاتھوں ٹوٹ گیا۔

یعقوب الکندی وہ پہلا مسلمان عالم ہے جس نے اسلام میں فلسفے کی بنیاد ڈالی اور روح اور عقل کے باہمی تعلق پر بحث کی۔اس نے ارسطو کے فلسفے کا نہایت باریک بینی سے مطالعہ کیا تھا اور اس کی بہت سی تصانیف کے خلاصے بھی مرتب کئے تھے مگر اس کے ساتھ ساتھ اس نے تخلیقی کام بھی کیا اور دنیا کو علم وحکمت کے شعبے میں بہت کچھ دیا۔عقل اور پانچ جوہروں پر اس کی طبع زاد کتابیں اسلامی فلسفے کا بیش قیمت سرمایہ ہیں۔الکندی روح کے بارے میں یہ نظریہ پیش کرتا ہے کہ اس میں چار قسم کی قابلیتیں پائی جاتی ہیں جن میں سے تین انسانی روح میں ابتدا سے موجود ہوتی ہیں اور ایک عنصر ایسا ہے جو روح میں موجود نہیں ہوتا بلکہ خارج سے اس میں داخل ہوتا ہے۔یہ عنصر روح سے قطعی طور پر الگ ہوتا ہے۔یہ خدا کے پاس سے آتا ہے اور انسانی جسم پر حکومت کرتا ہے۔الکندی اسے عقلِ فعال کے نام سے موسوم کرتا ہے۔اس کی رائے ہے کہ چونکہ عقلِ فعال خدا کے نور سے نکلتی ہے اس لئے یہ فنا نہیں ہوتی۔اپنے اس نظریے کے حق میں وہ یہ دلیل پیش کرتا ہے کہ جو چیزیں حواس کے ذریعے حاصل کی جاتی ہیں وہ بلاشبہ فنا ہو جاتی ہیں کیونکہ حواس مادّی آلات مثلاً آنکھ، کان اور ناک وغیرہ کے ذریعے کام کرتے ہیں جو فانی ہیں مگر عقلِ فعال کسی مادی

واسطے کی محتاج نہیں ہوتی اس لئے یہ لافانی ہے۔

گویا کندی کے نظریے کے مطابق روح کی چار قسمیں ہیں (۱) روح اول جس کی حقیقت دائمی ہے جو عالم روحانیات کی علت اور اصل ہے، بے شک اسے خدا تعالیٰ نے پیدا کیا (۲) دوسری روح وہ ہے جس میں انسانی نفس کا شعور حاصل کرنے کی استعداد موجود ہوتی ہے (۳) تیسری روح عقل کا وہ ملکہ ہے جسے انسان جب چاہے استعمال کر سکتا ہے جس طرح تحریر لکھنے والا تحریر کا ملکہ رکھتا ہے اور جب چاہتا ہے اسے کام میں لاتا ہے (۴) چوتھی روح وہ فضیلت ہے جو نفس کے اندر موجود ہے اور اس حقیقت کی طرف جا سکتی ہے جو خارج میں موجود ہے۔ یہ دراصل انسان کا اپنا فعل ہے جس میں وہ آزاد و خود مختار ہے۔

یعقوب الکندی کے بعد دوسرا بڑا مسلمان فلسفی فارابی ہے۔ وہ اپنے پیش رو مسلمان فلسفی الکندی اور یونانی فلسفی ارسطو دونوں سے متاثر نظر آتا ہے۔ فارابی نے روح کے بارے میں اپنی کتاب ''جواہر الحکمۃ'' میں جو نظریہ پیش کیا ہے اس کی رو سے روح کی اصل وہ عقل ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسان کو عطا کی جاتی ہے۔ یہی عقل جو عطیۂ الٰہی ہے اشیاء، افعال اور اقوال کی صحت و درستی کو جانچتی ہے۔ ان میں سے صحیح امور کو قبول کرتی ہے اور غلط امور کو رد کر دیتی ہے۔ یہ قوت انسان کی پوشیدہ صلاحیتوں کو حرکت دیتی ہے اور انہیں عمل پر مائل کرتی ہے۔ یہ قوت خالص وجدانی ہوتی ہے جس کا مادیت سے کوئی تعلق نہیں اس لئے لافانی ہوتی ہے۔

فارابی کے نظریۂ روح کی متعدد حکماء نے متعدد تشریحیں کیں۔ ایک تشریح کے مطابق فارابی کی رائے میں نفس جسم کے وجود کو کمال عطا کرتا ہے مگر جو نفس کو کمال عطا کرنے والی چیز ذہن یا عقل ہے۔ یہی عقل جس کا دوسرا نام روح ہے حقیقی انسان ہے۔ بچہ کے نفس میں ذہن یا عقل کی قوت پیدائشی طور پر موجود ہوتی ہے مگر یہ قوت حرکت میں اس وقت آتی ہے جب بچہ میں سمجھ آ جاتی ہے اور حواس کے ذریعے جسمانی صورتیں بچے کے تجربے اور مشاہدے میں آتی ہیں لیکن ان تجربہ کا حقیقت بن جانا مجرد انسانی ذہن کا کام [illegible] ہے جس سے اس کا وقوع ہوتا ہے۔ فارابی کے نظریہ [illegible]

نچلے آسمان پر واقع قمر کی روح سے خارج ہوتی ہے (یعنی انسان کی روح چاند کے اثرات کے تحت ہوتی ہے) گویا قوتِ علم ایک بالائی عطیہ ہے۔ یہ قوت انسان کی ذہنی کوشش یا ذاتی اکتساب سے حاصل نہیں ہوتی ہے۔

مسلمان دانشوروں میں بوعلی سینا ہمہ جہت شخصیت کا حامل دانشور تھا۔ وہ بیک وقت اتنا بڑا طبیب، ریاضی داں، ماہر علم الافلاک، سائنس داں اور فلسفی غرض اتنے علوم کا ماہر تھا کہ مشرق و مغرب میں اس پایے کا دانشور کم ہی پیدا ہوا ہوگا۔ ابن سینا نے اپنی کتاب ''نجات'' میں روح پر تفصیلی بحث کی ہے۔ وہ روح کو مختلف درجات میں تقسیم کرتا ہے اور اس کا آغاز نباتات سے کرتا ہے۔ اس کے نظریئے کے مطابق نباتات میں روح کا عمل غذائیت، پیدائش اور افزائش کی صورت میں رونما ہوتا ہے۔ یہ روح کی ادنیٰ ترین قسم ہے۔ پھر روح کا دوسرا درجہ وہ ہے جب یہ حیوانات میں داخل ہوتی ہے۔ حیواناتی روح میں نباتاتی قوتوں کے علاوہ کچھ اور قوتیں بھی ہوتی ہیں جن سے نباتات محروم ہوتے ہیں، یہ قوتیں حیوانات کو نباتات سے ممتاز کرتی ہیں۔ اس کے بعد روح کا تیسرا درجہ آتا ہے، یہ اس کا سب سے اعلیٰ مقام ہے۔ اس درجے میں نباتاتی اور حیواناتی قوتوں کے علاوہ روح میں ایک اور قوت بھی شامل ہو جاتی ہے اس قوت کو ابن سینا ''نفسِ ناطقہ'' سے موسوم کرتا ہے۔ انسانی روح کی یہ سب سے بڑی قوت ہے جو حواس ظاہری کے واسطے کے بغیر اشیاء اور کیفیات کا ادراک کرتی ہے۔ ابن سینا کہتا ہے کہ ''روح چونکہ خود جسم کو حرکت نہیں دے سکتی لہذا ایک نفس کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ جسم پر تصرف کرے بالآخر عقلِ فعال کا ظہور ہوتا ہے۔ نفس ناطقہ جو اپنے محکوم (یعنی جسم) پر حکومت کرتا ہے درحقیقت وہی اصل انسان ہے۔ انسان کا بدن اور سارا عالمِ محسوسات نفس کی تعلیم گاہ ہے جس میں نفس کی تربیت ہوتی ہے لیکن موت کے بعد جب بدن ہمیشہ کے لئے فنا ہو جاتا ہے تو نفس باقی رہتا ہے اور روح بالا کے ساتھ اس کا کم وبیش تعلق رہتا ہے''۔ جو مرتبہ نفس نے دنیوی حیات میں حاصل کیا اس کے مطابق آخرت میں اس پر عذاب یا سکون و رحمت کے اثرات ظاہر ہوں گے۔ [illegible] روح کی دو قسمیں بیان کرتا ہے ایک عقلی روح اور دوسری غیر عقلی روح جو [illegible] اور

سیاروں میں پائی جاتی ہے (اس دوسری روح کا بیان ہمارے موضوع سے خارج ہے)۔

ابن سینا کے بعد ابن مسکویہؒ وہ عظیم مسلمان فلسفی ہے جس نے افلاطون اور ارسطو کے فلسفے کا باریک بینی سے مطالعہ کیا اور ان پر نہایت مفید اضافے کئے اور روح کی حقیقت دریافت کرنے کے لئے نئے نئے زاویے اختیار کئے۔ بلاشبہ وہ غیر معمولی ذہین اور نکتہ رس فلسفی اور بہت بڑا مفکر و محقق تھا۔ علامہ ابن مسکویہؒ روح کی حقیقت معلوم کرنے کے لئے بڑے حکیمانہ اور منطقی طرزِ استدلال سے کام لیتے ہیں۔ وہ اپنے پیش رو فلاسفہ کے نظریات پر کھل کر بحث کرتے ہیں اور ثابت کرتے ہیں کہ روح لافانی ضرور ہے مگر یہ روح جسم کے کسی اندرونی عمل کے نتیجے میں پیدا نہیں ہوتی۔ اس موضوع پر وہ اپنی کتاب ''الفوز الاصغر'' میں بحث کرتے ہوئے روح کو حواس سے بلند اور ایک مستقل قوت قرار دیتے ہیں۔ علامہ ابن مسکویہؒ کے دلائل کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر روح حواس کا نام ہے تو اسے حواس کے عمل کے ساتھ ضعیف یا قوی ہونا چاہئے یعنی جب حواس کسی چیز کا ادراک کرتے ہوئے تھکاوٹ محسوس کریں تو روح کو بھی تھک جانا چاہیے مگر ایسا نہیں ہوتا۔ کوئی چیز دیکھ کر یا کوئی بات سن کر جب حواس پر بے بسی کی کیفیت طاری ہوتی ہے تو روح بدستور توانا ہوتی ہے اور اس میں کوئی کمزوری محسوس نہیں ہوتی۔ انسانی جسم کے ساتھ جب حواس بھی کمزور ہو جاتے ہیں مثلاً بینائی یا سماعت کی طاقتیں جواب دے دیتی ہیں تو روح کی قوت میں کوئی کمزوری رونما نہیں ہوتی بلکہ جیسے جیسے عمر میں اضافہ ہوتا ہے انسانی فکر میں اتنی ہی پختگی اور بصیرت پیدا ہوتی چلی جاتی ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ روح حواس سے بالکل ایک الگ اور جداگانہ قوت ہے۔

اگر روح حواس کے عمل کے نتیجے میں پیدا ہوتی تو یہ حواس کے انتشار کے ساتھ ہی منتشر ہو جاتی مگر ایسا نہیں ہوتا۔ علامہ ابن مسکویہؒ روح کے حواس سے الگ اور ایک مستقل وجود ہونے کے بارے میں سب سے وزنی دلیل یہ پیش کرتے ہیں کہ اگر روح حواس کے تابع ہے تو بعض اوقات حواس اپنے افعال میں ایک غلط فیصلہ کرتے ہیں مثلاً آنکھ ایک چیز کو دور سے دیکھ کر فیصلہ کرتی ہے کہ یہ سیاہ رنگ کی ہے مگر درحقیقت وہ سبز یا نیلی ہوتی ہے۔ آخر وہ کون سی قوت ہے جو حواس کے اس غلط فیصلے سے انسان کو مطلع کرتی ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ کوئی

اور طاقت ہے جو حواس سے بالا ہے وہی طاقت روح ہے۔ اس طاقت کو علامہ ابن مسکویہؒ عقل سے تعبیر کرتے ہیں۔ جب یہ ثابت ہو گیا کہ روح حواس سے بالاتر طاقت کا نام ہے جو حواس کی تابع نہیں تو یہ بھی ثابت ہو گیا کہ روح لافانی ہے کیونکہ حواس آنکھ، کان، ناک اور قوت لمس (چھونے کی قوت) کا نام ہے اور یہ سب اعضا جن سے ہم دیکھتے، سنتے، سونگھتے اور چھوتے ہیں جسمانی اعضا ہیں اور فنا ہو جائیں گے جبکہ روح حواس سے بالا قوت ہے اس لئے یہ فنا نہیں ہو سکتی۔ علامہ ابن مسکویہؒ بھی روح کو ایک ایسی طاقت قرار دیتے ہیں جو انسان کو خدا کی طرف سے باہر سے عطا کی جاتی ہے۔(۱)

علامہ ابن مسکویہؒ کے بعد عالم اسلام نے ایک ایسی ہستی کو جنم دیا جو بیک وقت فلسفۂ یونان اور علوم اسلام دونوں پر غیر معمولی دسترس رکھتا تھا۔ یہ وہ ہستی ہے جسے تاریخ امام غزالیؒ کے محترم اور صاحبِ عظمت نام سے یاد کرتی ہے۔ حضرت امامؒ عجیب و غریب صلاحیتیں اور حیرت انگیز ذہنی و فکری طاقتیں لے کر اس خاکدانِ عالم میں آئے تھے۔ انہوں نے علم و فکر کے وہ چراغ روشن کئے جن کے سامنے ہند، یونان اور اسکندریہ کے علوم عقلیہ کے سارے چراغوں کی روشنی ماند پڑ گئی۔ امام غزالیؒ نے روح پر ایک مستقل رسالہ تصنیف کیا جس میں آپؒ نے روح کی حقیقت اور اس کے درجات پر بڑی بصیرت افروز بحث کی۔ حضرت امام غزالیؒ نے روح کے بارے میں جو نظریات پیش کئے ان کا خلاصہ یہ ہے کہ روح نہ مادہ ہے اور نہ اس کا ان خواص سے کوئی تعلق ہے جو مادہ کے اندر موجود ہوتے ہیں۔ یہ ایک ایسی قوت ہے جو حقائق کا ادراک رکھتی ہے اور اپنے رب کو شناخت کرتی ہے یعنی ہمارا ہر ارادہ اور فعل روح کے تابع ہوتا ہے۔ امام غزالیؒ عقل کو روح سے مختلف طاقت قرار دیتے ہیں کیونکہ عقل دماغ کے فعل کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہے اور دماغ مادی چیز ہے جبکہ روح غیر مادی۔ امام غزالیؒ پہلے مسلمان مفکر ہیں جو روح کے باہر سے جسم میں داخل ہونے کے قائل نہیں۔ ان کے اس نظریہ پر ہم آئندہ صفحات میں گفتگو کریں گے۔

امام غزالیؒ کے بعد ابنِ باجہ وہ مسلمان فلسفی ہے جس نے عقل اور روح پر فکر انگیز بحث کی۔ اس نے اپنی تصنیف ''تدبیر المؤحد'' میں اس موضوع پر جو عقلی دلائل دیئے ہیں ان

سے ابن رشد نے بھی استفادہ کیا ہے۔ ابنِ باجہ روح کو دو قسموں میں منقسم کرتا ہے ایک روحِ انسانی اور دوسری روحِ حیوانی۔ وہ کہتا ہے کہ حیوانوں سے جو افعال سرزد ہوتے ہیں اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ وہ عقلِ فعال سے محروم ہوتے ہیں۔ انسان سے حیوانی فعل اس لئے سرزد نہیں ہوتے کہ اس میں ایک ایسی طاقت ہے جو اس کی راہنمائی کرتی ہے اور اس کی سیرت اور اخلاق کی تعمیر میں مدد دیتی ہے۔ یہی روح ہے جسے ابن باجہ عقل مجرد سے تعبیر کرتا ہے۔ وہ انسان میں دو قوتوں کا نظریہ پیش کرتا ہے۔ ایک عقل جو ہر انسان میں پیدائشی طور پر موجود ہوتی ہے۔ دوسری عقلِ فعال جو باہر سے آتی ہے۔ جب یہ دونوں عقلیں باہم مل جاتی ہیں یعنی روح عقل سے متصل ہو جاتی ہے تو انسان میں وہ اوصاف پیدا ہو جاتے ہیں جو اسے ابدی زندگی کے راستے کی طرف گامزن کر دیتے ہیں۔ ابن باجہ کہتا ہے کہ انسان کی پیدائشی روح اسے برائی کی طرف لے جاتی ہے لیکن روحِ فعال جو اس میں باہر سے داخل ہوتی ہے اس کی پیدائشی روح پر غالب آ جانے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

ابن باجہ کے بعد ابن رشد وہ منفرد فلسفی ہے جس نے فلسفے کی تعلیم اور اس کی ترویج کے حق میں بڑی موثر آواز بلند کی اور اُن علماء کی شدید مخالفت کی جو فلسفے کی تعلیم کو کفر قرار دیتے تھے۔ ابنِ رشد نے کہا کہ فلسفہ پڑھنا اور اشیاء کی حقیقت معلوم کرنے کے لئے غور و فکر اور تلاش و تحقیق کرنا ہرگز خلافِ اسلام نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ خود انسانوں کو دعوت دیتا ہے کہ وہ حقائق کا سراغ لگائیں۔ ابن رُشد کہتا ہے کہ جو لوگ فلسفے کو خلافِ اسلام قرار دیتے ہیں انہیں ڈر ہے کہ اگر فلسفہ کی تعلیم عام ہو گئی تو کہیں ان کے ناقص علم کا پردہ چاک نہ ہو جائے۔ اپنی کتاب ''فصل المقال'' میں ابنِ رُشد نے روح کے مسئلے پر بحث کرتے ہوئے بعض ایسے اسرار و رموز بیان کئے ہیں جن میں وہ منفرد ہے۔ مثلاً وہ کہتا ہے کہ روح دراصل ایک ہے جو اس سارے عالم میں جاری و ساری ہے۔ ہم میں سے ہر شخص کے جسم میں جو روح موجود ہوتی ہے وہ اسی روح کلی کا ایک جزو ہے۔ یہ ہمارے جسم میں ایک مقررہ مدت تک رہتی ہے اور مدت مقررہ ختم ہونے کے بعد یہ پھر اپنی اصل کی طرف واپس چلی جاتی ہے۔ ابنِ رُشد کہتا ہے کہ ہمارے دماغ اور اعصاب کی حرکات ہمارے جسم کے اندرونی عمل کا نتیجہ نہیں

بلکہ ایک بیرونی قوت کے اثر انداز ہونے سے دماغ اور اعصاب سے ان کے مخصوص افعال سرزد ہوتے ہیں اور یہ بیرونی طاقت عقل فعال یا روح ہے۔(۲)

تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو: ☆

روح کی بقا کا نظریہ

ہم نے سطور بالا میں روح کی حقیقت کے بارے میں ہندی، یونانی اور مسلمان فلسفیوں اور مفکروں کے نظریات نہایت اختصار سے پیش کر دیئے ہیں اور ایسی اصطلاحوں کے استعمال سے ممکن حد تک گریز کیا ہے جو خالص فلسفیانہ ہیں، اسی طرح ادق الفاظ اور پرپیچ بحثوں سے بھی دامن بچایا ہے جو عام لوگوں کی سمجھ سے بالا ہوتے ہیں اور ذہنوں کو اُلجھا دیتے ہیں۔ان نظریات کی روشنی میں فلسفیوں کے چار گروہ سامنے آتے ہیں۔ایک وہ گروہ جو روح کو غیر فانی تسلیم کرتا ہے، اس کے مخلوق ہونے کا قائل ہے اور اس کا نظریہ ہے کہ موت کے بعد روحیں باقی رکھی جاتی ہیں۔قیامت کے دن ان سے ان کے افعال و اعمال کے بارے میں باز پرس ہوگی۔دوسرا وہ گروہ جو روح کو لافانی تو تسلیم کرتا ہے مگر اس کے عالمِ بالا کی طرف واپس جانے کا قائل نہیں بلکہ اس کا نظریہ ہے کہ اپنے اعمال کے مطابق روح ایک جسم سے دوسرے جسم میں منتقل ہوتی رہتی ہے۔تیسرا وہ گروہ جو روح کو خدا کی تخلیق قرار نہیں دیتا بلکہ اس کے خیال میں روح ازلی ہے یعنی خدا کی طرح ہمیشہ سے ہے۔چوتھا گروہ ان فلسفیوں کا ہے جو روح کو ایک مستقل وجود تو تسلیم کرتے ہیں مگر ساتھ ہی یہ نظریہ پیش کرتے ہیں کہ روح جب خدا سے رابطہ قائم کرتی ہے تو خدا کے وجود میں حرکت پیدا ہوتی ہے اور اشیائے عالم وجود میں آتی ہیں۔

---

(1) The History of Philosophy in Islam by Dr T.J. De Boer. ☆

(۲) فلسفۂ اسلام از پروفیسر ڈی اوبری۔مترجمہ احسان احمد بی۔اے (علیگ)۔

(۳) ''مسائلِ غامضہ''۔(امام غزالیؒ)

(۴) فصل المقال فی مابین الشریعت والحکمتہ من الاتصال از علامہ ابن رُشد۔

(۵) تاریخ التمدن الاسلامی جلد نمبر ۳ از علامہ جرجی زیدان۔

ان میں سے جو گروہ روح کو لافانی اور خدا کی تخلیق قرار دیتا ہے اور جس کا نظریہ ہے کہ انسانی جسم پر موت وارد ہونے کے بعد روح عالم بالا کی طرف چلی جاتی ہے، یہی گروہ عقلی اور فکری لحاظ سے راست رو ہے۔ اسلام یہی نظریہ پیش کرتا ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ قرآن حکیم میں فرماتا ہے:۔

الیہ مرجعکم جمیعاً الخ ''تم سب (مرنے کے بعد) اللہ ہی کے

(سورہ یونس آیت نمبر ۴) پاس جاؤ گے۔ اللہ نے اس کا وعدہ کر رکھا ہے۔ بے شک وہی پہلی بار پیدا کرے گا تاکہ جو لوگ ایمان لائے اور نیک اعمال سرانجام دیئے انہیں انصاف کے ساتھ (پوری پوری) جزا دے اور جن لوگوں نے کفر کیا ان کے لئے آخرت میں کھولتا ہوا پانی اور دردناک عذاب ہوگا''۔

روح کی بقا اور اس کے اللہ تعالیٰ کی طرف واپس جانے کے بارے میں قرآن حکیم نے جو نظریہ بیان کیا ہے اس کی بنیاد ٹھوس دلائل پر ہے۔ قرآن حکیم پہلی دلیل یہ دیتا ہے کہ انسان کو پہلی بار خدا نے ہی پیدا کیا، جو ہستی انسان کو ایک بار پیدا کرنے پر قادر ہے وہ اسے دوبارہ بھی پیدا کر سکتی ہے۔ دوبارہ پیدا کرنے کی وجہ یہ بیان فرماتا ہے کہ جن لوگوں نے اس دنیا میں نیک اعمال سرانجام دیئے خدا اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے انہیں ان کے ایمان اور اعمال کا بدلہ دیا جائے اور جن لوگوں نے نافرمانی و سرکشی کے کام کئے، خدا اور اس کے رسولوں کا انکار کیا اور زمین پر فساد پھیلایا انہیں ان کی بداعمالیوں کی سزا دی جائے۔ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ جسم کے ساتھ روح بھی فنا ہو جاتی ہے اور عالم آخرت کا وجود محض وہم ہے تو یہ عقلی طور پر بھی درست نہیں کیونکہ ہم اس دنیا میں بھی دیکھتے ہیں کہ ہر ملک میں کچھ قوانین نافذ ہیں جن کے تحت مجرموں کو ان کے جرائم کی سزا دی جاتی ہے اور قانون کی اطاعت کرنے والے نہ صرف سزا سے محفوظ رہتے ہیں بلکہ انہیں انعامات بھی دیئے جاتے ہیں۔ اگر ہم روح کا مستقل وجود تسلیم نہ کریں اور یہ نہ مانیں کہ عالم آخرت میں روحوں کو دوبارہ جسم دے کر ان سے ان کے اعمال کے بارے میں باز پرس کی جائے گی تو سزا و جزا کا سارا نظام ہی ختم ہو جاتا ہے کیونکہ اس دنیا میں بے شمار بادشاہ، امراء، حکام اور بدکردار لوگ

پیدا ہوتے ہیں جو بڑے گھناؤنے جرم کرتے ہیں مگر اپنی دنیاوی طاقت یا اثر ورسوخ کی وجہ سے سزا سے بچ نکلتے ہیں اور بہ ظاہر بڑی عیش و آرام کی زندگی گزار کر طبعی موت سے ہمکنار ہو جاتے ہیں۔ دوسری طرف بڑے نیک نفس، پاکیزہ کردار اور صاحبِ ایمان لوگ بدترین مظالم کا نشانہ بن کر اذیت ناک زندگی گزارتے ہیں اور حق و انصاف کی راہ میں ذبح کر دیئے جاتے ہیں۔ اگر جسم پر موت وارد ہونے کے بعد روحیں بھی فنا ہو جاتی ہیں اور انہیں نہ کوئی جزا ملتی ہے نہ سزا کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو یہ بہت بڑا ظلم اور ناانصافی ہے کیونکہ جن لوگوں نے دنیا میں ظلم و نافرمانی اور عیش و آرام کی زندگی گزاری اور عالم آخرت کی سزا سے بھی بچ گئے وہ تو سراسر فائدے میں رہے اور جن لوگوں نے حق و انصاف اور رضائے الٰہی کی خاطر دنیا میں ہوش رُبا مظالم برداشت کئے اور نہایت اذیت ناک زندگی گزار کر فوت ہو گئے اس کے نتیجے میں انہیں کوئی راحت کوئی آرام اور کوئی انعام نہ ملا وہ سراسر نقصان میں رہے۔ یہ نظریہ دنیوی قوانین کے لحاظ سے بھی باطل ہے اور حق و انصاف کے بھی خلاف ہے اور سب سے بڑی بات یہ کہ انسان کو گناہ پر دلیر کر دیتا ہے کیونکہ جب اسے یقین ہو جائے کہ اس دنیا کی زندگی کے بعد اور کوئی عالم نہیں جہاں اس سے اس کے اعمال کی باز پرس کی جائے گی اور اس کی بداعمالیوں کی سخت ترین سزا دی جائے گی تو وہ تمام اخلاقی حدود کو توڑ کر نہایت دلیری سے بڑے سے بڑے گناہ کا ارتکاب کرے گا اس لئے قرآن حکیم اس نظریے کی تردید کرتا ہے اور روح کی بقا اور عالم آخرت میں ارواح کو نیا جسم عطا کئے جانے کی بشارت دے کر اعلان فرماتا ہے کہ جو لوگ اس دنیا میں سزا سے بچ نکلتے ہیں انہیں عالم آخرت میں دردناک عذاب دیا جائے گا اور جن لوگوں نے اس دنیا میں حق و انصاف کی خاطر اذیتیں برداشت کیں ان کی قربانیاں رائیگاں نہیں جائیں گی بلکہ انہیں راحت و آرام کی زندگی عطا کی جائے گی اور ایسی ایسی نعمتوں سے سرفراز کیا جائے گا جو انسان کے تصور میں بھی نہیں آسکتیں۔ اس طرح بقائے روح اور عالم آخرت کا تصور پیش کر کے اسلام معاشرے کو امن و راحت کا گہوارہ بنا دیتا ہے اور بنی نوع انسان کو شر سے روکتا اور خیر پر آمادہ کرتا ہے کہ تخلیقِ کائنات اور پیدائشِ آدم کا یہی مقصدِ اصلی ہے۔ پس جن فلسفیوں نے

روح کولافانی تسلیم کیا اور عالم آخرت میں ہر انسان کی روح کو اس کے اعمال کے مطابق جزا وسزا کا مستحق قرار دیا انہوں نے حقیقت کو پالیا چنانچہ مشہور فلسفی فارابی نے ''الجمع بین الرائین'' میں ارسطو کا ایک خط درج کیا ہے جو اس نے اپنے شاگرد سکندر اعظم کے انتقال کے موقع پر اس کی والدہ کے نام لکھا تھا۔ اس خط میں ارسطو سکندر کی والدہ کو تسلی دیتا اور صبر کی تلقین کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ ''دیکھئے آپ ایسے کام سے باز رہیں جس کی وجہ سے روزِ آخرت میں آپ سکندر کی ملاقات سے محروم رہ جائیں''۔ ''ایسے کام'' سے ارسطو کی مراد غالباً بین کرنا، سر کے بال نوچنا یا سینہ کوبی کرنا تھی۔ بہر حال اس خط سے ثابت ہوجاتا ہے کہ مرنے کے بعد روح کا باقی رہنا اور قیامت کے دن ایک اور جسم عطا ہونا ارسطو جیسے عظیم فلسفی کے نزدیک بھی ایسی حقیقت ہے جسے عقل بھی تسلیم کرتی ہے۔ یہ قرآنِ حکیم کا کمال اور سب سے بڑی خصوصیت ہے کہ وہ کوئی ایسا نظریہ پیش نہیں کرتا جو عقل انسانی کے خلاف ہو۔

روح کے ازلی ہونے کا نظریہ

فلسفیوں کا دوسرا وہ گروہ ہے جو روح کو ازلی قرار دیتا ہے اور اُس کی ابدی نجات تسلیم نہیں کرتا بلکہ اس کے خیال میں ایک شخص کی موت کے بعد اس کی روح دوسرے انسان کے جسم میں داخل ہوجاتی ہے۔ کبھی روحیں انسانی جسم سے نکل کر حیوانوں کے جسم میں چلی جاتی ہیں۔ اسی طرح یہ سلسلہ ازل سے جاری ہے اور ابد تک جاری رہے گا۔ اس نظریے کے بانی ہندو بلکہ ویدانی مفکر ہیں اور انہی سے متاثر ہوکر بعض یونانی فلاسفہ نے بھی یہ نظریہ قبول کرلیا۔ اس نظریہ کی بنیاد یہ عقیدہ ہے کہ مادہ اور روح دونوں ازلی ہیں۔ انہیں خدا نے پیدا نہیں کیا البتہ خدا روحوں کو مختلف قسم کے اچھے اور برے جسموں میں بھیج کر ان کے اعمال کی سزا دیتا رہتا ہے۔ یہ نظریہ درست تسلیم کرلینے کی صورت میں بڑی قباحتیں پیدا ہوتی ہیں۔ سب سے پہلی قباحت تو یہ ہے کہ جب خدا روح کا خالق نہیں تو وہ روح کی صفات اور اس کی حقیقت سے بھی ناواقف ثابت ہوگا، اس طرح اس کا علم ناقص ٹھہرے گا۔ دوسری قباحت یہ ہے کہ اس طرح کی روح پر اللہ تعالیٰ کی کوئی برتری ثابت نہیں ہوتی کیونکہ جب اس نے

روح کو پیدا ہی نہیں کیا بلکہ ارواح خدا کی طرح ازلی ہیں اور ابدی بھی تو خدا کو ان پر کیا فضیلت حاصل ہو گی؟ تیسری قباحت یہ ہے کہ جو روحیں پیدا ہو چکیں اگر وہی ایک جسم سے دوسرے جسم میں داخل ہوتی رہتی ہیں تو روحوں کی تعداد محدود ثابت ہو گی اور خدا مجبور ہے کہ انہی روحوں سے اپنا کام چلائے جو اتفاقاً اس کے ہاتھ لگ گئیں۔ اگر کسی وقت یہ روحیں اس کے قبضے سے نکل گئیں تو خدا کی ساری خدائی آنِ واحد میں ختم ہو جائے گی اور وہ ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ جائے گا کیونکہ جن فلسفیوں نے یہ نظریہ پیش کیا ان کی رائے کے مطابق خدا روح کا خالق نہیں اس لئے وہ نئی روحیں پیدا نہیں کر سکتا۔ اس صورت میں یہ کارخانۂ عالم ٹھپ ہو کر رہ جائے گا۔ آخری اور سب سے بڑی قباحت جو ارواح کے محدود، غیر مخلوق اور ایک جسم سے دوسرے جسم میں داخل ہونے سے پیدا ہوتی ہے، بڑی سنگین نوعیت کی ہے۔

فرض کیجئے کہ ایک عورت فوت ہو جاتی ہے اور اس کی روح ایک لڑکی کے جسم میں داخل ہو جاتی ہے اور اسی عورت کے بیٹے کی وفات کے بعد اس کی روح کسی دوسرے لڑکے کے جسم میں قرار پکڑتی ہے۔ بالغ ہونے پر دونوں کی شادی کر دی جاتی ہے کیونکہ دونوں کے سرپرستوں میں سے کسے معلوم ہے کہ ان دونوں جسموں میں جو روحیں مقیم ہیں ماضی میں ان کے درمیان کیا رشتہ تھا؟ اس طرح ماں اور بیٹے میاں بیوی بن جاتے ہیں۔ یہ کس قدر گھناؤنا نتیجہ ہے جو روحوں کے ایک جسم سے دوسرے جسم میں داخل ہونے سے پیدا ہوتا ہے اس کے مقابلے میں اسلام ہے جو نہایت وضاحت سے یہ نظریہ پیش کرتا ہے کہ موت کے بعد روحیں انسانی جسموں سے نکل کر عالم ارواح میں چلی جاتی ہیں اور خدا انہیں دوبارہ اس دنیا میں واپس نہیں بھیجتا نہ وہ گدھوں، کتوں، سوروں اور بندروں کے جسم میں داخل ہوتی ہیں چنانچہ اللہ تعالیٰ قرآن حکیم میں ارشاد فرماتا ہے:

حتی اذا جاء احدھم الموت قال رب ارجعون ○ لعلی اعمل صالحا فیما ترکت کلاط انھا کلمۃ ھو قائلھا ط	''یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی کے سر پر موت آ کھڑی ہوتی ہے (تو وہ) اس وقت کہتا ہے کہ اے میرے رب مجھے دنیا

ومن ورائهم برزخ الی یوم یبعثون o (سورہ المومنون آیت نمبر۹۹'۱۰۰)

میں پھر واپس بھیج دیجئے تا کہ میں واپس جا کر نیک کام کروں۔ ہر گز (ایسا) نہیں (ہوگا) یہ ان لوگوں کی باتیں ہی باتیں ہیں جنہیں وہ دہرائے جاتے ہیں اور ان کے درمیان ایک پردہ ہے قیامت کے دن تک"۔

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نہایت صراحت سے بیان فرماتا ہے کہ جب کوئی انسان مرجاتا ہے تو اس کی روح اس دنیا میں واپس نہیں آتی۔

اسلام روح کے بارے میں جو تصور ہمیں عطا فرماتا ہے وہ ویدانی، چینی اور یونانی فلسفیوں کی قیاسی اور ناپختہ باتوں سے مبرا ہے۔ مثال کے طور پر ویدانی فلسفی کپیلا روح کے مستقل وجود کا تو قائل ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ یہ غیر حقیقی نظریہ بھی پیش کرتا ہے کہ جب روح خدا سے اتصال پیدا کرتی ہے تو اس کے وجود میں حرکت پیدا ہوتی ہے اور اس کے نتیجے میں اشیائے عالم وجود میں آتی ہیں۔ اگر اس نظریے کو درست تسلیم کرلیا جائے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ اس کائنات کی تخلیق میں خدا اور روح دونوں برابر کے شریک ہیں۔ دونوں کے ملنے سے اشیائے عالم پیدا ہوتی ہیں۔ دوسرے الفاظ میں خدا روح کا محتاج ہے۔ جب تک روح اس سے اتصال پیدا نہ کرے اس وقت تک خدا کے وجود میں حرکت پیدا نہیں ہو سکتی اور نہ اشیائے عالم ظہور میں آ سکتی ہیں۔ گویا خدا ایک بے روح جسم کی طرح بے حس و حرکت کہیں پڑا رہتا ہے۔ جب روح اس کے پاس جا کر اسے چھوتی یا اس سے ملتی ہے تب وہ جی اٹھتا ہے اور پھر یہ کارخانۂ عالم وجود میں آتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ نظریہ کسی طرح قابل قبول نہیں اور معقولیت سے یکسر محروم ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان فلسفیوں کو نہ خدا کی ہستی کا عرفان حاصل تھا اور نہ یہ روح کی حقیقت سے واقف تھے۔ حیرت ہے کہ ایک طرف تو یہ فلسفی روح کو جسم میں قید کر دیتے ہیں اور یہ قید لامتناہی ہے یعنی روح ایک جسم سے دوسرے جسم میں منتقل ہوتی رہتی ہے کبھی خبیث جسم میں کبھی پاک جسم میں۔ کبھی ادنیٰ درجے

کے قابلِ نفرت حیوانوں میں اور دوسری طرف روح کو اتنا بلند درجہ دیتے ہیں کہ جب تک وہ خدا سے اتصال پیدا نہ کرے اس وقت تک خدا کے وجود میں حرکت پیدا نہیں ہوتی اور نہ اشیائے عالم وجود میں آتی ہیں۔ظاہر ہے کہ روح کے بارے میں یہ نظریات نہایت سطحی اور غلط سوچ کا نتیجہ ہیں۔اسلام ایسے ناقص خدا کا تصور پیش نہیں کرتا۔اسلام کا خدا کسی روح کے ذریعے حرکت میں آنے کا محتاج نہیں ہے بلکہ وہ تو خود روحوں کا خالق ہے اور بے شمار ارواح پیدا کر سکتا ہے بلکہ پیدا کرتا رہتا ہے چنانچہ قرآن حکیم نے صرف دو لفظ استعمال کر کے اس غلط نظریے کی تردید کر دی چنانچہ فرمایا ''اللہ الصمد'' (سورہ اخلاص آیت نمبر ۲) یعنی ''اللہ تعالیٰ ہر چیز سے بے نیاز ہے اور وہ کسی کا محتاج نہیں''۔نہ روح کا نہ مادہ کا نہ کسی کی حرکت یا سکون کا بلکہ یہ سب اس کے محتاج ہیں۔''صمد'' کے یہی معنی ہیں۔پھر فرمایا کہ ''لم یلد ولم یولد'' (سورۂ اخلاص آیت نمبر ۳) اسے کسی نے پیدا نہیں کیا بلکہ اُس نے ہر چیز کو پیدا کیا، خواہ وہ مادہ ہو یا روح یا روح اور مادہ سے ترکیب پانے والی اشیا۔ان کی پیدائش میں وہ تنہا ہے اسے کسی سہارے کی مطلق ضرورت نہیں۔کتنا بلند ہے خدا کے بارے میں اسلام کا تصور جو انسان کے دل میں اپنے خالق و مالک کی حقیقی عظمت پیدا کرتا ہے جس سے مسحور ہو کر اس کا دل آستانۂ الٰہی پر بے اختیار جھک جاتا ہے۔

روح کے مادّی ہونے کا نظریہ

فلسفیوں کا ایک وہ گروہ ہے جو روح کو مادی تسلیم کرتا ہے۔یونان کا مشہور فلسفی ڈیموکریٹس اس نظریے کا بانی تھا۔اس کا خیال ہے کہ روح باریک در باریک آتشیں ذروں سے وجود میں آئی ہے۔ڈیموکریٹس دراصل اپنے استاد ''لیوکی پوس'' (LEUCIPPUS) سے متاثر تھا جس نے ذرات کا نظریہ پیش کیا جسے ڈیموکریٹس کا نظریہ سمجھ لیا گیا۔لیوکی پوس کہتا ہے کہ ہماری کائنات نہایت باریک ذرات سے بنی ہے۔یہ ذرات اتنے چھوٹے ہیں کہ انہیں توڑا نہیں جا سکتا نہ ان کے اجزاء ایک دوسرے سے الگ کئے جا سکتے ہیں۔ڈیموکریٹس نے اپنے استاد کے اس نظریے پر مزید غور و خوض کے بعد یہ نظریہ پیش کیا کہ

اشیاء کے ذائقے مثلاً ترشی اور شیرینی بھی ذروں پر مشتمل ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ترشی باریک اور تین کونوں والے ذروں سے پیدا ہوتی ہے اور شیرینی بڑی قسم کے گولائی نما ذروں سے وجود میں آتی ہے۔ اپنے اس نظریے پر اس نے مزید غور و خوض کیا اور یہ نظریہ پیش کیا کہ اسی طرح روح بھی ذرات سے بنتی ہے جو نہایت باریک ہوتے ہیں اور ان میں آگ کی خاصیت ہوتی ہے۔ یہی غلطی ارسطو سے بھی ہوئی جس نے یہ نظریہ پیش کیا کہ روح وہ اصل ہے جس سے جسم کا مادی ہیولیٰ تیار ہوتا ہے حالانکہ جسم یا اس کا پیکر خالص مادی چیز ہے اور روح غیر مادی۔ ایک غیر مادی چیز سے جس کا جسم ہی نہیں ہوتا ایک مادی اور جسمانی چیز نہیں بن سکتی۔ یہ نظریہ اصول منطق کے بھی خلاف ہے۔ اسی طرح روح کے بارے میں اگر ڈیموکریٹس کا یہ نظریہ تسلیم کر لیا جائے کہ روح باریک در باریک آتشیں ذروں سے وجود میں آئی ہے تو روح مادی شے ثابت ہوتی ہے کیونکہ ذرات چھوٹے ہوں یا بڑے بہر حال مادے کا سب سے چھوٹا حصہ بلکہ اس کی بنیاد ہیں اور ہر مادّہ فنا ہو جاتا ہے اس لئے لازم آئے گا کہ روح بھی جسم کے ساتھ ہی فنا ہو جاتی ہے۔ پھر ڈیموکریٹس اور اس کے استاد ''لیوکی پوس'' کا یہ نظریہ ایٹم ٹوٹ جانے کے بعد باطل ثابت ہو گیا کہ ذرات ناقابلِ تقسیم بھی ہوتے ہیں۔ اس لئے جس رُخ سے دیکھا جائے روح کے بارے میں ان یونانی فلسفیوں کے یہ نظریات ناقابل قبول ہیں۔

بنیادی غلطی

دراصل ہمارے بیشتر فلسفیوں سے ایک بنیادی غلطی ہو گئی کہ انہوں نے جان اور روح کو ایک ہی شے سمجھ لیا اور ان دونوں میں فرق نہ کر سکے حالانکہ جان اور روح دو الگ الگ قوتیں ہیں۔ جان اس قوت کا نام ہے جو جسم کو متحرک رکھتی ہے۔ یہ کہیں باہر سے نہیں آتی بلکہ نطفے کے اندر موجود ہوتی ہے چنانچہ نر اور مادہ کے ملاپ کے وقت نر کا جرثومہ جب مادہ کے رحم میں داخل ہوتا ہے تو وہ متحرک اور جاندار ہوتا ہے۔ رحم میں اس کی پرورش ہوتی ہے مادہ کے جسم سے وہ غذا حاصل کرتا ہے اور مدتِ مقررہ کے بعد جب رحم مادر سے باہر آتا

ہے تو یہ اسی زندہ اور متحرک جرثومے کی ترقی یافتہ اور جسمانی صورت ہوتی ہے جو ابتدا میں رحم میں داخل ہوا تھا۔ یونانی فلسفی ڈیموکریٹس جس روح کو باریک در باریک آتشیں ذروں کا مجموعہ قرار دیتا ہے وہ دراصل زندگی کا ابتدائی جرثومہ تھا جو بہت سے ارتقائی مراحل سے گزر کر اُس موجودہ جرثومے تک پہنچا جو مادہ تولید میں موجود ہوتا ہے یہ جرثومہ ایک نہیں ہوتا بلکہ لاتعداد ہوتے ہیں۔ اس جرثومے کو روح قرار دینا روح سے ناواقفیت کی دلیل ہے۔ اسی طرح جن مفکروں نے یہ نظریہ پیش کیا کہ روح نباتاتی اور حیواناتی دور سے گزر کر انسانی جسم میں داخل ہوئی یعنی نباتات کی روح کمزور ہوتی ہے، حیوانات میں اس سے زیادہ قوی ہوتی ہے اور انسان کی روح سب سے زیادہ توانا ہوتی ہے، ان سے بھی یہی غلطی سرزد ہوئی کہ انہوں نے جان کو روح سمجھ لیا۔ دوسرے الفاظ میں انہوں نے حیات یا زندگی کے ارتقائی عمل کو روح کا ارتقائی عمل قرار دیا لیکن اگر روح سے مراد جان یا زندگی ہے تو یہ نباتات میں بھی پائی جاتی ہے اور حیوانات میں بھی۔ وہ تمام فلسفی جو روح کے لافانی ہونے کے قائل ہیں تسلیم کرتے ہیں کہ ایک ایسی قوت موجود ہے جو نباتات اور حیوانات کو زندہ رکھتی ہے لیکن اگر اس قوت کو روح قرار دیا جائے تو سوال پیدا ہوگا کہ کیا حیوانات کی روح بھی لافانی ہوتی ہے؟ کیا وہ بھی باقی رہے گی اور قیامت کے دن ہاتھی، گھوڑوں، بیل، بھینسوں، شیر چیتوں کی روحیں بھی حساب کتاب کے لئے پیش ہوں گی اور انہیں بھی ان کے اعمال کی جزا سزا دی جائے گی، انہیں بھی جہنم اور جنت میں داخل کیا جائے گا؟ ظاہر ہے کہ کوئی صاحب عقل وفہم اس خیال کو درست قرار نہیں دے گا کیونکہ اعمال کی باز پرس اس مخلوق سے کی جاتی ہے جو باشعور ہو اور برے بھلے میں امتیاز کر سکے مگر حیوانات نہ تو انسانوں کی طرح باشعور ہوتے ہیں نہ ان میں انسانوں جیسی عقل وخرد ہوتی ہے اس لئے اُن سے کسی قسم کے سوال و جواب اور حساب کتاب کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا پس ثابت ہوا کہ ان میں جان تو ہوتی ہے مگر روح نہیں ہوتی۔ اگر یہ کہا جائے کہ ان میں روح تو ہوتی ہے مگر ان کی موت کے ساتھ فنا ہو جاتی ہے تو یہ ایک مفروضہ ہے جس کی کوئی دلیل نہیں بلکہ یہ اس تسلیم شدہ حقیقت کے خلاف ہے کہ روح لافانی ہوتی ہے۔

روح کا قرآنی فلسفہ

اسلام دنیا کا واحد مذہب ہے جس نے روح کا فلسفہ بڑے دلکش اور دل نشیں انداز میں پوری شرح وبسط سے بیان کیا۔ سب سے پہلے تو قرآن حکیم میں اس نظریے کی تردید کی گئی کہ روح سے مراد جان یا زندگی ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

وھوالذی یتوفکم بالیل ویعلم ماجرحتم بالنھار الخ (سورہ الانعام آیت نمبر ٦٠)

''اور وہ (اللہ تعالیٰ ہی ہے) جو رات کو تمہاری روح قبض کر لیتا ہے اور جو کچھ تم دن میں کرتے ہو اُس کو جانتا ہے پھر تم کو بیدار کر دیتا ہے تا کہ تمہاری میعادِ معینہ پوری کر دی جائے پھر تمہیں اسی کی طرف جانا ہے۔''

اس آیت میں اللہ تعالیٰ انسانوں کو مخاطب کر کے فرماتا ہے کہ نیند کی حالت میں تمہاری روح قبض کر لی جاتی ہے۔ اگر یہاں روح سے جان یا قوتِ حیات مراد لی جائے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ نیند کی حالت میں انسان مرجاتا ہے حالانکہ نیند کی حالت میں کوئی انسان موت سے ہمکنار نہیں ہوتا، سویا ہوا ہر شخص زندہ ہوتا ہے، وہ سانس لے رہا ہوتا ہے، کروٹیں بدل رہا ہوتا ہے، اگر اس کے جسم کے کسی حصے میں سوئی بھی چبھو دی جائے تو ہڑ بڑا کر اٹھ بیٹھتا ہے۔ پس اس سے معلوم ہوا کہ یہاں روح قبض کرنے سے مراد جان نکالنا نہیں بلکہ انسان کو شعور اور عمل کی قوت سے محروم کر دینا ہے۔ اس ارشادِ خداوندی سے ثابت ہوتا ہے کہ روح زندگی یا جان کا نام نہیں۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب روح زندگی اور جان بھی نہیں تو یہ کس چیز کا نام ہے۔ روح کی ماہیت اور اس کی حقیقت کے بارے میں اب تک طویل فلسفیانہ بحثیں ہو چکی ہیں اور ہر فلسفی نے اپنے علم وبصیرت کے مطابق اس سوال کا جواب دیا ہے مگر یہ حقیقت اب تک نہ کھل سکی کہ روح کی صحیح تعریف کیا ہے۔ آج سے چودہ سو سال قبل یہی سوال کفار نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کیا تھا جس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ :۔

قل الروح من امر ربی وما او تیتم من العلم الا قلیلا o (سورہ بنی اسرائیل آیت نمبر ۸۵) ''اُن سے کہہ دیجئے کہ روح میرے رب کے امر میں سے ایک امر ہے اور تمہیں اس (امر ربی) کے بارے میں بہت کم علم حاصل ہے''۔

یہاں اللہ تعالیٰ روح کو امرِ ربی قرار دیتا ہے اور حضرت امام غزالیؒ امر ربی کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:۔

''جس چیز کا اندازہ نہ کیا جاسکے اور نہ جس کی مقدار معین کی جاسکے اسے امر ربانی کہتے ہیں۔ پس وہ تمام اشیاء اور فرشتوں اور انسانوں کی ارواح جو حس، خیال، سمت اور حدود مکاں سے خارج ہوں عالم امر میں شامل ہیں اور امر ربی کہلاتی ہیں''۔ (''حقیقت روح انسانی'' ص ۲۰)

پس چونکہ روح بھی ایک ایسی شے ہے جس کا نہ جسم ہے نہ اس کی کوئی سمت ہے اور نہ مستقل طور پر کسی ایک سمت یا مکان (جسم) میں مقیم رہتی ہے اس لئے یہ بھی امر ربی ہے اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ عالمِ امر سے تعلق رکھنے والے معاملات کے بارے میں انسانوں کا علم بہت قلیل ہے یعنی تم روح کی حقیقت معلوم کرنے کی کتنی بھی کوشش کرو مگر یاد رکھو کہ اس کے بارے میں بہت تھوڑا علم حاصل کر سکتے ہو اور اس کا حقیقی علم تمہیں کبھی حاصل نہیں ہو سکتا۔

اللہ تعالیٰ کا یہ خطاب ان کفار سے تھا جن کے دل حقائق کو قبول کرنے کے لئے تیار نہ تھے اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مخالفت اور بغض و عناد نے ان کے ذہنوں کو ماؤف کر دیا تھا۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ روح کی حقیقت ان لوگوں پر بھی ظاہر نہیں ہو سکتی جو راست باز، راست فکر اور راست رو ہیں، جو بصیرت رکھتے ہیں اور جن کے دل اللہ اور اس کے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت سے سرشار ہیں۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ ان کے قلوب پر حقائق منکشف فرماتا ہے۔ خود قرآن حکیم میں روح کی حقیقت کے بارے میں متعدد مقامات پر بڑے لطیف اشارات موجود ہیں جن سے روح کی حقیقت سمجھنے میں بہت مدد ملتی ہے چنانچہ ایک مقام پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ''فاذا سویتہ ونفخت فیہ من

روحی" (سورۃ الحجر آیت نمبر ۲۹) یہ مضمون اذقال ربک للملئکة سے شروع ہوتا ہے اور اس کا ترجمہ یہ ہے کہ "اور وہ وقت یاد کرنے کے قابل ہے جب آپ کے رب نے ملائکہ سے فرمایا کہ میں ایک بشر کو آواز دیتی ہوئی مٹی سے جو سڑے ہوئے گارے کی بنی ہوگی پیدا کرنے والا ہوں سو جب میں اسے مکمل طور پر بنا دوں اور اس میں اپنی روح پھونک دوں تو تم سب اس کی تعظیم کرنا"۔

ہمارے بہت سے مفسرین نے یہاں روح پھونکنے سے جان ڈالنا سمجھ لیا اور اس آیت کے یہی معنی بیان کر دیئے کہ "جب میں آدم میں جان ڈال دوں"۔ اس سے لوگوں میں یہ خیال عام ہو گیا کہ روح جان یا قوتِ حیات کو کہتے ہیں حالانکہ یہ خیال درست نہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ میں روح پھونک کر انہیں زندہ کیا تو اس بے شمار مخلوق کے بارے میں کیا کہا جائے گا جو اس روئے زمین پر پھیلی ہوئی ہے اور لاتعداد حشرات الارض جو زمین کے نیچے زندگی گزارتے ہیں آخر ان میں کس نے روح پھونکی؟ انہیں کس نے زندہ کیا؟ کیونکہ یہاں اللہ تعالیٰ صرف آدم کے بارے میں فرماتا ہے کہ میں اس میں روح پھونکوں گا۔ باقی جاندار مخلوق کے بارے میں وہ یہ نہیں فرماتا کہ میں اس میں بھی روح پھونکوں گا۔ کیا اس سے یہ سمجھا جائے کہ باقی جاندار مخلوق نعوذ باللہ خدا کے حکم سے زندہ نہیں ہوئی؟ اس میں کسی اور نے جان ڈالی؟ حالانکہ اس کائنات میں جو ہمارے علم میں ہے اور اس کے علاوہ جتنی کائناتیں ہیں ان سب میں جس قدر جاندار مخلوق پائی جاتی ہے وہ سب اللہ تعالیٰ ہی کی پیدا کردہ ہے۔ وہ خود ان سب کو زندگی اور رزق دینے کا اعلان فرماتا ہے مگر اس لاتعداد اور بے شمار مخلوق میں سے کسی کے بارے میں یہ نہیں فرماتا کہ اس مخلوق میں اس نے روح بھی پھونکی۔ یہ شرف صرف آدم کے لئے مخصوص ہے۔ پس اس سے ثابت ہوتا ہے کہ روح سے مراد جان یا زندگی نہیں کیونکہ وہ تو ہر جاندار میں پائی جاتی ہے۔ یہاں روح سے مراد کوئی اور طاقت ہے جو صرف حضرتِ آدمؑ اور اُن کی نسل کو عطا کی گئی اور یہ وہی طاقت ہے جسے فلسفے کی اصطلاح میں عقلِ فعال اور نفس ناطقہ کے نام سے موسوم کیا گیا ہے یعنی ایک ایسی طاقت جو عقل و شعور سے بہرہ ور ہوتی ہے، نیکی اور بدی میں امتیاز کرنے کی

صلاحیت رکھتی ہے اور قوتِ فکری و عملی کو استعمال کر کے انسانی جسم سے حسبِ منشا کام لیتی ہے۔ یہ صلاحیت صرف انسان میں پائی جاتی ہے اس لئے اسے ذمہ دار ٹھہرایا گیا۔ اس کی طرف انبیاء بھیجے گئے' اسے خیر وشر کا تصور دیا گیا اور اس کائنات میں تہذیب وتمدن کے ارتقا کی ذمہ داریاں سونپی گئیں چونکہ اسے باشعور' صاحب اختیار اور صاحب ارادہ بنایا گیا اسی لئے اس کی روح کو باقی رکھا گیا تاکہ قیامت کے دن اس سے اس کے اعمال کا حساب لیا جائے۔ باقی مخلوق میں چونکہ عقل وفکر اور شعور آگہی نہیں ہوتا' اس میں روح بھی نہیں ہوتی اس لئے جسمانی موت کے ساتھ ہی وہ فنا ہو جاتی ہے کیونکہ عقل وفکر اور اختیار وارادہ سے محروم ہونے کی وجہ سے اس کے افعال کا محاسبہ بھی نہیں کیا جاسکتا اس لئے اسے باقی نہیں رکھا جاتا۔

پیدائش روح کا قرآنی نظریہ

ہمارے بعض علماء اور مفکر یونانی فلسفیوں سے متاثر تھے اور یونانی فلاسفہ میں سے بعض فلسفی ہندی فلسفیوں سے اثر پذیر ہوئے۔ اس طرح بعض مسلمان علماء اور فلاسفہ نے یہ نظریہ قبول کرلیا کہ ارواح کسی خاص عالم میں مقیم ہیں۔ جب کوئی شخص پیدا ہونے والا ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی روح کو عالم ارواح سے نکال کر دنیا میں بھیج دیتا ہے اور وہ اس شخص کے جسم میں داخل ہو جاتی ہے۔ ایک نظریہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ ساری روحیں تخلیق کر کے حضرت آدمؑ کی پیٹھ میں جمع کردیں۔ پھر انہیں حضرت آدمؑ کی پیٹھ سے نکال لیا اور روزِ ازل ان سے اپنی عبودیت کا اقرار لے کر انہیں پھر حضرت آدمؑ کی پیٹھ میں بھر دیا۔ دوسری روایت کے مطابق ان روحوں کو عالم ارواح میں بھیج دیا۔ یہ حضرات قرآن حکیم کی اس آیت سے استدلال کرتے ہیں:۔

واذاخذ ربک من بنی ادم من ظھورھم ذریتھم واشھدھم علی انفسھم ج الست بربکم ط قالو بلیٰ ج شھدنا ج (سورہ الاعراف آیت نمبر ۱۷۲)

''اور جب آپ کے رب نے اولادِ آدم کی پشت سے ان کی اولاد کو نکالا اور ان سے اقرار لیا کہ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں سب نے جواب دیا کہ کیوں نہیں' ہم سب اس کے گواہ ہیں''۔

بعض مفسر حضرات نے اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ حضرت آدمؑ کو پیدا کر کے جب اللہ تعالیٰ نے ان کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا تو کروڑوں بلکہ لاتعداد روحیں ان کی پیٹھ میں سے کیڑے مکوڑوں اور چیونٹیوں کی طرح نکلنے لگیں۔ ایک بزرگ نے لکھا ہے کہ ''ان کی پیٹھ میں سے جھڑنے لگیں''، اور انہی ارواح سے اللہ تعالیٰ نے اپنے رب ہونے کا اقرار لیا لیکن یہ خیال داستان طرازی سے زیادہ اور کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ امام المفسرین حضرت امام رازیؒ اپنی تفسیر میں یہ روایت درج کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ:۔

''صاحبِ بصیرت اور اہل علم کی رائے میں اس آیت کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت میں ایسا شعور ودیعت فرمادیا کہ وہ اپنے خالق و مالک کی ہستی کا اقرار کرتا ہے''۔ (التفسیر الکبیر سورہ الاعراف زیر آیت نمبر ۱۷۲ للامام الفخر الرازیؒ)

گویا حضرت امام رازیؒ روحوں کے حضرت آدمؑ کی پیٹھ سے نکلنے کے واقعے کو درست قرار نہیں دیتے بلکہ آپؒ کی رائے میں اس کا اصل مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ انسان کو فطرتِ صحیحہ پر پیدا کرتا ہے اور اس میں اپنے خالق کی ہستی کا شعور موجود ہوتا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ انسانوں کی پیدائش سے پہلے ان کی روحیں کسی خاص عالم میں مقید نہیں ہوتیں جہاں سے ان ارواح کو رہا کر کے دُنیا میں بھیجا جاتا ہے اور پھر جسم کی قید میں ڈال دیا جاتا ہے بلکہ روح خود انسانی جسم میں پیدا ہوتی ہے۔ یہ کہیں باہر سے داخل نہیں ہوتی چنانچہ اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں جس مقام پر انسانی پیدائش کا قانون بیان فرمایا ہے وہیں اُس نے روح کی پیدائش کا مسئلہ بھی حل فرمادیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

ولقد خلقنا الانسان من سللة من طين o ثم جعلنه نطفة فی قرار مكين o ثم خلقنا النطفة علقة فخلقنا العلقة مضغة فخلقنا المضغة عظاما فكسونا العظم

''ہم نے انسان کو مٹی کے خلاصے سے بنایا پھر ہم نے اسے نطفے میں تبدیل کر دیا جو ایک محفوظ مقام (رحم) میں رہا۔ پھر ہم نے اس نطفے کو خون کے لوتھڑے میں تبدیل کر دیا۔ پھر ہم نے اس خون کے لوتھڑے کو

لحماثم انشانه خلقا اخرط فتبٰرک اللّٰه احسن الخالقین ο (المومنون آیات ۱۲ تا ۱۴)

(گوشت کی) بوٹی بنا دیا۔ پھر ہم نے اس (بوٹی) کو ہڈیاں بنا دیا۔ پھر ہم نے ان پر گوشت چڑھا دیا۔ پھر آخر میں (اس میں ایک ایسی چیز پیدا ہوگئی کہ) وہ عام مخلوق سے ممتاز نظر آنے لگا۔ سو کتنی بڑی شان والا ہے وہ اللہ جو سب پیدا کرنے والوں سے بڑھ کر پیدا کرنے والا ہے"۔

ان تین آیات میں آغاز سے لے کر آخری درجے تک انسان کی تخلیق اور طریقِ پیدائش کا فلسفہ بیان کیا گیا ہے۔ اس فلسفے کی رو سے ابتدا میں انسان نے گیلی مٹی یعنی پانی اور کیچڑ میں جرثومے کی صورت میں پرورش پائی پھر جب انسان کا جسم بن گیا یعنی ارتقائی ادوار سے گزر کر مکمل ہوگیا اور اس قابل ہوگیا کہ مرد اور عورت کے ملاپ سے اولاد پیدا کر سکے تو پھر اس طرح پیدائشِ انسانی کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ یہ نطفہ رحم مادر میں مختلف ادوار سے گزرا۔ نطفے نے خون کی شکل اختیار کی، خون گاڑھا ہو کر بوٹی بنا، بوٹی سے ہڈیاں بنیں، پھر ان ہڈیوں پر گوشت چڑھ گیا اور جب انسانی جسم مکمل ہوگیا تو اس میں ایک ایسی چیز پیدا ہو گئی جس سے انسان ایک اور ہی قسم کی مخلوق بن گیا یعنی وہ دوسری مخلوق سے ممتاز ہوگیا۔ یہاں ذرا رُک کر سوچئے کہ وہ کون سی چیز تھی جس نے انسان کو دوسری مخلوق سے ممتاز کیا؟ وہ سوائے روح کے اور کوئی چیز نہیں ہوسکتی کیونکہ اگر اس سے ظاہری جسم مراد لیا جائے تو ہر جاندار کا جسم دوسرے سے ممتاز نظر آتا ہے۔ ایک مچھر یا جھینگر کے مقابلے میں جسمانی طور پر کبوتر یا مور کہیں زیادہ ممتاز ہے۔ ایک سمندری کیکڑے کے مقابلے میں خوبصورت مچھلی کہیں زیادہ ممتاز ہے۔ ایک گوہ یا لومڑی سے چیتا اور شیر کہیں زیادہ ممتاز ہے۔ پس یہاں انسان کو ایک ایسی مخلوق قرار دینا جو دوسری مخلوق سے ممتاز اور بالکل الگ ہے اور جس کی بنا پر اللہ تعالیٰ اپنے آپ کو احسن الخالقین قرار دیتا ہے اس سے صرف جسمانی ساخت مراد نہیں ہوسکتی بلکہ وہ قوت مراد ہے جسے روح کہتے ہیں لیکن ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے یہ کہیں نہیں

فرمایا کہ ہم نے روح باہر سے انسانی جسم میں داخل کی بلکہ انسانی جسم کی تخلیق کے عمل کے آخری درجے کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ پھر ہم نے انسان کے جسم میں وہ چیز پیدا کر دی جس سے وہ ایک اور ہی قسم کی مخلوق بن گیا۔ پس اس سے ثابت ہو گیا کہ روح کہیں باہر سے نہیں آتی بلکہ جب انسان کا جسم اور پھر دماغ مکمل ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ کے قانونِ پیدائش کے اصول کے تحت ایک ایسی قوت پیدا ہو جاتی ہے جو سوچنے سمجھنے، نیک و بد میں امتیاز کرنے، اچھی چیزوں کو پسند کرنے اور بری چیزوں سے نفرت کرنے کی پوری صلاحیت رکھتی ہے، یہی روح ہے۔ چنانچہ حضرت امام غزالیؒ نے اپنے رسالے میں اس مسئلے پر نہایت بصیرت افروز بحث کی ہے اور آپؒ نے بھی یہی نظریہ پیش کیا ہے کہ روحیں کسی خاص عالم میں پہلے سے جمع نہیں ہوتیں کہ جب جسم انسانی ماں کے پیٹ میں مکمل ہو جائے تو عالمِ ارواح میں سے ایک روح کو بھیج دیا جائے اور وہ جسم میں داخل ہو جائے۔ حضرت امام غزالیؒ اس نظریے کی سختی سے تردید کرتے ہیں چنانچہ آپؒ فرماتے ہیں کہ:۔

''اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ انسانوں کی روحیں ان کے جسم تخلیق ہونے سے قبل موجود ہوتی ہیں تو لازم آئے گا کہ ان کی کثرت ہو یا وہ روحِ واحد ہو لیکن جسم کی تخلیق سے قبل روحوں کی کثرت اور وحدت دونوں نظریے باطل ہیں پس جسموں کی پیدائش سے قبل روحوں کا وجود بھی باطل ہوا''۔ (''حقیقت روح انسانی'' ص ۲۱ مصنفہ امام غزالیؒ)

حضرت امام غزالیؒ اپنے نظریئے کی وضاحت کرتے ہوئے مزید فرماتے ہیں کہ:۔

''جس طرح سورج کے سامنے سے بادل یا اسی قسم کے حجابات (رکاوٹیں) دور ہو جانے کے بعد اس کی روشنی انہی اشیاء پر پڑتی ہے جو روشنی کو قبول کرنے کے قابل ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر اگر آئینہ کو زنگار ڈھانپ لے تو وہ عکس قبول نہیں کرتا مگر جب صیقل گر اس کو صیقل کر دیتا ہے (یعنی اس کا زنگ دور کر کے اسے روشن کر دیتا ہے) تو اس کی صفائی کے مطابق اس میں صورت دکھائی دینے لگتی ہے۔ ایسا ہی جب نطفہ میں اعتدال پیدا ہو جاتا ہے تو خالق کی طرف سے اس میں روح پیدا ہو جاتی ہے اور یہ روح اس وقت پیدا ہوتی ہے

جب نطفہ میں اس کی استعداد پیدا ہو جاتی ہے''۔ (ملخص ''حقیقتِ روح انسانی'' ص ۷ از حضرت امام غزالیؒ)

گویا اللہ تعالیٰ کے ارشاد کی رو سے روح کہیں باہر سے نہیں آتی بلکہ جب نطفہ جسم کی صورت اختیار کر لیتا ہے اور وہ مرحلہ آتا ہے جب انسان ذہنی اور دماغی لحاظ سے مکمل ہو جاتا ہے تو اس میں اللہ تعالیٰ کی قدرت اور اس کے تصرف سے ایک ایسی قوت پیدا ہو جاتی ہے جسے روح کہتے ہیں۔ حضرت امام غزالیؒ کی اس رائے سے ہمارے اس نظریے کی تائید ہوتی ہے جو ہم نے صفحۂ گزشتہ میں سورۂ مومنون کی آیت نمبر ۱۲ تا ۱۴ کی تشریح کرتے ہوئے پیش کیا تھا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ''پھر ہم ہڈیوں پر گوشت چڑھا دیتے ہیں اور آخر میں اس میں ایک ایسی چیز پیدا ہو جاتی ہے جو انسان کو دوسری مخلوق سے بالکل الگ یعنی ممتاز کر دیتی ہے''۔ اس آیتِ قرآنی سے روشنی حاصل کر کے ہم نے یہ نظریہ قائم کیا تھا کہ وہ چیز جو انسان کو دوسری مخلوق سے ممتاز کر دیتی ہے وہ روح ہے اور یہ روح جسم کے اندر ہی پیدا ہوتی ہے کہیں باہر سے نہیں آتی۔ یہی رائے حضرت امام غزالیؒ کی ہے۔

روح کی حقیقت

حکما اور فلاسفہ انسان کے جسم میں دو روحوں کے قائل ہیں۔ ایک کو وہ روحِ حیوانی اور دوسری کو روحِ انسانی کہتے ہیں۔ روحِ حیوانی سے مراد وہ طاقت ہے جس سے جمادات اور نباتات محروم ہوتے ہیں اور یہ حیوانوں میں پائی جاتی ہے۔ یہ روحِ حیوانی قوتِ حرکت' قوتِ بینائی' قوتِ سامعہ' قوتِ شامہ' قوتِ احساس' قوتِ غضب اور قوتِ شہوت کا مجموعہ ہوتی ہے' اسی روح کی بدولت حیوان زندہ رہتے اور اپنی نسل بڑھاتے ہیں۔ یہ روح جسے دراصل جان یا سببِ حیات کہنا چاہئے انسان میں بھی موجود ہوتی ہے مگر انسانوں میں اس روح (بلکہ جان) کے علاوہ ایک اور روح بھی ہوتی ہے جس سے حیوان محروم ہوتے ہیں۔ یہ وہی روح ہے جو انسان کو حیوانوں سے ممتاز کرتی ہے اور جسے فلاسفہ (۲) عقلِ فعال اور نفسِ ناطقہ سے موسوم کرتے ہیں۔ یہ دوسری روح جو صرف انسان میں پائی جاتی ہے روحِ

حیوانی سے بڑا گہرا ربط رکھتی ہے اور روحِ حیوانی کے بغیر انسانی جسم میں اس کا وجود قائم نہیں رہ سکتا بلکہ زیادہ صحیح الفاظ میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ روحِ حیوانی جب انسانی جسم میں پیدا ہوتی ہے تو اسی کو روحِ انسانی کہتے ہیں۔ روحِ حیوانی سے مل کر اور انسانی جسم سے تعلق پکڑ کر یہ روح بھی ایک غیر مرئی پیکر اور جسم اختیار کر لیتی ہے۔ عالمِ اسلام کے نامور مفکر، عالم اور مجددِ وقت حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ روحِ حیوانی اور روحِ انسانی کے باہمی تعلق پر روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں:

''انسانی زندگی کا انحصار ان بخارات پر ہے جو قلب میں پیدا ہوتے ہیں۔ اگر کسی وجہ سے ان بخارات کے افعال میں فساد پیدا ہو جائے تو انسانی جسم کے متعلقہ اعضاء میں بھی بگاڑ پیدا ہو جاتا ہے۔ جب تک یہ بخارات انسانی قلب میں پیدا ہوتے رہتے ہیں اس وقت تک زندگی قائم رہتی ہے مگر جب ان بخارات کی پیدائش کا عمل ختم ہو جاتا ہے تو اس کے ساتھ ہی انسانی جسم پر بھی موت وارد ہو جاتی ہے۔ یہ بخارات روحِ حیوانی کہلاتے ہیں اور بہ ظاہر انہی پر روح کا گمان ہوتا ہے مگر در حقیقت ان بخارات کو روحِ انسانی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ یہ بخارات ایک ایسے مادے کی حیثیت ضرور رکھتے ہیں جس کی وجہ سے حقیقی روح کا جسم سے تعلق قائم رہتا ہے۔ جب قلب انسانی میں بخارات پیدا کرنے کی استعداد باقی نہیں رہتی تو یہ بخاراتی یا حیوانی روح جسم سے رخصت ہو جاتی ہے اور اسی کو موت کہتے ہیں۔ موت کے بعد بخاراتی یا حیوانی روح پر ایک نئی کیفیت وارد ہوتی ہے یعنی روحِ حقیقی اور روحِ حیوانی کے مابین دیرینہ تعلق کی بنا پر ان دونوں کے درمیان ایک حسِ مشترک پیدا ہو جاتی ہے۔ موت کے بعد عالم ارواح میں اس حسِ مشترک کو ایک ایسی قوت عطا کی جاتی ہے جس سے وہ بولنے، سننے اور دیکھنے کا کام لیتی ہے۔ عالم ارواح میں اس روحِ مشترک کو نورانی یا ظلماتی جسم دیا جاتا ہے اور اس جسم پر عالم ارواح کی کیفیات یعنی رنج و راحت کے اثرات ظاہر ہوتے ہیں''۔ (ملخص حجۃ اللہ البالغہ ص ۱۱۸ الجز الاول مطبوعہ مصر مصنفہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ)

ہر صاحبِ بصیرت غور و فکر اور تدبر کے بعد اسی نتیجے پر پہنچتا ہے کہ انسانی روح

دراصل روحِ حیوانی کی ترقی یافتہ صورت ہے۔ جب حیوانی روح انسانی جسم میں پیدا ہوتی ہے تو اس روح میں ایک ایسا عنصر بھی شامل ہو جاتا ہے جو حیوانی روح میں موجود نہیں ہوتا۔ یہ عنصر انسان میں غور وفکر اور عقل وشعور کی استعداد پیدا کرتا اور اسے اشرف المخلوقات بناتا ہے۔ موت کے بعد جب انسان کے جسم سے روح نکل جاتی ہے تو چونکہ اس نے جسم میں ایک طویل مدت گزاری ہوتی ہے اس لئے اس پر جسمیت کا بھی کچھ نہ کچھ اثر ضرور قائم ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ روحِ انسانی جب بدن سے نکل کر عالم ارواح میں داخل ہوتی ہے تو اس کے ساتھ ایک غیر محسوس قسم کا جسم بھی ہوتا ہے۔ یہ جسم اس کے دنیاوی اعمال کے مطابق ہوتا ہے۔ اگر اس نے یہاں نیک اور پاکیزہ زندگی گزاری ہوتی ہے تو اس کا جسم نورانی ہوتا ہے جس کی وجہ سے اس کی روح سکون محسوس کرتی اور عالم ارواح کی لذتوں سے لطف اندوز ہوتی ہے لیکن اگر اس نے دنیا میں گناہ اور معصیت کی زندگی گزاری ہے تو اس کا جسم ظلماتی ہوتا ہے جس کی وجہ سے اس پر اذیت کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور وہ خود کو سخت عذاب کی حالت میں محسوس کرتا ہے۔

روح اور جسم کے اس تعلق پر آٹھویں صدی ہجری کے ممتاز عالم، محدث اور مفکر حضرت امام ابن قیمؒ نے بھی بڑے لطیف پیرائے میں روشنی ڈالی ہے۔ آپؒ فرماتے ہیں:۔

''اللہ تعالیٰ نے جسم کو اس لئے درست اور مناسب حالت میں پیدا کیا کہ وہ روح کے ٹھہرنے کا قالب بن جائے۔ گویا جسم کی ترکیب وتشکیل روح کی تشکیل ودرستی کے تابع ہے کیونکہ جسم روح کے قیام کرنے کی جگہ ہے جس طرح قالب میں کوئی چیز ڈھالی جاتی ہے اسی طرح روح کو جسم میں ڈھالا گیا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ روح کی بھی ایک شکل ہے اور جسم سے متحد ہو کر اسے ایک محسوس صورت مل جاتی ہے''۔ (کتاب الروح ص ۵۹ مطبوعہ مصر ۱۳۱۸ھ مصنفہ شیخ الاسلام شمس الدین ابی عبداللہ محمد الشہیر بابن قیمؒ الجوزیہ الحنبلی الدمشقی المتوفی ۷۵۱ھ)

حضرت امام ابن قیمؒ کی رائے کے مطابق روح جسم ہی میں پرورش پاتی ہے اور اس بدنی تعلق کی بنا پر وہ بھی ایک جسمانی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ یہ جسمانی صورت ایسی

ہوتی ہے جسے وہ خود بھی محسوس کرتی ہے اور بدن سے مفارقت کے بعد عالمِ ارواح میں اسی محسوس جسم کی بنا پر وہ رنج وراحت کی مختلف کیفیات کا مشاہدہ کرتی اور ان سے دُکھ یا لطف اٹھاتی ہے۔ حضرت امام ابن قیمؒ نے جسم اور روح کے تعلق پر بحث کرتے ہوئے صراحت فرمائی ہے کہ موت کے بعد روح جو بدن حاصل کرتی ہے وہ اس کے دنیاوی اعمال کے مطابق ہوتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ روح بدن سے وابستہ رہ کر دنیا میں جس قسم کا پیکر اختیار کرتی ہے وہ پیکر اس کے اعمال کے مطابق ہوتا ہے۔ گویا وہ اپنی جنت اور جہنم اسی دنیا میں پیدا کر لیتی ہے اور یہاں سے جو پیکر لے کر وہ عالم ارواح کی طرف جاتی ہے اسی پیکر میں اس کے عذاب وثواب کے تمام سامان موجود ہوتے ہیں۔
حضرت امام قیمؒ اسی لطیف نکتے کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:۔

> ''جسم اور روح میں بڑا گہرا تعلق ہے۔ گندے جسم میں روح بھی گندی ہوتی ہے اور پاکیزہ جسم میں روح بھی پاکیزہ ہوتی ہے۔ اس لئے روح کے جسم سے جدا ہوتے وقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ارشاد ہوتا ہے کہ اے پاک روح! جو پاک بدن میں مقیم ہے اور اے پلید روح! جو پلید جسم میں مقیم ہے نکل آ''۔ (کتاب الروح ص ۶۰ مصنفہ امام ابن قیمؒ)

ایشیا کے بعض قدیم مفکروں نے جن کا تعلق قبل از مسیح کے دور سے ہے اصل حقیقت تک پوری طرح رسائی نہ ہونے کی بنا پر یہ نظریہ پیش کیا کہ ''بیمار جسم میں روح بھی بیمار ہوتی ہے''۔ اس کے مقابلے میں عالم اسلام کے اس جلیل القدر مفکر (امام ابن قیمؒ) نے دنیا کو اس حقیقت پسندانہ نظریے سے متعارف کیا کہ روح کی بیماری کا باعث جسم کی بیماری نہیں ہوتی بلکہ روح کی بیماری کی اصل وجہ جسم کی ناپاکی ہوتی ہے کیونکہ جسم کی بیماری کی وجہ سے روح کی بیماری کا نظریہ ہمارے روزمرہ کے مشاہدے کے بھی خلاف ہے۔ ہم آئے دن دیکھتے ہیں کہ بڑے صحت مند اور طاقتور جسموں میں نہایت خبیث ارواح مقیم ہوتی ہیں اور بعض اوقات نہایت کمزور اور بیمار جسم بڑی صحت مند اور پاکیزہ ارواح کی قرار گاہیں ہوتی ہیں۔ پس انسان کی روح کی حقیقی صحت یا بیماری کا دارومدار جسم کی ظاہری صحت یا بیماری

پر نہیں بلکہ اس کے اعمال و کردار پر ہوتا ہے۔

روح کا مقام پیدائش

بعض فلاسفہ نے یہ نظریہ پیش کیا ہے کہ روح سارے جسم میں جاری وساری ہے لیکن اس کا حقیقی منبع کون سا ہے اور یہ جسم کے کس حصے میں پیدا ہوتی ہے؟ یہ سوال حل طلب ہے۔ روح کے بارے میں ایک مخصوص نظریہ افلاطونی مدرسۂ فکر کے بانی الیگزنڈرا نے پیش کیا۔ اسی مدرسۂ فکر کے ممتاز مفکر فلاطینوس نے اس فلسفیانہ نظریے کو مزید وسعت دی اور ''رسائل اخوان الصفا'' کے مصنفین نے اس نظریے کو بنیاد بنا کر نئی نئی موشگافیاں کیں۔ اس نظریہ کے مطابق روحِ انسانی ایک بڑی روح کا جزو ہے۔ جسم کی موت کے بعد روح اصل اور بڑی روح سے اتصال پیدا کر لے گی یعنی جزو اپنے کل سے جا ملے گا لیکن یہ نظریہ قطعاً باطل ہے۔ روحِ انسانی کسی بڑی روح کا جزو نہیں بلکہ اپنی ذات میں ایک مستقل وحدت ہے اور جسم کی موت کے بعد اس کی یہ ذاتی وانفرادی حیثیت اور وحدت برقرار رہے گی کیونکہ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ بدن کی موت کے بعد روح حقیقی اور اصل روح سے جا ملے گی تو حشر ونشر اور جزا وسزا کا سارا فلسفہ ختم ہو جاتا ہے اور اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ روح کا انفرادی وجود بھی باقی نہیں رہے گا۔ عقلاً بھی یہ نظریہ نا قابلِ قبول ہے کیونکہ ہر انسان کی روح دوسری سے مختلف ہوتی ہے اور مختلف قسم کے اعمال سرانجام دیتی ہے۔ ان اعمال سے یقینی طور پر روح کی پاکیزگی متاثر ہوتی ہے۔ ایک بدکردار شخص کی روح ناپاک اور غلیظ ہو جاتی ہے۔ یہ ناپاک اور غلیظ روح اس روح سے کیسے اتصال پیدا کر سکتی ہے جسے حقیقی اور بڑی روح کہا جاتا ہے اور جو تمام تر مقدس ہے۔ پس روح نہ تو کسی بڑی روح کا جزو ہوتی ہے نہ جسمانی موت کے بعد وہ حقیقی اور بڑی روح سے اتصال پیدا کرتی ہے بلکہ عالم ارواح میں چلی جاتی ہے جسے عالم برزخ بھی کہتے ہیں جہاں سے اپنے اعمال کے مطابق مختلف کیفیات سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔

روح کے سارے جسم میں جاری وساری ہونے کا نظریہ بھی جو مندرجہ بالا نظریے

کا جزو ہے غلط اور نا قابل قبول ہے کیونکہ جب کُل غلط ہے تو اس کا جزو بھی غلط ہو گا۔ اس میں شک نہیں کہ انسان کے سارے جسم میں زندگی اور حرکت کا عمل ضرور جاری ہے مگر اسے روح قرار نہیں دیا جا سکتا۔ روح کی پیدائش اور اس کے قیام کا ایک خاص مقام ہے اور وہ ہے قلب۔ علم بدن کے تمام ماہرین اس نظریے پر متفق ہیں کہ جب نطفہ رحم مادر میں قرار پاتا ہے اور اس سے انسانی جسم بننا شروع ہوتا ہے تو سب سے پہلے جو عضو بنتا ہے وہ قلب ہے۔ پھر اس کے معاون اعضاء مثلاً دماغ، پھر جگر اور پھر معدہ کی تشکیل ہوتی ہے اور ان کا جسم بنتا ہے۔ فارابی نے بھی جو کلیاتِ طب کا بھی عالم تھا یہی رائے ظاہر کی ہے۔ پس جب یہ ثابت ہو گیا کہ رحمِ مادر میں انسانی جسم کے اعضاء میں سب سے پہلے قلب جسمانی صورت اختیار کرتا ہے تو ہمیں تسلیم کرنا پڑے گا کہ روح بھی قلب ہی میں پیدا ہوتی ہے کیونکہ قلب ہی تمام اعضائے جسمانی میں شریف ترین عضو قرار دیا گیا ہے اور اسے جسم انسانی کا حاکم اعلیٰ کہا گیا ہے۔ اس لئے روح کی پیدائش اور اس کے قیام کا یہی مقام درست ثابت ہوتا ہے۔ یہیں سے روح ہمارے جسم پر حکومت کرتی ہے۔ قلب ہی میں وہ جسمانی موت تک مقیم رہتی ہے، اطباء کے نزدیک قلب ہی اس حرارت اور بخارات کی پیدائش کا مرکز ہے جن سے زندگی برقرار رہتی ہے۔ یہی بخارات اور حرارتِ غریزی روح کی پیدائش کا سبب اور واسطہ ہیں۔

روح کے افعال

اس حقیقت کے ادراک کے بعد کہ روح انسانی جسم ہی میں پیدا ہوتی ہے، پیش نظر سوال یہ ہے کہ روح کے افعال کیا ہیں؟ روح کو کیوں پیدا کیا گیا؟ کہ اسی حقیقت کا علم حاصل کرنا ہمارے اس باب کی روح ہے۔

پہلی بات تو یہ ذہن نشین کر لینے کی ہے کہ روح حقیقتِ واحدہ ہے یعنی بعض قدیم مشرقی اور یونانی فلاسفہ کے نظریات کے مطابق اسے بہت سی طاقتوں مثلاً حواس اور عقل وغیرہ کا مجموعہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ ان فلسفیوں کی نگاہ اس حقیقت تک رسائی حاصل کرنے

میں ناکام رہی کہ حواس اور عقل روح کا حصہ نہیں بلکہ یہ سب واسطے ہیں جن کے ذریعے روح اور جسم میں تعلق پیدا ہوتا ہے۔ حواس وہ آلات ہیں جن سے ہم اشیاء کو دیکھتے، چھوتے، سنتے اور محسوس کرتے ہیں۔ عقل وہ طاقت ہے جو حواس کے واسطے سے اشیاء اور ان کی حقیقت کا ادراک کرتی ہے۔ ان میں سے ہر قوت کا مرکز دماغ ہے لیکن ایک ایسی قوت بھی ہے جس کا مرکز دماغ کو قرار نہیں دیا جا سکتا کیونکہ دماغ کے جدید و قدیم تمام ماہرین کی متفقہ رائے ہے کہ ہمارے دل میں جتنی خواہشات اور احساسات پیدا ہوتے ہیں ان کے مراکز دماغ کے مختلف حصے ہوتے ہیں۔ چنانچہ شیخ الرئیس بوعلی سینا کہتا ہے کہ کسی چیز کے تصور کرنے کی قوت، غور و فکر کرنے کی قوت اور چیزوں کو حافظے میں یاد رکھنے کی قوت، یہ ساری قوتیں دماغ کے الگ الگ عصبی حصوں سے تعلق رکھتی ہیں مگر شیخ یا اس کے ہم عصر حکما بلکہ آج تک پیدا ہونے والے تمام قدیم و جدید اطبا میں سے کوئی ایک بھی ایسا ماہر جسم انسانی نہیں گزرا جس نے روح کا مرکز دماغ کا کوئی حصہ قرار دیا ہو۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ روح دماغ اور حواس سے بالاتر طاقت کا نام ہے جو ان تمام طاقتوں کو استعمال کرتی اور ان سے لطف اندوز ہوتی یا اذیت سے دوچار ہوتی ہے۔ شاید اس نکتے تک رسائی حاصل ہو جانے کی وجہ سے افلاطون نے یہ درست نظریہ پیش کیا کہ عقل خود روح نہیں بلکہ روح کے تابع ہے۔ اس سے یہ نظریہ سامنے آتا ہے کہ ہمارا جسم جو حرکات و افعال سرانجام دیتا ہے اس کا منبع روح ہے یعنی روح ہی کے حکم سے جسم سے اس کے افعال صادر ہوتے ہیں گویا روح ہمارے جسم پر حکومت کرتی ہے۔

افعال روح کے بارے میں امام غزالیؒ کا نظریہ

چنانچہ عالم اسلام کے ممتاز مفکر حضرت امام غزالیؒ روح کے افعال کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''جب انسان کوئی قلم اٹھانا چاہتا ہے تو پہلے اس کا ارادہ پیدا ہوتا ہے، اس ارادے کا اثر قلب پر پڑتا ہے، اس کے بعد انسان کی روح حیوانی جو ایک لطیف گیس کی صورت رکھتی ہے دل کے مرکز میں متحرک ہوتی ہے اور دماغ میں پہنچ کر اعصاب کو

متاثر کرتی ہے' ان اعصاب کے واسطے سے انگلیوں میں حرکت پیدا ہوتی ہے اور انگلیوں کی حرکت کی وجہ سے قلم حرکت کرتا ہے' قلم سے روشنائی کاغذ پر حروف کی شکل بناتی ہے۔ گویا ارادے کی ابتدا میں انسان نے جو تحریر لکھنے کا قصد کیا تھا وہ کاغذ پر منتقل ہو جاتی ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ اس تحریر کا تصور پہلے سے اس کے خزینۂ خیال میں موجود تھا کیونکہ یہ ثابت شدہ حقیقت ہے کہ کوئی تحریر یا نقش جب تک ابتداء سے انسان کے خیال میں اپنی صورت نہ بنا چکا ہو اس وقت تک وہ کاغذ پر منتقل نہیں ہو سکتا''۔ (''حقیقت روح انسانی'' ص ۲۷)

روح کے افعال کی اس تشریح کے بعد امام غزالیؒ انسانی جسم میں روح کے مقام و مرتبہ کو ایک مثال کے ذریعے اس طرح واضح کرتے ہیں:

> ''اگر انسان پیدائشِ عالم کے ان اصولوں اور کیفیات پر غور کرے گا جن کے تحت اللہ تعالیٰ نے یہ کائنات تخلیق کی تو اسے اعتراف کرنا پڑے گا کہ انسان کو عالمِ صغیر یعنی جسم پر ایسا ہی قبضہ و اختیار حاصل ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کو عالمِ کبیر یعنی اس کائنات پر حاصل ہے''۔ (''حقیقت روحِ انسانی'' ص ۲۷)

اس تمثیل سے حضرت امام غزالیؒ نے انسان کے اختیار کی تشریح کر دی اور روح کی مرکزی و فعالی حیثیت بھی واضح فرما دی یعنی انسان اپنے افعال میں پوری طرح صاحبِ اختیار و آزاد ہے اور روح جسم انسانی پر حکومت کرتی ہے اس لئے جسم کے ہر فعل کی جوابدہ ہے۔ گویا روح کا دوسرا نام انسان ہے اور انسان روح کے بغیر محض حیوان ہے۔

روح اور نفس

قدیم فلاسفہ نے روح اور نفس کے لئے الگ الگ اصطلاحیں استعمال کی ہیں یعنی وہ نفس کو روح سے الگ قوت قرار دیتے ہیں۔ ان کے خیال میں نفس کا مرکز قلب اور روح کا مرکز وجودِ باری یا عالم ملائکہ ہے لیکن اگر باریک بینی سے غور کیا جائے تو نفس روح سے الگ کوئی قوت نہیں بلکہ روح ہی کے مختلف مدارج کا نام ہے۔ قرآن حکیم نے نفس کا

لفظ جسم انسانی یا وجودِ انسانی کے لئے بھی استعمال کیا ہے اور روح کے لئے بھی مگر اس نے کہیں روح اور نفس میں تفریق نہیں کی یعنی روح کو نفس سے الگ کوئی طاقت قرار نہیں دیا۔

شاہ ولی اللہؒ کا نظریہ

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے جسم انسانی میں تین لطائف کا ذکر کیا ہے۔ آپؒ فرماتے ہیں ''انسان کے وجود میں تین لطیف حقیقتیں پائی جاتی ہیں یعنی (۱) عقل (۲) قلب (۳) نفس ۔ان تینوں لطائف پر اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ عقل وہ قوت ہے جس سے ان معارف اور ایسی حقیقتوں کا علم حاصل ہوتا ہے جو حواسِ خمسہ کے ذریعے حاصل نہیں ہوسکتا۔ عقل ہر امر کی حقیقت اور اس کے اسباب تلاش کرتی رہتی ہے۔ فائدے اور نقصان میں امتیاز کرتی ہے، نفع کے حصول اور نقصان کو دور کرنے کی تدابیر سوچتی ہے۔ قلب وہ شے لطیف ہے جو محبت اور دشمنی کا مرکز ہے۔ جس میں شہوانی لذتیں جنم لیتی ہیں۔ قلب کے انفعال میں غصہ، شجاعت و جرأت، بزدلی و پست ہمتی، عشق و محبت، دولت و عزت کی حرص، بخل وسخاوت اور اُمید و نا اُمیدی کی صفات داخل ہیں۔ نفس کی انتہائی کیفیت یہ ہے کہ وہ مادی لذتوں یعنی لذیذ کھانوں، دل پسند مشروبات اور حسین عورتوں سے اختلاط میں مصروف رہتا ہے''۔ (ملخص حجتہ اللہ البالغہ ص ۸۰ و ص ۱۸۱ الجز الثانی مطبوعہ مصر)

انسانی جسم کے ان تین لطائف کے علاوہ حضرت شاہ صاحبؒ نے کسی چوتھی حقیقت کی طرف اشارہ بھی نہیں فرمایا حالانکہ اصل حقیقت تو روح ہے۔ پس ثابت ہوا کہ شاہ صاحبؒ نفس ہی کو روح قرار دیتے ہیں اور اس کی انتہائی کیفیت یہ بیان فرماتے ہیں کہ جب نفس جادۂ مستقیم سے ہٹ کر قلب کی ناپسندیدہ قوتوں کے تابع ہو جائے یعنی جب وہ دنیاوی لذتوں ہی کو اپنا مقصدِ وحید سمجھ لیتا ہے، انہی کے حصول میں مصروف رہتا ہے اور عقل صحیح کی راہنمائی قبول نہیں کرتا، نفس کی اس حالت کو شاہ صاحب اعتدال سے انحراف کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔

علامہ ابن مسکویہؒ کا نظریہ

چوتھی صدی ہجری کے عظیم مسلمان مفکر، فلسفی اور عالم علامہ ابن مسکویہؒ نے جو

ارسطو کے فلسفے کے بہت بڑے عالم وشارح تھے قرآن حکیم اور احادیث رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے رہنمائی حاصل کرنے کے بعد یہ نظریہ پیش کیا کہ نفس ہی انسان کی اصل طاقت اور روح ہے۔ چنانچہ آپؒ نے ایک وصیت تحریر فرمائی جسے اللہ کے نام سے شروع کیا اور پھر لکھا کہ "یہ وہ عہد ہے جو احمد بن محمد (ابوعلی ابن مسکویہ) نے اپنے نفس سے کیا ہے جبکہ وہ پرامن زندگی گزار رہا ہے، اس کی جسمانی صحت بہت اچھی ہے اور معاشی لحاظ سے بھی وہ فارغ البال اور مطمئن ہے پس اسے کسی جسمانی ضرورت یا نفسانی خواہش نے مجبور نہیں کیا کہ وہ اپنے نفس سے یہ معاہدہ کرے نہ اس معاہدہ کے ذریعے وہ لوگوں میں مقبول ہونا چاہتا ہے اور نہ اس کا مقصد کسی نفع کا حصول یا کسی نقصان سے تحفظ حاصل کرنا ہے بلکہ اس نے یہ معاہدہ اپنے نفس سے جہاد کرنے کی خاطر کیا ہے"۔ اس کے بعد علامہ ابن مسکویہ اپنے نفس پر پندرہ ذمہ داریاں عائد کرتے ہیں جن کا خلاصہ یہ ہے کہ نفس پست خواہشات کا مقابلہ کرے اور ان میں سے کسی ادنیٰ خواہش سے مغلوب نہ ہو۔ فرماتے ہیں کہ "انسان اور اس کے نفس میں مسلسل اور دائمی کشمکش رہتی ہے۔ اگر کسی وقت نفس گفتگو کی خواہش کرے تو اس وقت تک زبان نہ کھولی جائے جب تک عقل اجازت نہ دے"۔ (ملخص تاریخ فلاسفۃ الاسلام فی المشرق والمغرب ص ۳۰۶ تالیف محمد لطفی جمعہ مطبوعہ مصر ۱۳۴۵ھ)

علامہ ابن مسکویہؒ نے اس پوری وصیت میں کہیں روح کا لفظ استعمال نہیں کیا بلکہ نفس ہی کو روح قرار دیا اور اسی کی درستی کو نجاتِ ابدی کا باعث ٹھہرایا۔

شیخ اکبرؒ کا نظریہ

شیخ اکبر حضرت محی الدین ابن عربیؒ صوفیا کے امام اور اپنے عہد کے اہل اللہ کے سرخیل تھے۔ آپؒ کی کتاب "فتوحاتِ مکیہ" علم وعرفان کا خزینہ ہے۔ حضرت شیخ اکبرؒ نے بھی ہر جگہ نفس ہی کو روح قرار دیا ہے چنانچہ آپؒ "فتوحاتِ مکیہ" میں فرماتے ہیں کہ "میں نے ایک شب خواب دیکھا کہ میں جنت میں ہوں۔ اس عالم میں مجھے دوزخ، حساب کتاب اور قیامت کا مشاہدہ ہوا مگر اس سے مجھ پر کوئی دہشت طاری نہیں ہوئی۔ خواب سے

بیداری کے بعد میرے نفس نے اس علم کی بناپر جو اللہ تعالیٰ نے اسے عطا فرمایا تھا مجھ سے مطالبہ کیا کہ میں اپنی موجودہ حالت کو مزید بہتر بناؤں۔ اس کے بعد میرے اور میرے نفس میں مکالمہ ہوا''۔ اس مکالمے میں حضرت شیخ محی الدین ابن عربیؒ بار بار اپنے نفس سے سوالات کرتے ہیں اور اسے اکابر صحابہ اور بزرگانِ دین کے احوال و مقامات سے آگاہ کرتے ہیں۔ آخر میں نفس حضرت شیخ اکبرؒ کے سامنے اپنی کوتاہیوں کا اعتراف کرتا اور اللہ تعالیٰ کے حضور توبہ کرنے کے بعد آئندہ ثابت قدم رہنے کا عہد کرتا ہے۔ اس کے بعد آپؒ فرماتے ہیں کہ ''میں نے اپنے نفس سے اسی قسم کے معاہدے کئے جیسے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فتح مکہ کے بعد ایمان لانے والی عورتوں سے کئے تھے''۔ (ملخص تاریخ فلاسفۃ الاسلام ص ۳۰۰ تا ص ۳۰۳ تالیف محمد لطفی جمعہ مطبوعہ مصر)

شیخ اکبرؒ کی رائے میں بھی نفس ہی اصل روح ہے اور اسی کی قوت روح کی قوت کا نام ہے۔ اسی کی اصلاح سے انسان کو معرفت کا مقام بلند نصیب ہوتا ہے۔ اگر نفس روح سے جداگانہ کسی طاقت کا نام ہوتا تو ناممکن تھا کہ شیخ اکبرؒ اس کا ذکر نہ فرماتے۔

حضرت سید عبدالقادر جیلانیؒ کے ارشادات

شیخ بغداد حضرت سید عبدالقادر جیلانیؒ کے اعلیٰ وارفع روحانی اور علمی مرتبہ کا کون منکر ہوگا۔ ہر دور میں مسلمان علماء، بزرگان دین اور عامتہ المسلمین کی کثیر تعداد آپؒ کے حلقۂ عقیدت میں شامل رہی اور آپؒ کے فیضانِ روحانی سے فیضیاب ہوتی رہی۔ حضرت سید عبدالقادر جیلانیؒ نے بھی ہر مقام پر نفس ہی کو روح قرار دیا چنانچہ آپؒ فرماتے ہیں ''نفس اللہ تعالیٰ سے دشمنی رکھتا ہے اور اس سے سرکشی کرتا ہے۔ اس کے علاوہ کائنات میں جتنی موجودات پائی جاتی ہیں وہ سب اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرتی ہیں۔ اگرچہ نفس بھی اللہ ہی کی مخلوق ہے مگر اسے اپنے بارے میں بہت سی غلط فہمیاں ہیں۔ پس اگر تو اللہ تعالیٰ کا فرماں بردار بن کر اپنے نفس کا مقابلہ کرے گا تو اپنے نفس کا دشمن ہو جائے گا۔ پھر تو خدا کا پسندیدہ وجود بن جائے گا''۔ اس کے بعد حضرت سید عبدالقادر جیلانیؒ حضرت بایزید بسطامیؒ سے

متعلق ایک حکایت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ''ایک روز خواب میں آپؒ (حضرت بایزید بسطامیؒ) کو اللہ تعالیٰ کی زیارت کا شرف حاصل ہوا۔ آپؒ نے جنابِ الٰہی میں عرض کی کہ تیرے حضور پہنچنے کا کون سا راستہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اپنے نفس سے قطع تعلق کر لے تو میری طرف آ جائے گا۔ حضرت بایزید بسطامیؒ فرماتے ہیں کہ اس روز کے بعد میں نے اپنے نفس کی گرفت سے اس طرح رہائی حاصل کر لی جس طرح سانپ کینچلی سے باہر آ جاتا ہے۔ غرض ساری خیر و فلاح اسی صورت میں حاصل ہو سکتی ہے جب کہ ہر حالت میں اپنے نفس سے دشمنی رکھی جائے''۔ (فتوح الغیب۔ المقالتہ العاشرہ۔ مقالہ نمبر ۱۰)

غوثِ اعظمؒ اور حضرت بایزید بسطامیؒ جیسے اکابر اہل اللہ نے جن پر معرفت کے باریک در باریک اسرار پوری طرح منکشف ہو چکے تھے بڑی صراحت سے نفس ہی کو حقیقت انسانی قرار دیا اور کون نہیں جانتا کہ حقیقتِ انسانی روح کا نام ہے' ان دونوں برگزیدہ روحانی ہستیوں نے اسی کی تربیت کو مورِ دِنجات ٹھہرایا۔

آخر میں دنیائے اسلام کے ممتاز عالم و محدث حضرت امام ابن قیمؒ نے بڑی وضاحت سے فیصلہ فرما دیا کہ نفس اور روح ایک ہی طاقت کے دو نام ہیں چنانچہ امام موصوف نے اپنی تصنیف ''کتاب الروح'' میں ص ۳۴۶ سے ص ۳۴۷ تک روح کی مختلف اقسام پر بحث کی ہے۔ آپؒ فرماتے ہیں ''میری رائے ہے کہ جس روح کو قبض کیا جاتا ہے وہ صرف ایک ہے اسی کا نام نفس ہے''۔

سب سے آخر میں قرآنِ حکیم سے رجوع کیجئے جو تمام علوم کا سرچشمہ اور سارے ہادیوں کا ہادی ہے۔ اس مقدس اور آخری کتابِ الٰہی پر تدبر کرنے سے اس حقیقت کا بخوبی ادراک ہو جاتا ہے کہ نفس دراصل روح کی مختلف حالتوں کا نام ہے۔

روح کے تین مدارج

قرآن حکیم نے روح کے تین مدارج بیان کئے ہیں۔ عقل انسانی بھی روح کے لئے یہی تین مدارج تجویز کرتی ہے۔ ان تین مدارج یا تین حالتوں کو قرآن حکیم تین ناموں

سے موسوم کرتا ہے (۱) نفسِ امارہ (۲) نفسِ لوامہ (۳) نفسِ مطمئنہ۔

نفسِ لمّارہ

نفسِ امارہ روح کی وہ ادنیٰ ترین حالت ہے جب یہ پوری طرح حیوانی خواہشات کے تابع ہوتا ہے یعنی جس طرح حیوان نیکی اور بدی، خیر اور شر اور نفع اور نقصان میں کوئی امتیاز نہیں کرتے بلکہ ہر قسم کی قیود سے آزاد جو چاہتے کرتے اور جدھر چاہتے منہ مارتے پھرتے ہیں اسی طرح انسان کی روح بھی اس درجے میں حیوانی خواص سے مغلوب ہوتی ہے۔ انسان کی یہ گھٹیا خواہشات روح میں ابتدا سے موجود نہیں ہوتیں کیونکہ انسان کی روح پیدائشی طور پر ہر قسم کے عیب اور جذباتِ رذیلہ سے پاک ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ قرآن حکیم میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے:

ونفس وما سولها ٥ (سورہ الشمس آیت ۷) ''اور میں نفس انسانی کو شہادت کے طور پر پیش کرتا ہوں جسے بے عیب بنایا گیا ہے۔''

یہاں اللہ تعالیٰ انسان کا لفظ استعمال نہیں فرماتا کہ اسے بے عیب بنایا گیا ہے تا کہ پڑھنے والے کا ذہن انسان کی جسمانی ساخت اور اس کے ظاہری حسن کی طرف منتقل نہ ہو جائے بلکہ فرماتا ہے کہ ہم نے انسان کے نفس یعنی روح کو بے عیب بنایا ہے۔ گویا انسان خواہ مسلمان ہو یا کافر پیدائشی طور پر کسی کی روح خبیث اور پلید نہیں ہوتی۔ اس میں رذیل خواہشات اور گھٹیا جذبات ماحول کی اثر پذیری سے پیدا ہوتے ہیں۔ مشاہدہ اور خارجی عوامل ان رذیل خواہشات کے محرک ہوتے ہیں۔

ہمارے ذہن میں جب بھی کوئی خیال پیدا ہوتا ہے اس کی بنیاد کوئی نہ کوئی مشاہدہ یا تحریک ہوتی ہے۔ پہلے انسان کوئی چیز، فعل یا منظر دیکھتا یا اس کے بارے میں سماعت کے ذریعے سے علم حاصل کرتا ہے۔ یہ پہلا درجہ ہے۔ پھر اس کے ذہن میں ایک خیال پیدا ہوتا ہے، یہ دوسرا درجہ ہے۔ اس کے بعد انسان اس خیال کو عملی جامہ پہنانے کا ارادہ کرتا ہے، یہ تیسرا درجہ ہے۔ پھر اس کی قوتِ عمل حرکت میں آتی ہے، یہ چوتھا درجہ ہے۔ اس کے بعد نتیجہ

عمل ظاہر ہوتا ہے، یہ پانچواں درجہ ہے۔ انسانی زندگی انہی پانچ حالتوں سے گزرتی ہے۔ اس کی مثال یوں دی جاسکتی ہے کہ انسان ایک خوبصورت اور پرشکوہ عمارت دیکھتا ہے، یہ اس کا مشاہدہ ہے۔ یہ عمارت دیکھ کر اس کے دل میں خواہش پیدا ہوتی ہے کہ وہ بھی اسی طرح کی خوبصورت اور دلفریب عمارت تعمیر کرے، یہ خیال ہے اس خیال کو عملی شکل دینے کے لئے وہ ایک منصوبہ بناتا ہے، یہ ارادہ ہے۔ پھر اس عمارت کے لئے روپیہ اور سامانِ تعمیرات فراہم کرتا ہے، یہ عمل ہے۔ کچھ مدت کے بعد عمارت بن کر تیار ہوجاتی ہے، یہ نتیجۂ عمل ہے۔

عمل، اسبابِ عمل اور نتیجۂ عمل میں ہماری روح بنیادی کردار ادا کرتی ہے۔ ہر خیال کا مرکز روح ہے۔ جب انسان کسی غلط خواہش یا پست جذبے سے مغلوب ہوجاتا ہے تو روح پر وہ حالت طاری ہوجاتی ہے جسے نفسِ امارہ کہتے ہیں چنانچہ اللہ تعالیٰ قرآنِ حکیم میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ:۔

ان النفس لامارۃ بالسوء الخ (سورہ یوسف آیت نمبر ۵۳) ''انسان کا نفس تو برائی کی طرف مائل کرتا ہے سوائے اس کے جس پر (اللہ تعالیٰ کی نظر عنایت ہو اور) وہ رحم فرمائے''۔

یہاں قرآن حکیم نے انسان کی روح کے ادنیٰ درجے کو نفسِ امارہ قرار دیا ہے یعنی انسان میں ایسی طاقتیں بھی موجود ہیں جو اس کو خواہشاتِ رذیلہ کا غلام بنائے رکھنا چاہتی ہیں اور اس کی روح کو اپنا محکوم کرنے میں کوشاں رہتی ہیں۔ مثال کے طور پر ایک شخص اپنے قیمتی زیورات بطور امانت کسی کے سپرد کرتا ہے لیکن یہ امانت داران زیورات کو فروخت کر کے روپیہ اپنے ذاتی استعمال میں لے آتا ہے۔ جب زیورات کا مالک اس سے زیورات کی واپسی کا مطالبہ کرتا ہے تو وہ اس واقعے ہی کا انکار کردیتا ہے۔ اس طرح اس شخص نے تین جرم کئے۔ ایک تو امانت میں خیانت کی، دوسرے ایک شخص کو ہزاروں روپے کا نقصان پہنچایا، تیسرے صریح جھوٹ بولا۔ روح کی یہ وہ حالت ہے جب اس نے رذیل خواہشات کی اطاعت قبول کرلی۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے انسان میں ایک اور طاقت بھی رکھی تھی جس سے وہ نفسِ امارہ کا مقابلہ کرسکتا تھا۔ وہ غور کرتا کہ اس کے پاس جو زیورات ایک

شخص نے بطور امانت رکھے ہیں یہ اس کی ملکیت نہیں یہ تو امانت ہے جو حسبِ طلب اس کے مالک کو واپس کرنی ہوگی۔ اس امانت پر تصرف کرنے کا اسے کوئی حق حاصل نہیں مگر اس نے خواہشاتِ نفس کے تابع ہو کر یہ زیورات فروخت کر کے اپنے کچے مکان کو پختہ کرلیا یا اپنی بیوی کے لئے نئے زیورات خرید لئے۔ ٹیلی ویژن یا ریفریجریٹر حاصل کرلیا۔ اس طرح اس نے اپنی روح کو داغدار کر دیا۔ اس نے اپنی ساری زندگی اسی طرح بدعنوانیوں اور اخلاقی پستی میں گزار دی۔ جب وہ دنیا میں آیا تھا تو ایک پاک اور بے داغ روح لے کر آیا تھا مگر جب وہ دنیا سے رخصت ہوا تو اس کی روح گناہوں کی آلائشوں سے آلودہ ہو کر بالکل مسخ ہو چکی تھی، روح کی اسی حالت کو قرآن حکیم نفسِ امارہ سے تعبیر کرتا ہے۔ ہمارے عظیم فلسفی شاعر مرزا اسداللہ خاں غالبؔ نے اپنے اس شعر میں روح کے اسی فلسفہ کی حکیمانہ تفسیر کی ہے ؎

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

یعنی اللہ تعالیٰ نے مجھے دنیا میں ایک پاکیزہ روح دے کر بھیجا تھا' یہ روح اس کی امانت تھی۔ میرا فرض تھا کہ میں اس امانت میں خیانت نہ کرتا اور جس حالت میں اللہ تعالیٰ نے اسے میرے سپرد کیا تھا اسی حالت میں پاک وصاف روح اسے واپس کر دیتا مگر افسوس کہ دنیا کی آلائشوں اور نفسانی خواہشات سے مغلوب ہو کر میں نے اس امانت میں خیانت کی' گناہوں کی آلودگی سے اسے خراب کر دیا اور اب جبکہ میں یہ روح خدا کو واپس کر رہا ہوں تو اپنے آپ کو مجرم سمجھتا ہوں کیونکہ میں اس امانت کا حق ادا نہ کر سکا۔ یہ حق کب ادا ہوتا؟ جب روح نفسِ امارہ سے مغلوب نہ ہوتی بلکہ اس پر غلبہ حاصل کر کے پاکیزہ اور بے داغ رہتی جس کے نتیجے میں زندگی خود اپنے اور بنی نوع انسان کے لئے باعثِ خیر وفلاح بن جاتی۔ روح کے فلسفے کی یہ حقیقت افروز تشریح اور اخلاقِ انسانی کے ایک بنیادی نکتے کی اس سے بہتر اور حکیمانہ تفسیر شاید ہی کسی شاعر نے کی ہو۔

نفسِ لوّامہ

روح کا دوسرا درجہ وہ ہے جسے قرآن حکیم نفس لوامہ سے تعبیر کرتا ہے۔ یہ روح کی وہ حالت ہے جب خواہشاتِ حیوانی اور روح انسانی میں ایک کشمکش اور جنگ کی سی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ رذیل خواہشات اور گھٹیا جذبات انسان پر غلبہ پانے کی کوشش کرتے ہیں اور اکثر اوقات انسان ان سے مغلوب ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک شخص کوئی خوش نما عمارت دیکھ کر خود بھی ویسی ہی عمارت تعمیر کرنا چاہتا ہے مگر سرمایہ نہ ہونے کی وجہ سے وہ اپنی اس خواہش کو عملی جامہ نہیں پہنا سکتا۔ اس وقت اس کا نفسِ امارہ اسے اُبھارتا ہے کہ کسی غلط ذریعے سے روپیہ فراہم کرلو۔ نفسِ امارہ سے مغلوب ہو کر وہ رشوت، بلیک مارکیٹنگ یا اسمگلنگ کے ذریعے سے زرِ کثیر حاصل کرتا ہے اور ایک خوبصورت اور دلکش عمارت تعمیر کر لیتا ہے۔ اس طرح اس نے خواہشات حیوانی کی پیروی کی اور جس طرح ایک بیل یا گھوڑا جائز و ناجائز میں امتیاز کئے بغیر جس کی فصل میں چاہتا ہے گھس کر پیٹ بھرنا شروع کر دیتا ہے بالکل اسی طرح اس انسان نے حرام وحلال میں امتیاز کئے بغیر غلط ذرائع سے روپیہ فراہم کر کے معاشرے میں غلط کردار ادا کیا اور ایک ایسی عمارت تعمیر کی جس کی بنیادوں میں حرام کی کمائی ہے۔ اس نے اپنی اولاد کو بھی غلط راستہ دکھایا، اس نے اپنے نفس کو، دوسرے الفاظ میں اپنی روح کو داغ دار کر لیا، اس نے ناجائز اور حرام دولت سے ایک خوشنما اور وسیع عمارت تعمیر کر کے صرف ایک جرم کا ارتکاب نہیں کیا بلکہ اس عمارت کی شان وشوکت برقرار رکھنے اور اس کے پرتکلف لوازمات حاصل کرنے کے لئے اسے اور بھی بہت سی بددیانتیوں کا ارتکاب کرنا پڑا لیکن اس فعل کے بعد اس کے نفس نے اسے ملامت کی۔ اس نے محسوس کیا کہ اس سے بہت بڑا جرم سرزد ہوا بلکہ ایک نہیں وہ کئی جرائم کا مرتکب ہوا اس نے سارے معاشرے کو خراب کیا۔ ندامت، اعترافِ جرم اور ملامت کی اس کیفیت کا نام نفس لوامہ ہے۔ اللہ تعالیٰ قرآن حکیم میں روح کے اس درجے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ:۔

ولا اقسم بالنفس اللوامة ٥ (سورہ القیامہ آیت نمبر۲) ''اور میں قسم کھاتا ہوں اس نفس کی جو اپنے اوپر ملامت کرتا ہے''۔

اپنے اوپر ملامت کرنے والا یہ نفس جسے قرآن حکیم نفس لوامہ سے تعبیر کرتا ہے اس وقت بھی حرکت میں آیا تھا جب یہ شخص بددیانتی کا مرتکب ہو رہا تھا مگر اس وقت اس پر خواہشاتِ حیوانی کا غلبہ تھا اور نفسِ امارہ نے پوری طرح اسے اپنا تابع کر لیا تھا۔ گناہ سرزد ہونے کے بعد یہ نفس لوامہ پھر حرکت میں آیا اور خواہشاتِ حیوانی یا نفس امارہ پر غالب آ گیا۔ اس مرحلے پر اس نے گناہ سے توبہ کی' ان گناہوں کے اثرات کو زائل کرنے میں منہمک ہو گیا۔ اس نے ناجائز ذرائع سے حاصل کئے ہوئے مال یا جائیداد سے دست کشی اختیار کر لی' اسے خدا کی راہ میں دے ڈالا اور اسی مال یا جائیداد پر قناعت کر لی جو اس نے اپنی محنت اور جائز ذرائع سے حاصل کی تھی۔

ہر انسان میں نفسِ امارہ اور نفس لوامہ کے درمیان کشمکش کی یہ کیفیت ساری زندگی جاری رہتی ہے۔ کبھی نفسِ امارہ غالب آ جاتا ہے اور کبھی نفس لوامہ۔ جو لوگ اس کشمکش کے نتیجے میں مستقل طور پر نفس امارہ کے تابع ہو جاتے ہیں ان کا نفس لوامہ مغلوب ہو کر رہ جاتا ہے گویا ان کے ضمیر کی موت واقع ہو جاتی ہے مگر جو لوگ نفسِ امارہ سے جنگ جاری رکھتے ہیں ان کی اس جنگ کا آخری نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ہر قسم کے گناہوں کو کلی طور پر ترک کر دیتے ہیں اور صاف ستھری زندگی گزارنے لگتے ہیں' ایسی زندگی جس سے معاشرے میں توازن اور پاکیزگی پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ نتیجہ روح کی وہ کیفیت پیدا کرتی ہے جسے قرآن حکیم نفس لوامہ سے تعبیر کرتا ہے۔

نفسِ مطمئنہ

انسانی روح کا تیسرا اور آخری درجہ وہ حالت ہے جسے قرآن حکیم نفس مطمئنہ سے موسوم کرتا ہے۔ یہ روح انسانی کی معراج ہے' یہ معراج بڑے مجاہدے اور نفس امارہ سے طویل جنگ کے بعد حاصل ہوتی ہے۔ نفس مطمئنہ روح کی وہ حالت ہے جسے اسلام

اطمینان قلب کی کیفیت سے موسوم کرتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں انسان اپنے مقصدِ حیات کو پالیتا ہے۔ قرآن حکیم کا کمال یہ ہے کہ اس نے اپنی تعلیم میں انسانی نفس کے علم کو غیر معمولی اہمیت دی ہے اور اسلام کی ساری تعلیم نفسیاتِ انسانی کے گرد گھومتی ہے۔ قرآنِ حکیم پہلے تو ہمیں انسانی نفس کے اس نکتے کی طرف متوجہ کرتا ہے کہ روح بے عیب پیدا کی گئی ہے۔ (سورۃ الشمس آیت نمبر ۷) یعنی انسان پیدائشی طور پر برا نہیں ہوتا اگر اسے پاکیزہ ماحول میسر آ جائے، صاحبِ علم اور صاحبِ کردار اساتذہ اس کی صحیح رنگ میں تربیت کریں تو وہ دنیا میں عظیم الشان کارنامے سرانجام دے سکتا ہے اور اس کا ہر کارنامہ حیاتِ انسانی کے ہر شعبے میں علم وحکمت، دیانت و امانت، عفت وحیا اور خدا پرستی کا نور پھیلا سکتا ہے۔ اس کے بعد قرآن حکیم نفسِ انسانی کی دوسری حقیقت سے پردہ اٹھاتا ہے۔ چنانچہ فرماتا ہے:۔

فالهمها فجورها وتقولها ۝ (سورہ الشمس آیت ۸)

"اللہ تعالیٰ نے نفس انسانی میں بدی اور نیکی دونوں کا شعور القا کر دیا"۔

یعنی ہر انسان کی روح کو ایک ایسی طاقت عطا کی گئی ہے جو بھلائی اور برائی میں امتیاز کرتی ہے۔ فلاسفہ نے اسے عقل فعال سے موسوم کیا ہے چنانچہ فارابی "نصوص" میں روح کی ایک ایسی قوت کا اعتراف کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ودیعت کی جاتی ہے اور جس کا حواسِ ظاہری سے کوئی تعلق نہیں اور نہ یہ قوت حواس کے تابع ہوتی ہے۔ ابن سینا اسی نظریے کو اپنی کتاب "نجات" میں وسعت دے کر یوں بیان کرتا ہے کہ روح میں جو قوتیں پائی جاتی ہیں وہ دو قسم کی ہیں۔ ایک وہ قوت جس کا ادراک یعنی فکر اور سوچ سے تعلق ہے اور دوسری وہ قسم جس کا عمل سے تعلق ہے۔ ابنِ سینا کہتا ہے کہ انسان عقل کے ذریعے جو فیصلے کرتا ہے وہ حواس ظاہری کے محتاج نہیں ہوتے بلکہ انسانی روح میں یہ قوت اللہ تعالیٰ کی طرف سے پیدا کی جاتی ہے۔ پس یہ سارے فلسفیانہ نکات قرآن کریم کے اس ارشاد کی تفسیریں ہیں کہ ہر روح میں ایسی طاقت ودیعت کر دی گئی ہے جو خیر اور شر اور نیکی اور بدی میں امتیاز کر لیتی ہے۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسان کو نیکی اور بدی دونوں میں سے کوئی ایک

راستہ منتخب کرنے کا اختیار دے دیا گیا۔ جب تک وہ گناہ اور معصیت کے راستے پر گامزن رہتا ہے اس پر روح کی ادنیٰ حالت کا غلبہ رہتا ہے یعنی نفس امارہ اس پر حکومت کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ راستہ انسان نے خود اختیار کیا پھر جب اس میں اپنی اس اخلاقی پستی کا احساس پیدا ہوتا ہے اور اس کا ضمیر اسے ملامت کرتا ہے کہ وہ جو کچھ کرتا رہا یا کر رہا ہے غلط ہے تو اس حالت میں وہ نفس لوامہ کے تابع ہو جاتا ہے اور کوشش شروع کر دیتا ہے کہ نفس امارہ کی اس پست حالت سے نجات پا جائے۔ اس کوشش میں کبھی اسے کامیابی ہوتی ہے اور کبھی ناکامی۔ غرض اسی طرح کبھی گرتا اور کبھی اٹھتا وہ زندگی کا سفر طے کرتا رہتا ہے۔ روح کی یہ دوسری حالت جسے قرآن حکیم نفسِ لوامہ قرار دیتا ہے انسان کی خود اختیاری ہوتی ہے اور یہ پہلی اور ادنیٰ حالت سے بہتر ہوتی ہے کیونکہ اس میں انسان کو اپنے اندر پاکیزہ تبدیلی لانے کا خیال پیدا ہوتا ہے۔ پھر انسان پر ایک وقت ایسا آتا ہے جب وہ مکمل طور پر گناہوں سے توبہ کر لیتا ہے۔ اس کی زندگی اللہ تعالیٰ کی رضا کے تابع ہو جاتی ہے۔ اس کا مقصدِ حیات صرف اور صرف ایک ہوتا ہے کہ وہ جو قدم اٹھائے اس سے اللہ کی خوشنودی حاصل ہو اور اس کے بندوں کو نفع پہنچے۔ وہ علم حاصل کرتا ہے تو اس لئے کہ اس ذریعے سے اسے اللہ تعالیٰ کی ہستی کا عرفان اور اپنی ذات کا ادراک حاصل ہو اور وہ اپنے اندر پوشیدہ قوتوں اور صلاحیتوں کو بروئے کار لا سکے' اس علم سے وہ خلق اللہ کو فائدہ پہنچائے۔ اگر وہ تاجر ہے تو تجارت کو' اگر کاشتکار ہے تو زراعت کو' اگر اُستاد ہے تو علم کو' اگر مزدور ہے تو محنت کو انسانیت کی خدمت اور دین کی سربلندی کے لئے وقف کر دے۔ اس طرح معاشرہ امن و اماں' علم و فن' امانت و دیانت اور خوفِ خدا کا گہوارہ بن جاتا ہے۔ ایسے ہی لوگ ہیں جن کے بارے میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ "خلق اللہ ادم علی صورتہ"۔ (بخاری و مسلم) یعنی اللہ تعالیٰ نے آدم کو اپنی صورت پر پیدا کیا۔ حضرت امام غزالیؒ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس ارشادِ مبارک کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "اس حدیث میں حضور اکرمؐ نے صورت کا لفظ جسمانی صورت کے لئے استعمال نہیں فرمایا بلکہ اس سے حضورؐ کی مراد معنوی صورت ہے"۔ گویا جنابِ رسالت مآبؐ نے اپنے اس ارشادِ مقدس

میں انسانی روح کی ان کیفیات کی وضاحت کی ہے جو اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات اور اس کے افعال سے مناسبت رکھتی ہیں یعنی اللہ تعالیٰ نے انسان کی روح میں ایسے کمالات رکھے ہیں کہ اگر وہ انہیں بروئے کار لائے تو اس میں الٰہی صفات پیدا ہو سکتی ہے۔ وہ گناہوں سے بالکل محفوظ رہ سکتا ہے اور جس طرح اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کا سارے بہی خواہوں سے بڑھ کر بہی خواہ اور سارے محبت کرنے والوں سے بڑھ کر محبت کرنے والا ہے اسی طرح انسان بھی بنی نوع انسان کا سچا ہمدرد بن جاتا ہے اور اس کی روح پوری طرح روحِ الٰہی کے پرتو کے نیچے آ جاتی ہے۔ روح کا یہی وہ درجہ اور مرتبہ ہے جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ:

یایتها النفس المطمئنة ٥ ارجعی الی ربک راضیة مرضیة٥
فادخلی فی عبادی ٥ وادخلی جنتی٥ (سورۃ الفجر آیت ۲۷ تا ۳۰)

یعنی ''اے اطمینان پا جانے والی روح! تو اپنے رب کی طرف لوٹ آ اس حالت میں کہ تو اس سے راضی (ہے) اور وہ تجھ سے خوش۔ پس میرے بندوں میں شامل ہو کر میری جنت میں داخل ہو جا''۔

پس یہی وہ غرض ہے جو تخلیقِ کائنات کے وقت اللہ تعالیٰ کے پیش نظر تھی اور حیاتِ انسانی کا یہی وہ بلند درجہ اور ارفع مقام ہے جس کے حصول کے لئے انسان کو دنیا میں پیدا کیا گیا۔

....

حواشی:

(۱) علامہ ابن مسکویہؒ کی کتاب ''الفوز الاصغر'' کے اس حصے کا عربی متن اور ترجمہ مولانا شبلی نعمانی نے اپنے ایک مضمون مطبوعہ ''الندوہ'' (جون ۱۹۰۷ء) میں شائع کیا تھا۔ اس کے بعد مقالاتِ شبلی میں بھی شائع ہوا۔ یہ تلخیص اسی عبارت سے کی گئی ہے۔ (پیام)

(۲) عقلِ فعال سے مراد محض عقل یا عام عقل نہیں بلکہ وہ طاقت ہے جو عقل کو استعمال کرتی ہے۔ (پیام)

⌘⌘⌘

بانی جماعت احمدیہ کا
تصورِ خدا و کائنات

اب ہم جس موضوع پر اظہارِ خیال کر رہے ہیں اس کا بظاہر کتاب سے تعلق نظر نہیں آتا مگر درحقیقت اس کا کتاب سے بہت گہرا تعلق ہے، وہ اس طرح کہ کتاب کا نام ہے ''خدا اور کائنات''۔ خداوند تعالیٰ کی ہستی اور اس کائنات کے بارے میں مختلف ادوار میں پیدا ہونے والے مفکروں، دانشوروں اور عارفانِ حقیقت نے جو کچھ کہا اُسے تو ہم نے کتاب کا حصہ بنا دیا ہے مگر کتاب ختم ہونے کے بعد خیال آیا کہ جماعتِ احمدیہ کے بانی جناب مرزا غلام احمد صاحب قادیانی نے بھی تو اس موضوع پر بہت کچھ کہا ہے آخر اسے اس کتاب میں کیوں شامل نہ کیا جائے۔ یہ تو کوئی بات نہ ہوئی کہ محض اختلافِ عقائد کی بناء پر اُن کے افکار کو نظر انداز کر دیا جائے۔ یہ تو سراسر تعصب اور تنگ نظری ہے جس کا ارتکاب اگر دوسروں نے کیا تو ہم کیوں کریں۔ ماضی میں جناب مرزا صاحب کے افکار سے یہ سلوک محض اس لئے کیا گیا کہ لکھنے والے پر کہیں احمدیت یا قادیانیت کا لیبل نہ لگا دیا جائے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ ہماری طرح کا ہر وہ شخص جو فرقہ واریت سے بالا اور غیر جانبدار ہونے کے ساتھ ساتھ منصف مزاج بھی واقع ہوا ہو دل کے ہاتھوں یہ اعتراف کرنے پر مجبور ہو جائے گا کہ مرزا صاحب نے غیر معمولی دل و دماغ پایا تھا۔ وہ بہت زیرک، سلیم الفطرت اور نہایت ہی صاحبِ بصیرت شخص تھے۔ انہوں نے ایک نئے علمِ کلام کی بنیاد رکھی اور دنیائے علم و

معرفت کو بہت کچھ دیا بلکہ اپنے بعض افکار کے اعتبار سے تو وہ منفرد حیثیت کے حامل تھے' اس کی چند مثالیں :۔

وجودِ باری تعالیٰ پر بحث و گفتگو کرتے ہوئے جب خدا پرستوں کی طرف سے یہ دلیل دی گئی کہ ہر چیز کا ایک خالق یا تخلیق کرنے والا ہوتا ہے' گویا کوئی چیز اُس وقت تک عالمِ وجود میں نہیں آ سکتی جب تک اسے وجود میں لانے والا موجود نہ ہو —— پس ثابت ہو گیا کہ اتنی وسیع و عریض کائنات —— اور عجائب سے پر اور منظم ترین کائنات کو وجود میں لانے والا کوئی ضرور ہے ورنہ یہ کیسے وجود میں آ گئی —— اس دلیل پر منکرینِ خدا کی طرف سے یہ اعتراض کیا گیا کہ اگر ایسا ہی ہے یعنی ہر چیز کا ایک خالق ہونا چاہئے اور کوئی چیز بغیر بنائے نہیں بن سکتی تو پھر خدا کا خالق بھی تسلیم کرنا پڑے گا' بتاؤ اس کا خالق کون ہے؟ یہ دلیل بظاہر اتنی معقول اور مضبوط تھی کہ آج تک اُسے کوئی نہ توڑ سکا۔ یہ سعادت مرزا صاحب کے حصے میں آئی' اُنہوں نے اس دلیل کو توڑ دیا' اس کا جواب دیا اور ایسا جواب دیا جس نے منکرینِ خدا کو لاجواب کر دیا۔ موصوف نے اپنی کتاب ''سرمۂ چشمِ آریہ'' میں اس موضوع پر جو مدلل بحث کی اُس کا خلاصہ یہ ہے کہ..... ''جب ہم کہتے ہیں کہ ہر چیز کا ایک موجد یا خالق ہوتا ہے تو اس سے مراد ہمارے اس عالم میں پائی جانے والی اشیاء ہوتی ہیں۔ گویا یہ دلیل فقط موجوداتِ عالم کے متعلق ہے یعنی ان چیزوں کے متعلق ہے جو ہمارے اس عالم میں داخل ہیں مگر خداوند تعالیٰ تو اس عالم میں پائی جانے والی اشیاء سے باہر ہے' وہ ہمارے اس عالم کی اشیاء میں سے تو نہیں ہے کہ اس پر بھی اس دلیل کا اطلاق کیا جائے پس اس کا خالق تجویز کرنا تو غایت درجے کی وحشیانہ جہالت ہے۔ (سرمۂ چشمِ آریہ صفحہ ۱۶۳ اور ۱۶۴ کا حاشیہ مطبوعہ ریاضِ ہند پریس امرتسر)۔

مرزا صاحب نے یہ بصیرت افروز دلیل دینے کے بعد بات کو آگے بڑھاتے ہوئے ہستیٔ باری تعالیٰ پر ایک اور مضبوط ترین دلیل مہیا کر کے خدا پرستوں کے ہاتھوں میں ایسا حربہ اور ہتھیار دے دیا جس سے ان کے ہاتھ اب تک خالی تھے۔ اپنی اسی کتاب ''سرمۂ چشمِ آریہ'' میں اُنہوں نے لکھا کہ..... ''(ہمارے) اس خالقِ حقیقی کے لئے کوئی اور خالق (تو) تب تجویز کیا جائے جب اول کوئی اس کے سر پر دعوے دار اُٹھے کہ میں اس کا خالق

ہوں اور وہ اس (ہمارے خالق حقیقی) کو مغلوب اور محکوم کر کے دکھلاوے۔'' (''سرمہ چشم آریہ'' صفحہ ۱۶۷ اور ۱۶۸)۔

ان دو تین سطروں میں مرزا صاحب موصوف نے خدا کے وجود پر جو محکم دلیل پیش کی ہے اس کی تشریح یوں کی جاسکتی ہے کہ ـــــ جب سے دنیا میں وحی والہام کا سلسلہ شروع ہوا ہے اس وقت سے لے کر ہمارے آقا و مولیٰ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک خداوند تعالیٰ نے ہر نبی کے ذریعے یہ اعلان فرمایا کہ میں (اللہ) اس کائنات اور اس میں پائی جانے والی ہر چیز کا خالق ہوں، میرا خالق کوئی نہیں ہے۔ اگر ہمارے اس خالقِ حقیقی کا بھی کوئی خالق ہوتا تو وہ ضرور اعلان کرتا کہ میں اس کا خالق ہوں مگر ہزاروں سال گزر جانے کے باوجود کسی طرف سے یہ دعویٰ نہیں کیا گیا، کسی نے ایسا اعلان نہیں کیا کہ میں اس خدا کا خالق ہوں پس ثابت ہوا کہ اس کا کوئی خالق نہیں کیونکہ اگر وہ موجود ہوتا تو ضرور میدان میں آتا، ضرور Claim کرتا اور وہ آج بھی زندہ اور موجود ہوتا۔

یہ عجیب وغریب اور ناقابلِ شکست عقلی دلیل دے کر مرزا صاحب نے منکرینِ خدا کا آخری حربہ بھی توڑ دیا۔ اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے خدا کا وجود ثابت کرنے کے لئے اُسے فلسفیوں یا عقلیت کے علمبرداروں کا محتاج نہیں رکھا یعنی ایسا نہیں کہ اگر خدا کی ہستی کے عقلی دلائل نہ دیئے جائیں تو اس کا وجود ہی ثابت نہیں ہوگا۔ اس سلسلے میں مرزا صاحب نے ایک عجیب اور باریک در باریک نکتے کی طرف اہل فکر ونظر کی رہنمائی کی، موصوف نے لکھا کہ:

''عقل کسی چیز کی نسبت یہ حکم (تو) دے سکتی ہے کہ اس چیز کا ہونا ضروری ہے یا یہ چیز ''ہونی چاہیے'' مگر ایسا حکم ہرگز نہیں دے سکتی کہ واقعہ میں یہ چیز ''ہے بھی''ـــــ اور کسی امر کی نسبت انسان کا علم ''ہونا چاہیئے'' کے مرتبے سے ترقی کر کے ''ہے'' کے مرتبے تک اس وقت پہنچ سکتا ہے جب عقل کے ساتھ کوئی دوسرا رفیق بھی شامل ہو جائے کیونکہ عقل صرف ضرورتِ شئے کو ثابت کرتی ہے خود (اُس) شئے کو ثابت نہیں کر سکتی اور ظاہر ہے کہ کسی شئے کی ضرورت کا ثابت ہونا امرِ دیگر ہے اور خود اُس شئے کا ثابت ہونا امرِ دیگر...... اور یہ اس وقت ثابت ہوسکتا ہے جب اس کے ساتھ الہام اور وحی بھی ہو......''

("براہین احمدیہ" از روحانی خزائن۔ جلد نمبر ا ص ۷۸)

اس طرح مرزا صاحب اہل فکر ونظر کو اس حقیقت سے آگاہ کر رہے ہیں کہ خداوند تعالیٰ عقلی دلیلوں کا محتاج نہیں اور نہ صرف مجرد عقل سے اس کا عرفان حاصل ہو سکتا ہے۔ اگر اسے تلاش کرنا اور اس کی حقیقی معرفت حاصل کرنی ہے تو وحی والہام کی روشنی میں تلاش کرو یعنی خداوند تعالیٰ کے فرستادوں اور اس کے مامورین نے اس کے بارے میں جو حقائق اور عارفانہ نکات بیان کئے ہیں ان سے راہنمائی حاصل کرو تم خدا کو پالو گے۔

دنیا اور اس کی عمر

خداوند تعالیٰ کی ہستی کے بعد ہماری یہ کائنات اور اس کی عمر کا مسئلہ فلسفیوں اور مفکروں کے درمیان مدت سے زیرِ بحث و گفتگو ہے مگر ان میں سے وہی لوگ حقیقت تک پہنچنے میں کامیاب ہو سکے جنہوں نے رسولِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشادِ گرامی سے روشنی حاصل کی۔ ہماری مراد اس حدیث سے ہے جس میں حضورِ انور نے فرمایا ہے کہ "عمرِ دنیا سات ہزار سال ہے"۔ مرزا صاحب نے اسی حدیث سے روشنی حاصل کی اور نہ صرف دنیا کی عمر متعین کی بلکہ اس حدیث پر وارد ہونے والے اس اعتراض کو بھی دور کر دیا کہ یہ عقل اور سائنس کے خلاف بات ہے یعنی یہ بات کہ دنیا صرف چھ ہزار سال قبل عالم وجود میں آئی تھی۔ انہوں نے اس حدیث کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا کہ حضورؐ نے دنیا کی عمر سات ہزار سال مقرر فرما کر ہماری اس کائنات کی عمر مقرر نہیں فرمائی کیونکہ یقیناً آپؐ جانتے تھے کہ ہماری اس کائنات کی عمر تو اربوں سال ہے جس کا حقیقی علم صرف خداوند تعالیٰ کے پاس ہے۔ مرزا صاحب نے اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے یہ عجیب ولطیف عارفانہ نکتہ بیان کیا کہ دنیا کی سات ہزار سال عمر مقرر فرما کر حضورؐ اقدس نے دراصل ہماری موجودہ نسل اور اس کی تہذیب کی عمر مقرر فرمائی ہے "یعنی حضرتِ آدمؑ کی پیدائش سے لے کر (جسے چھ ہزار سال گزرے ہیں) قیامت کی آمد تک یہ عمر سات ہزار سال ہے"۔

(تحفۂ گولڑویہ' ص ۱۶۹' ناشر بک ڈپو تالیف واشاعت قادیان)

اور مرزا صاحب کی وضاحت کے مطابق "قیامت" سے حضورِ اقدس کی مراد اس

کائنات کا خاتمہ نہیں بلکہ قیامتِ صغریٰ مراد تھی جس کے رونما ہونے کے بعد موجودہ نسلِ انسانی اور اس کی تہذیب کا (بہت حد تک) خاتمہ ہو جائے گا۔ گویا اس کے بعد ایک نئے دور کا آغاز ہو گا اور نئی نسل اور نئی تہذیب جنم لے گی۔ مرزا صاحب نے جمع و تفریق کر کے ہمیں بتایا کہ موجودہ نسلِ انسانی اور اس کی تہذیب کے خاتمے میں قریباً ایک ہزار سال باقی رہ گئے ہیں یعنی اس کے بعد کوئی بہت بڑا عالم گیر حادثہ رونما ہو گا (جو ایٹمی جنگ بھی ہو سکتی ہے۔ مولف) جس کے نتیجے میں دنیا پر بہت بڑی تباہی آئے گی اور اس کا بہت بڑا حصہ فنا ہو جائے گا جس کے آثار صاف نظر آ رہے ہیں۔ اس کو مرزا صاحب ''دنیا کی ایک بڑی تبدیلی'' اور قیامتِ صغریٰ قرار دے رہے ہیں۔

زمین کی گولائی

یہ کرۂ ارض جس پر ہم زندگی گزارتے ہیں اس کائنات میں مرکزی حیثیت رکھتا ہے یہی وجہ ہے کہ اس کے بارے میں سب سے زیادہ غور و فکر اور تحقیق کی گئی اور اس کی شکل وصورت اور ہیئت سے متعلق مختلف نظریات پیش کیے گئے۔ جناب مرزا صاحب نے بھی ہماری زمین کو موضوعِ فکر بنایا۔ مرزا صاحب اگرچہ جغرافیہ داں نہیں تھے نہ معروف معنی میں سائنس داں تھے مگر حیرت ہوتی ہے کہ زمین کے بارے میں انہوں نے بہت ہی فکر انگیز نکات پیش کیے۔ مرزا صاحب نے غور و فکر کے بعد یہ نظریہ قائم کیا کہ زمین گول ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ یہ کوئی نئی بات نہیں اس سے قبل بعض سائنس داں بھی یہ نظریہ پیش کر چکے تھے ـــــ مگر مرزا صاحب نے اپنی فکر کی بنیاد ماضی کے سائنس دانوں یا جغرافیہ دانوں پر نہیں رکھی بلکہ اپنے وجدان، اپنے مشاہدے اور خداداد بصیرت سے کام لے کر اس مسئلے کے بعض منفرد پہلوؤں سے دُنیا کو روشناس کروایا۔ مرزا صاحب کی تھیوری یہ تھی کہ ہماری یہ ساری کائنات گولائی کی طرف مائل ہے اور اس کائنات کی ہر بنیادی شے گول ہے۔ مثال کے طور پر وہ کہتے ہیں کہ سورج گول ہے، چاند گول ہے، تمام سیارے گول ہیں، پانی کا قطرہ بھی گول ہے حتیٰ کہ ہوا بھی گولائی کی طرف مائل ہے چنانچہ مرزا صاحب لکھتے ہیں (اُن کے اپنے الفاظ میں) ..... ''اور ہوا کی شکل بھی گول ہے جیسا کہ ہوائی گولے جن کو عربی میں

اعصار کہتے ہیں یعنی بگولے جو کسی تند ہوا کے وقت مدور شکل میں زمین پر چکر کھاتے پھرتے ہیں ہوا کی کرویت (گولائی) ثابت کرتے ہیں۔ (تحفہ گولڑویہ صفحہ ۲۱۷ کا حاشیہ)

مرزا صاحب کی اس تھیوری کی تشریح کرتے ہوئے ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ سمندر میں پیدا ہونے والا بھنور جو کوہ پیکر جہازوں کو بھی اپنی گرفت میں لے کر نگل جاتا ہے وہ بھی گول (چکردار) ہوتا ہے۔ پہاڑوں میں پھوٹنے والے چشمے بھی گول ہوتے ہیں' کنویں بھی گول ہوتے ہیں جن پر ہماری زندگی کا بلکہ ہر ذی حیات کی زندگی کا انحصار ہے حتیٰ کہ دنیا کی صنعتی اور معاشی ترقی بھی گولائی ہی سے وابستہ ہے چنانچہ بنی نوع انسان نے ترقی کے میدان میں اس وقت قدم رکھا جب پہیہ ایجاد ہوا (جو گول ہوتا ہے) اس سے پہلے دنیا جہالت اور پسماندگی کی تاریکی میں بس رہی تھی بلکہ سسک رہی تھی۔ پس مرزا صاحب نے ان نظائر اور حقائق کی روشنی میں یہ نتیجہ نکالا کہ ہماری زمین بھی گول ہے اور ان کا یہ دعویٰ بلاشبہ اس لیے درست اور قابلِ قبول ہے کہ اس کی بنیاد عقل وفکر اور اس بصیرت پر ہے جو اللہ تعالیٰ نے انہیں عطا فرمائی تھی' اس کا نام حقیقی سائنس ہے۔

آسمان کی حقیقت

زمین کے بعد آسمان اور اس کے عجائب انسان کے ذہن کو دعوتِ فکر دے رہے ہیں اور بلاشبہ ہمارے مفکروں' فلاسفروں اور سائنس دانوں نے زمین کی طرح آسمان کے بارے میں بھی بہت غور وفکر کیا' بہت گہرائی میں جا کر تحقیق کی' علم الافلاک کی سیکڑوں شاخیں اس کا ثبوت ہیں۔ مرزا صاحب نے بھی آسمان کو اپنی فکر کا موضوع بنایا مگر انہوں نے مجرد سائنس سے رہنمائی حاصل کرنے کی بجائے قرآن سے روشنی حاصل کی اور عجیب در عجیب حقائق بیان کیے مثلاً مرزا صاحب شاید پہلے صاحبِ بصیرت ہیں جنہوں نے قرآن شریف کی آیت (**وزینا السماء الدنیا بمصا بیح و حفظاً**۔ حم السجدۃ آیت ۱۲) میں لفظ ''حفظاً'' سے یہ حقیقت افروز اور پر معارف استدلال کیا کہ اللہ تعالیٰ نے ستاروں کو صرف آسمان کی زینت اور اہل دنیا کے لئے روشنی کا سبب نہیں بنایا بلکہ ان کے ذریعے سے ہماری اس دنیا کی حفاظت کا سامان بھی فراہم کر دیا۔ (تحفہ گولڑویہ صفحہ ۲۸۲ کا حاشیہ)۔

چنانچہ مرزا صاحب نے زمانہ قدیم کے بعض حکماء کے حوالہ سے لکھا ہے کہ ابتدا میں زمین بہت ناہموار تھی (یعنی ہمارا یہ کرۂ ارض انسانوں حتیٰ کہ حیوانوں کے بھی رہنے کے قابل نہ تھا بلکہ جاندار نہ اس میں پیدا ہو سکتے تھے نہ زندگی گزار سکتے تھے) مرزا صاحب لکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ستاروں کی تاثیر کے ذریعے اسے (زمین کو) ہموار کیا۔ مرزا صاحب ستاروں کی تاثیر کو ایک فلسفہ کی صورت میں پیش کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ''اللہ تعالیٰ نے آسمان کو (جو) لاکھوں ستاروں سے پُر کیا ہے آخر انسان کو اس سے کیا فائدہ؟ جبکہ خداوند تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم نے ہر چیز کو انسان کے فائدے کے لئے پیدا کیا ہے۔ پس اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان چیزوں (یعنی ستاروں یا سیاروں) میں خاص تاثیرات ہیں جو انسانی زندگی اور انسانی تمدن پر اپنا اثر ڈالتی ہیں۔ (تحفۂ گولڑویہ صفحہ ۲۸۳) مرزا صاحب ستاروں کی تاثیر کا انکار کرنے والوں کو تنبیہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ''اُس انسان سے زیادہ کوئی دنیا میں جاہل نہیں جو بنفشہ اور نیلوفر...... اور خیار شنبر (املتاس) کی تاثیرات کا تو قائل ہے مگر ان ستاروں کی تاثیرات کا منکر ہے جو قدرت کے ہاتھ کے اول درجے پر تجلی گاہ اور مظہر العجائب ہیں جن کی نسبت خود خدا تعالیٰ نے ''حفظاً'' کا لفظ استعمال کیا ہے''۔

آسمان کا ایک اور پہلو جواب تک ہماری نگاہوں سے اوجھل تھا مرزا صاحب کی باریک بینی اور فراست کی بدولت منظر عام پر آیا' وہ یہ کہ اب تک عامۃ الناس تو کیا بڑے بڑے ماہرِ فلکیات سمجھتے تھے اور سمجھتے ہیں کہ ستاروں سے صرف وہ آسمان مزین ہے جو ہمیں ظاہری آنکھ سے نظر آتا ہے۔ مرزا صاحب نے اس نظریئے کو کلیتہً رد کر دیا کہ یہ ستارے صرف ہمارے آسمان پر واقع ہیں۔ انہوں نے یہ نظریہ پیش کیا کہ ستارے ہر آسمان پر موجود ہیں اور ان سے کوئی آسمان خالی نہیں۔ مثال کے طور پر مرزا صاحب مشہور سیارے ''زحل'' کا مقام ساتواں آسمان قرار دیتے ہیں اور اس کے لئے وہ یہ دلیل دیتے ہیں کہ عربی لغت میں لفظ ''زحل'' کے معنی ہی اُس شے کے ہیں جو بہت دور واقع ہوئی ہو اور ظاہر ہے کہ ساتویں آسمان سے آگے کچھ نہیں ہے۔ بلاشبہ یہ بڑی وزنی دلیل ہے جسے توڑا نہیں جا سکتا۔

مرزا صاحب ان لوگوں کو جاہل قرار دیتے ہیں جو آسمان کے بارے میں یہ کہتے

ہیں کہ یہ صرف حدِ نگاہ کا نام ہے اس سے زیادہ اس کی کچھ حقیقت نہیں۔ یہاں بھی وہ قرآن حکیم سے روشنی حاصل کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اگر آسمان کی کوئی حقیقت نہیں ہے اور ستاروں کا انسانوں کی زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہے تو خداوند تعالیٰ نے یہ کیوں فرمایا ''**یذکرون اللّٰہ قیاما و قعودا و علی جنوبھم و یتفکرون فی خلق السموات والارض ربنا ما خلقت ھذا باطلا**'' (آلِ عمران آیت ۱۹۱) یعنی ''مومن لوگ وہ ہیں جو خدائے تعالیٰ کو کھڑے اور بیٹھے اور اپنے بستروں پر لیٹے ہوئے یاد کرتے ہیں اور جو کچھ زمین اور آسمان میں عجائب صنعتیں موجود ہیں اُن پر غور وفکر کرتے رہتے ہیں اور جب (یہ) لطائفِ صنعتِ الٰہی ان پر کھلتے ہیں تو کہتے ہیں کہ خدایا! تو نے ان صنعتوں کو بے کار پیدا نہیں کیا''۔ مرزا صاحب اس حکیمانہ آیت سے استدلال کرتے ہیں کہ آسمان اور ان میں واقع ستارے حیرت انگیز صنعتوں سے بھرے پڑے ہیں اور زمین اور اُس کے رہنے والوں پر پڑنے والی تاثیرات کا منبع ہیں ان میں اللہ تعالیٰ کی عجیب تر عجیب حکمتیں پوشیدہ ہیں جو اپنے وقت پر کھلتی رہیں گی۔

آگے چل کر مرزا صاحب کہتے ہیں کہ آسمان سے وہ لطیف طبقات مراد ہیں جو اپنے خواص کے ساتھ ایک دوسرے سے مختلف اور ممتاز ہیں۔ مرزا صاحب ان میں سے ہر آسمان کو ستاروں کی قرار گاہ ٹھہراتے ہیں اور یہ نظریہ پیش کرتے ہیں کہ ان میں ذی حیات اور ذی روح مخلوق موجود ہے۔ (''سرمۂ چشم آریہ'' صفحہ ۸۷ کا حاشیہ) ــــ اور کیا عجب کہ مستقبلِ قریب میں اس کا مشاہدہ بھی ہو جائے۔

روح کے حقائق

انسانی نظروں سے پوشیدہ امور میں روح وہ حقیقت ہے جس کے عدم اور وجود کے بارے میں صدیوں سے بحث جاری ہے۔ مرزا صاحب نے اس بحث میں حصہ لے کر روح کو نہ صرف ایک دائمی حقیقت ثابت کیا بلکہ اس کے ایسے ایسے عجائبات بیان کئے جو علم و دانش میں تو اضافہ کرتے ہی ہیں اس کے ساتھ ساتھ ان سے اللہ تعالیٰ کی ہستی پر ایمان بھی مستحکم ہو جاتا ہے۔ سب سے پہلے تو مرزا صاحب اس نظریے کو رد کرتے ہیں کہ روحیں بھی

ہیں کہ یہ صرف حدِ نگاہ کا نام ہے اس سے زیادہ اس کی کچھ حقیقت نہیں۔ یہاں بھی وہ قرآن حکیم سے روشنی حاصل کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اگر آسمان کی کوئی حقیقت نہیں ہے اور ستاروں کا انسانوں کی زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہے تو خداوند تعالیٰ نے یہ کیوں فرمایا **''یذکرون اللّٰہ قیاما و قعودا و علی جنوبھم و یتفکرون فی خلق السموات والارض ربنا ما خلقت ھذا باطلا''** (آلِ عمران آیت ۱۹۱) یعنی ''مومن لوگ وہ ہیں جو خدائے تعالیٰ کو کھڑے اور بیٹھے اور اپنے بستروں پر لیٹے ہوئے یاد کرتے ہیں اور جو کچھ زمین اور آسمان میں عجائب صنعتیں موجود ہیں اُن پر غور وفکر کرتے رہتے ہیں اور جب (یہ) لطائفِ صنعتِ الٰہی ان پر کھلتے ہیں تو کہتے ہیں کہ خدایا! تو نے ان صنعتوں کو بے کار پیدا نہیں کیا''۔ مرزا صاحب اس حکیمانہ آیت سے استدلال کرتے ہیں کہ آسمان اور ان میں واقع ستارے حیرت انگیز صنعتوں سے بھرے پڑے ہیں اور زمین اور اُس کے رہنے والوں پر پڑنے والی تاثیرات کا منبع ہیں ان میں اللہ تعالیٰ کی عجیب تر عجیب حکمتیں پوشیدہ ہیں جو اپنے وقت پر کھلتی رہیں گی۔

آگے چل کر مرزا صاحب کہتے ہیں کہ آسمان سے وہ لطیف طبقات مراد ہیں جو اپنے خواص کے ساتھ ایک دوسرے سے مختلف اور ممتاز ہیں۔ مرزا صاحب ان میں سے ہر آسمان کو ستاروں کی قرارگاہ ٹھہراتے ہیں اور یہ نظریہ پیش کرتے ہیں کہ ان میں ذی حیات اور ذی روح مخلوق موجود ہے۔ (''سرمۂ چشم آریہ'' صفحہ ۸۷ کا حاشیہ) — اور کیا عجب کہ مستقبلِ قریب میں اس کا مشاہدہ بھی ہو جائے۔

روح کے حقائق

انسانی نظروں سے پوشیدہ امور میں روح وہ حقیقت ہے جس کے عدم اور وجود کے بارے میں صدیوں سے بحث جاری ہے۔ مرزا صاحب نے اس بحث میں حصہ لے کر روح کو نہ صرف ایک دائمی حقیقت ثابت کیا بلکہ اس کے ایسے ایسے عجائبات بیان کئے جو علم و دانش میں تو اضافہ کرتے ہی ہیں اس کے ساتھ ساتھ ان سے اللہ تعالیٰ کی ہستی پر ایمان بھی مستحکم ہو جاتا ہے۔ سب سے پہلے تو مرزا صاحب اس نظریے کو رد کرتے ہیں کہ روحیں بھی

اپنے خالق کی طرح دائمی ہیں اور اُنہیں خداوند تعالیٰ نے پیدا نہیں کیا۔ مرزا صاحب کہتے ہیں کہ اگر یہ نظریہ درست تسلیم کر لیا جائے تو لازم آئے گا کہ خدا روحوں کی حقیقت اور اس کے خواص سے بھی قطعاً بے خبر اور لاعلم ہے کیونکہ جس چیز کا وہ خالق ہی نہیں اُس کی حقیقت اور باریکیوں سے کیسے آگاہ ہوسکتا ہے؟ اس طرح اُس کا علم بھی ناقص ٹھہرے گا۔ دوسری بات یہ کہ اُس کا روحوں پر تسلط بھی ناجائز قرار دینا پڑے گا کیوں کہ جو چیز اُس نے پیدا ہی نہیں کی نہ کسی اور سے حاصل کی اُس کا مالک وہ کیسے بن بیٹھا؟ تیسری خرابی یہ ہوگی کہ وہ روحوں کا محتاج بھی ثابت ہوگا یعنی اگر روحیں اُس کی تخلیق نہ ہوتیں اور اتفاقاً اُس کے ہاتھ نہ لگ جاتیں تو وہ یہ کارخانۂ عالم ہرگز نہیں چلا سکتا تھا— اور آخری بات یہ کہ اگر یہ روحیں اُس کے قبضے سے نکل جائیں تو اس کا یہ سارا کاروبار ٹھپ ہو کر رہ جائے گا کیوں کہ وہ مزید روحیں تو پیدا نہیں کر سکے گا پھر کیا کرے گا اور اپنی خدائی کا کارخانہ کیسے چلائے گا؟ اس طرح مرزا صاحب نے اس نظریے کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دیں اور ثابت کیا کہ اس کائنات اور اس میں پائی جانے والی ہر چیز کی طرح روحوں کا بھی اللہ تعالیٰ ہی خالق ہے۔

مرزا صاحب روح کے مخلوق ہونے کی ایک بڑی موثر اور لطیف دلیل دیتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ اگر روح خدا کی تخلیق نہ ہوتی تو اُس میں خدا کی طرف کشش بھی ہرگز نہ ہوتی۔ آخر ہمارا دل بے اختیار خدا تعالیٰ کی طرف کیوں کھنچتا ہے؟ اسی لیے کھنچتا ہے کہ ہماری روح خدا تعالیٰ کے دستِ قدرت سے نکلی ہے اس لیے اپنے پیدا کرنے والے سے ایک خاص تعلق رکھتی ہے۔ مرزا صاحب اپنے دعوے کی دلیل دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ ''جس طرح بیٹے میں باپ اور ماں کا کچھ حلیہ اور خوبی پائی جاتی ہے اسی طرح روحیں جو خدا تعالیٰ کے ہاتھ سے نکلی ہیں اپنے صانع کی سیرت اور خصلت سے اجمالی طور پر کچھ حصہ رکھتی ہیں، اگرچہ مخلوقیت کی ظلمت اور غفلت غالب ہونے کی وجہ سے بعض نفوس میں وہ رنگِ الٰہی پھیکا سا ہو جاتا ہے لیکن اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ ہر یک روح کسی قدر وہ رنگ اپنے اندر رکھتی ہے اور پھر بعض نفوس میں وہ رنگ بداستعمالی کی وجہ سے بدنما معلوم ہوتا ہے مگر یہ اس رنگ کا قصور نہیں بلکہ طریقۂ استعمال کا قصور ہے''۔

آگے چل کر مرزا صاحب اپنی دلیل کو ایک نئے رنگ سے دُہراتے ہیں اور کہتے

ہیں کہ ''حقیقت میں انسان کو جس قدر قوتیں دی گئی ہیں وہ سب الٰہی قوتوں کے اظلال اور آثار ہیں جیسے بیٹے کی صورت میں کچھ کچھ باپ کے نقوش آ جاتے ہیں ایسا ہی ہماری روحوں میں اپنے رب کے نقوش اور صفات کے آثار آ گئے ہیں اور جیسے بیٹا جو باپ سے نکلا ہے اُس سے ایک طبعی محبت رکھتا ہے نہ بناوٹی' اسی طرح ہم بھی جو اپنے رب سے نکلے ہیں اُس سے فی الحقیقت طبعی محبت رکھتے ہیں نہ بناوٹی''۔ (''سرمۂ چشم آریہ'' ص ۱۲۱۔۱۲۲ از روحانی خزائن جلد نمبر ۲)۔

مرزا صاحب روح اور جسم کا آپس میں بہت گہرا تعلق ثابت کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ایک کے بغیر دوسرے کا وجود ہی ناممکن ہے' جسم روح کے بغیر اور روح جسم کے بغیر لاشئے محض ہیں۔ مرزا صاحب اس نظریئے کی سختی سے تردید کرتے ہیں کہ روح کہیں باہر سے آ کر جسم میں داخل ہو جاتی ہے۔ ان کی تھیوری یہ ہے کہ روح نطفے کے اندر ہی موجود ہوتی ہے چنانچہ موصوف کہتے ہیں کہ —— ''روح ایک لطیف نور ہے جو اس جسم کے اندر ہی سے پیدا ہو جاتا ہے جو رحم میں پرورش پاتا ہے۔ پیدا ہونے سے مراد یہ ہے کہ اول مخفی اور غیر محسوس ہوتا ہے پھر نمایاں ہو جاتا ہے اور ابتداء اس کا خمیر نطفے میں موجود ہوتا ہے۔ بے شک وہ آسمانی خدا کے ارادہ سے اور اس کے اذن اور اس کی مشیت سے ایک مجہول الکنہ علاقہ کے ساتھ نطفہ سے تعلق رکھتا ہے اور نطفہ کا وہ ایک روشن اور نورانی جوہر ہے —— بلکہ وہ ایسا نطفہ میں مخفی ہوتا ہے جیسا کہ آگ پتھر کے اندر ہوتی ہے''۔ (''اسلامی اُصول کی فلاسفی'' ص ۹'۱۰۔ مطبوعہ اسلام انٹرنیشنل پبلی کیشنز لمیٹڈ اسلام آباد Tilford Surrey انگلستان)

مرزا صاحب ہمارے اس مادی جسم کو تو فانی قرار دیتے ہیں مگر روح کو فانی تسلیم نہیں کرتے اور کہتے ہیں کہ روح ہمارے اس فانی بدن سے جدا ہو کر ایک اور بدن اختیار کر لیتی ہے جو اس کے اعمال اُس کے لیے تیار کرتے رہتے ہیں' اچھی اور نیک روح کو پاک اور لطیف بدن ملتا ہے اور خبیث روح کو کثیف اور خبیث بدن ملتا ہے۔ یہی بدن یا جسم ان کے لیے جنت اور دوزخ بن جاتے ہیں۔ گویا اپنی جنت اور جہنم روحیں اپنے ساتھ رکھتی ہیں جو حشر اجسام کے بعد دائمی جنت اور (کسی حد تک) دائمی دوزخ میں قرار پکڑیں گی۔

ایک اور لطیف بحث مرزا صاحب نے روح کی پیدائش کے بارے میں کی ہے یعنی اسے کس طرح پیدا کیا گیا اور کس چیز سے پیدا کیا گیا؟ موصوف معرفت کا ایک جدید اور عجیب نکتہ بیان کرتے ہیں اور تمام ناپید چیزوں کی پیدائش کو دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں ''خلق'' اور ''امر''۔ جو اشیاء ایسے طور سے پیدا کی گئیں کہ اپنی پیدائش سے پہلے کسی اور صورت میں اپنا وجود رکھتی تھیں انہیں مرزا صاحب ''خلق'' سے تعبیر کرتے ہیں اور جو چیزیں عدم سے وجود میں لائی گئیں انہیں ''امر'' سے تعبیر کرتے ہیں۔ (''سرمۂ چشمِ آریہ'' ص ۱۲۶، ۱۲۷)۔ روح کے بارے میں ان کا یہ نظریہ ہے کہ روح پہلے سے کسی اور صورت میں موجود نہیں تھی بلکہ اللہ تعالیٰ اسے عدم سے وجود میں لایا اس لیے روح اللہ تعالیٰ کے ''امر'' میں سے ہے۔ وہ اس آیت سے استدلال کر کے اپنے دعوے کا ثبوت پیش کرتے ہیں کہ ''قل الروح من امر ربی'' (بنی اسرائیل آیت ۸۵) یعنی (اے میرے رسولؐ) ''ان سے کہہ دے کہ روح میرے امر میں سے ہے'' اور چونکہ روح عدم سے وجود میں آئی ہے اس لئے فنا بھی نہ ہوگی بلکہ عدم کی طرف چلی جائے گی جہاں خداوند تعالیٰ نے اس کی قرارگاہ متعین کر رکھی ہے۔

جناب مرزا صاحب نے روح کے اس لطیف پہلو پر جو عارفانہ بحث کی ہے اس سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ جو چیزیں ہمارے اس عالمِ فانی میں تخلیق ہوئی ہیں وہ فنا ہو جائیں گی اور جو عدم سے آئی ہیں وہ فنا نہیں ہوں گی کیونکہ وہ ہمارے اس عالمِ فانی کی تخلیق نہیں ہیں۔ روح بھی اس عالمِ فانی کی تخلیق نہیں ہے بلکہ یہ امرِ ربی کے طور پر عدم سے آئی ہے اس لئے یہ بھی فنا نہیں ہوگی۔

مرزا صاحب کا عشقِ رسولؐ

روح کے بارے میں مرزا صاحب نے معرفت کے جو حقائق بیان کئے ہیں وہ ایک پوری کتاب کا تقاضا کرتے ہیں جس کی یہاں گنجائش نہیں۔ البتہ اُن کے افکار و تصورات اور اظہارِ جذبات کا ایک پہلو ایسا ہے جس کا ذکر کئے بغیر ہم رہ نہیں سکتے اور ہے مرزا صاحب کا عشقِ رسولؐ۔ بعض معترضین طعنہ زنی کرتے تھے اور ایسے معترض آ

بھی موجود ہیں جو کہتے ہیں کہ (نعوذ باللہ) مسلمانوں کے پیغمبرؐ کو بھی معلوم نہ تھا کہ روح کی حقیقت کیا ہے۔ان معترضین کا اشارہ اس آیت کی طرف تھا کہ ''**ویسئلونك عن الروح قل الروح من امر ربی وما او تیتم من العلم الا قلیلا**'' (بنی اسرائیل آیت ۸۵)

یعنی ''اے (محمدؐ) تجھ سے پوچھتے ہیں کہ رُوح کیا ہے اور کس چیز سے اور کیوں پیدا ہوئی ہے۔ان کو کہہ دے کہ روح میرے رب کے امر میں سے ہے اور تمہیں اس (روح اور اس کے اسرار) کا قلیل علم دیا گیا ہے''۔معترضین کو دراصل اس آیت مقدسہ کے لفظ ''ما اوتیتم'' سے دھوکا لگ گیا یا دانستہ طور پر ناواقف لوگوں کو دھوکا دینے کی کوشش کی اور انہوں نے اس پوری آیت کے غلط معنی بیان کر کے حضورِ اقدس کے علم کے بارے میں غلط اور گمراہ کن تاثر دیا۔مرزا صاحب موصوف نے اس تاثر کو نہایت وزنی دلیل سے زائل کر دیا۔ انہوں نے اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے معرفت کا یہ حقیقت آفریں نکتہ بیان کیا کہ اس آیت میں جہاں اللہ تعالیٰ یہ فرماتا ہے کہ ''روح کے بارے میں تمہارا علم قلیل اور ناقص ہے'' — اس سے مراد رسولِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نہیں بلکہ وہ کفار مراد ہیں جو حضورؐ سے روح کی حقیقت کے بارے میں سوال کر رہے تھے۔مرزا صاحب اپنے اس دعوے کی دلیل دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس کا ثبوت یہ ہے کہ یہاں ''ما اوتیتم'' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جو جمع کا صیغہ ہے اور جس کا ترجمہ یہ ہے (اے کافرو!) تم لوگوں کو علم نہیں دیا گیا۔اگر یہاں حضورِ اقدس مراد ہوتے تو واحد کا صیغہ استعمال کیا جاتا کیونکہ اس آیت میں جہاں بھی حضورؐ کو مخاطب کیا گیا وہاں واحد ہی کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے جیسے ''**ویسئلونك**'' اور عربی زبان کا ایک مبتدی بھی جانتا ہے کہ ''ک'' ضمیرِ واحد ہے یعنی اے رسول ''تجھ'' سے سوال کرتے ہیں یہ نہیں فرمایا کہ ''تم'' سے سوال کرتے ہیں۔اس طرح مرزا صاحب نے قرآنِ شریف پر عائد ہونے والے ایک بہت بڑے اعتراض کو دور کر دیا اور حضورِ اقدس کی عظمت کے آفتاب کو گہنانے کی جو مذموم کوشش کی جا رہی تھی اُس کی جڑ پر تبر مار کر ہمیشہ کے لئے اُس کا خاتمہ کر دیا۔اسے مرزا صاحب کے عشقِ رسولؐ کے علاوہ اور کیا نام دیا جا سکتا ہے؟

حضورِ اقدس کے آفتابِ عظمت کو گہنانے کی ایک اور کوشش کی گئی۔اس کوشش کو

ناکام بنانے کی سعادت بھی مرزا صاحب ہی کے حصہ میں آئی۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے
کہ اللہ تعالیٰ قرآنِ شریف میں ایک مقام پر اپنے نبیؐ پاک کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتا
ہے کہ ''ووجدک ضآلا فھدی''۔(سورہ الضحیٰ آیت ۷) اس آیتِ مقدسہ میں
''ضال'' کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ چونکہ ''ضال'' کے عام اور متداول معنی گمراہ کے ہیں اس
لئے ان الفاظ کا مفہوم یہ لیا گیا کہ (اے رسولؐ) ''تو گمراہ تھا پس ہم نے تجھے ہدایت دی۔''
اس طرح دشمنانِ اسلام کو حضورؐ اقدس کی دستارِ عظمت پر داغ لگانے کا موقع ملتا تھا اور وہ
بڑے زور سے اعتراض کرتے تھے کہ مسلمانوں کا پیغمبر تو (نعوذ باللہ) ایک زمانے میں گمراہ
تھا۔ اس حربے سے ہندوستان میں پادری اور آریہ مبلغ اسلام پر حملے کر رہے تھے۔ اس
وقت صرف مرزا غلام احمد صاحب قادیانی تھے جنہوں نے اس اعتراض کا مدلل جواب دیا۔
اُن کا عشق رسولؐ بڑی شدت سے جوش زن ہوا اور انہوں نے عیسائیوں اور آریوں کو للکارا
کہ تم اپنی جہالت اور نادانی سے یہ اعتراض کرتے ہو جبکہ حقیقت یہ ہے کہ......

''جو شخص قرآنِ کریم کے اسالیب کلام کو بخوبی جانتا ہے اس پر یہ پوشیدہ نہیں کہ
بعض اوقات وہ کریم اور رحیم جل شانہٗ اپنے خواص عباد (بندوں) کے لئے ایسا لفظ استعمال
کر دیتا ہے کہ بظاہر بدنما معلوم ہوتا ہے مگر معناً نہایت محمود اور تعریف کا کلمہ ہوتا ہے جیسا کہ
اللہ جل شانہٗ نے اپنے نبیؐ کریم کے حق میں فرمایا ''ووجدک ضآلا فھدی''۔ اب
ظاہر ہے ''ضال'' کے معنی مشہور اور متعارف جو اہلِ لغت کے منہ پر چڑھے ہوئے ہیں گمراہ
کے ہیں جس کے اعتبار سے آیت کے یہ معنی ہوتے ہیں کہ خدا تعالیٰ نے (اے رسول اللہ)
تجھ کو گمراہ پایا اور ہدایت دی حالانکہ آنحضرتؐ کبھی گمراہ نہیں ہوئے اور جو شخص مسلمان ہو کر
یہ اعتقاد رکھے کہ کبھی آنحضرت صلعم نے اپنی عمر میں ضلالت کا عمل کیا تھا تو وہ کافر بے دین
اور حدِ شرعی کے لائق ہے بلکہ آیت کے اس جگہ وہ معنی لینے چاہئیں جو آیت کے سیاق اور
سباق سے ملتے ہیں وہ یہ ہیں کہ ''اللہ جل شانہٗ نے تجھے یتیم اور بے کس پایا اور اپنے پاس جگہ
دی اور تجھ کو ''ضال'' یعنی عاشق وجہ اللہ پایا پس اپنی طرف کھینچ لایا......'' (''آئینہ کمالاتِ
اسلام'' صفحہ 170 و 171)

اس طرح مرزا صاحب نے ''ضال'' کے ایک ایسے معنی کی طرف ہماری رہنمائی

کی جس کی طرف اب تک کسی کی نظر نہیں گئی تھی یعنی ''ضال'' کے ایک اور معنی بھی ہیں اور وہ ہیں محبت میں سرشار ہونے کے کہ اس حالت میں انسان اپنے محبوب کے سوائے ہر چیز کو بھول جاتا ہے جو عشق کا انتہائی مقام ہے اور ظاہر ہے کہ یہی معنی حضورؐ اقدس کی شان اور مرتبے کے مطابق ہیں کیونکہ آپؐ کی ساری حیاتِ طیبہ عشقِ الٰہی کا شاہکار تھی۔

مرزا صاحب کی غیرتِ رسولؐ

مرزا صاحب کا یہی وہ عشقِ رسولؐ ہے جو بعض دفعہ غیرتِ رسولؐ کی صورت میں اپنی آب و تاب بلکہ جلال دکھاتا ہے۔ ان کی تحریروں کے مطالعہ سے یہ تصور اُبھرتا ہے کہ وہ سب کچھ گوارا کر سکتے تھے مگر یہ گوارا نہیں کر سکتے تھے کہ رسولؐ اقدس کی عظمت پر ذرا سی بھی آنچ آ جائے۔ ایسے مواقع پر ان کی غیرتِ رسولؐ شمشیرِ برہنہ بن جاتی تھی چنانچہ مشہور شاتمِ رسولؐ پنڈت لیکھ رام نے جب ہمارے آقا و مولا صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی شانِ اقدس میں گستاخیاں کیں تو مرزا صاحب کے صبر و ضبط کے سارے بند ٹوٹ گئے اور انہوں نے بڑے جوش سے اسے للکارا کہ

الا اے دشمنِ نادان و بے راہ! بترس از تیغ بُرانِ محمدؐ

(یعنی اے (رسولؐ اقدس کے) نادان اور گمراہ دشمن!۔۔۔ ''ہوش کے ناخن لے اور محمد مصطفیٰؐ کی اس شمشیرِ آبدار سے ڈر جو دشمن کا کچھ باقی نہیں چھوڑتی)۔۔۔ اور پھر جب تک یہ گستاخِ رسولؐ پنڈت لیکھ رام اپنے انجام کو نہیں پہنچ گیا مرزا صاحب سجدوں میں پڑے رب کریم کے حضور شب و روز گڑگڑاتے رہے۔

اسی دوران یعنی لیکھ رام کے قتل سے کچھ پہلے ایک اور واقعہ پیش آیا جس نے مرزا صاحب کی غیرتِ ایمانی کا ایک اور پہلو دکھایا۔ موصوف لاہور کے ریلوے اسٹیشن پر نماز عصر کے لئے وضو کر رہے تھے کہ پنڈت لیکھ رام بھی جالندھر جانے کے لئے پلیٹ فارم پر آ گیا۔ مرزا صاحب کو دیکھ کر ان کے قریب آیا اور دونوں ہاتھ جوڑ کر ہندووانہ طریق کے مطابق سلام کیا۔ مرزا صاحب نے یونہی سرسری طور پر اس کی طرف دیکھا مگر کچھ التفات نہ کیا اور وضو میں مصروف رہے۔ اس نے اس خیال سے دوبارہ سلام کیا کہ شاید مرزا صاحب

کی نظر اس پر نہیں پڑی مگر انہوں نے اس بار بھی اس کے سلام کا جواب نہ دیا۔ یہ دیکھ کر کسی نے مرزا صاحب کو متوجہ کرتے ہوئے کہا کہ حضرت! پنڈت لیکھ رام آپ کو سلام کرتا تھا۔ مرزا صاحب نے عجیب جلالی انداز سے جواب دیا ''اس شخص نے آنخضرتؐ کی بڑی توہین کی ہے، میرے ایمان کے خلاف ہے کہ اس کا سلام لوں (بدبخت) آنخضرتؐ کی پاک ذات پر تو حملے کرتا ہے اور مجھ کو سلام کرنے آیا ہے۔'' (''سیرتِ مسیح موعود'' حصہ دوم صفحہ 271 مطبوعہ خواجہ پریس بٹالہ)

اسی طرح جب انگلستان سے ایک اور ''فوج'' پادریوں کی صورت میں ہندوستان آئی اور اس نے اسلام اور حضورِ اقدسؐ کی مقدس شخصیت پر جارحانہ حملے کئے تو مرزا صاحب کی غیرتِ رسولؐ پھر مشتعل ہوئی اور انہوں نے ان گستاخ پادریوں کو للکارا اور ایسے رُخ سے ان پر جوابی حملہ کیا کہ شاید کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ مرزا صاحب نے یہ عجیب اور ششدر کر دینے والا دعویٰ پیش کیا کہ تم لوگ کس برتے پر اسلام اور رسولؐ اقدس کے منہ آتے ہو! ذرا اپنی خبر تو لو۔ تم جس مسیحیت کی تبلیغ کر رہے ہو وہ تو جعلی مسیحیت ہے، اس کا تو خدا کے سچے نبی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دین سے دُور کا بھی تعلق نہیں، ارے نادانو! یہ تو ایک جعل ساز پولوس یہودی کا ساختہ پرداختہ ہے۔ مرزا صاحب نے اپنے اس دعوے کے حق میں ایسے دلائل پیش کئے کہ سارا عالمِ مسیحیت ساکت و صامت رہ گیا۔ انہوں نے دنیا کو بتایا اور ایک بہت بڑی حقیقت کے چہرے سے یہ کہہ کر نقاب اٹھایا کہ......

''پولوس پہلا شخص تھا جس نے عیسائیوں کے مذہبی اعتقادات میں فساد ڈالا اور انہیں گمراہ کر کے ان کے مذہبی اصولوں کی بیخ کنی کر دی۔ اس نے شام جا کر ازراہِ مکر ایک افسانہ تراشا تا کہ بعض مسیحی اُمراء کے سامنے پیش کرے۔'' (اور انہیں اپنا ہمنوا بنا لے) (''حمامتہ البشریٰ'' صفحہ 37)

یہ افسانہ کیا تھا اور پولوس کا کردار حضرت مسیحؑ کے زمانے میں کیا تھا؟ مرزا صاحب اس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ— ''پولوس حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زندگی میں آپؑ کا جانی دشمن تھا اور پھر آپؑ کی وفات کے بعد...... اپنی بعض نفسانی اغراض کے تحت...... عیسائی ہو گیا اور ظاہر یہ کیا کہ مجھے کشف کے طور پر حضرت مسیحؑ ملے ہیں اور

میں ان پر ایمان لے آیا ہوں اور اسی نے پہلے پہل تثلیث کا خراب پودا دمشق میں لگایا اور یہ پولوسی تثلیث دمشق سے ہی شروع ہوئی ...... اس نے (حضرت) موسیٰؑ کی توریت کے برخلاف اپنی طرف سے نئی تعلیم دی، سور حلال کیا، ختنے کی رسم توریت میں ایک مؤکد رسم تھی اور تمام نبیوں کا ختنہ ہوا تھا اور خود حضرت مسیحؑ کا بھی ختنہ ہوا تھا وہ قدیم حکم الٰہی (اس نے) منسوخ کر دیا اور توریت کی جگہ تثلیث قائم کر دی اور توریت کے احکام پر عمل کرنا غیر ضروری ٹھہرایا اور یہ تعلیم دی کہ مسیحی مذہب میں کفارے کے بعد شریعت کی ضرورت نہیں اور خونِ مسیحؑ گناہوں کے دُور کرنے کے لئے کافی ہے۔'' (''چشمہ مسیحی'' صفحہ 377'376'374)

آپ یہ سن کر حیران رہ جائیں گے کہ پولوس کے بارے میں مرزا صاحب کے اس دعوے پر شائد نصف صدی بھی نہ گزری تھی کہ مسیحی دنیا کے بڑے بڑے عالموں اور مورخوں نے مرزا صاحب کے اس دعوے کی نہ صرف تصدیق کی بلکہ بعض ایسے حقائق بیان کئے جو دنیا کے لئے حیران کن تھے مثلاً یورپ کا ممتاز مسیحی مورخ (Holger Kersten) لکھتا ہے کہ..... ''مسیحیت کی تاریخ میں پولوس کا نام حضرت مسیحؑ کے شاگردوں کے ساتھ کہیں نظر نہیں آتا اس کے متعلق ہمیں انجیل میں شامل کچھ خطوط سے معلومات حاصل ہوتی ہیں جن میں سے بیشتر خود پولوس کے لکھے ہوئے ہیں اور ان میں تعصب، تنگ نظری اور جعل سازی کا بہت دخل ہے۔ دراصل موجودہ عیسائیت پولوس کے ایجاد کردہ ضابطوں اور مصنوع عقائد کا مجموعہ ہے۔''

(Jesus Lived in India .... Page 28,29)

مسٹر ہولگر مزید کہتے ہیں کہ ''اب بھی کچھ زیادہ مشکل نہیں کہ پال (پولوس) کی گھڑی ہوئی تعلیم سے کنارہ کشی اختیار کر لی جائے۔'' (Page 29, Jesus Live in India)

ایک اور مسیحی مورخ رابرٹ گریوز لکھتا ہے کہ ''حضرت مسیحؑ کے مخلصین کی جماعت نے بھی جو نظارین (Nazaraene) کے نام سے مشہور ہوئی پولوس پر سخت لے دے کی اور اس پر دینِ مسیحی کی توہین کا الزام لگایا۔'' (Jesus in Rome, P 36)

دینِ مسیحیت کی تاریخ کا ایک مورخ ویل ہیلیم نیسلے (Wilhelm Nestle) پولوس کی تحریک کا جائزہ لینے کے بعد لکھتا ہے کہ ''عیسائیت ایک ایسا مذہب ہے جس کی بنیاد

پال (پولوس) نے رکھی تھی۔ اس طرح حضرت مسیحؑ کی اصل اور حقیقی تعلیم تو پس منظر میں چلی گئی اور اس کی جگہ پولوس کی تعلیم نے حاصل کر لی۔'' (Jesus Lived in India, P. 28)

یہی مسیحی مورخ کہتا ہے کہ ''پال (پولوس) بہت ہی متعصب شخص تھا اور اس میں تو کچھ بھی شک نہیں کہ حضرت مسیحؑ کے اصل حواریوں سے بالکل مختلف تھا۔ وہ نہایت کٹر فرقہ پرست تھا۔ وہ مسیحیت کے منکروں اور اس پر ایمان رکھنے والوں کے درمیان بہت بڑی خلیج حائل کر گیا۔ اس نے یسوعؑ کی تعلیمات کی بے حرمتی اور مخالفت کی اور انہیں اتنے اونچے درجے پر بٹھا گیا جو خود یسوعؑ اپنے لئے ہرگز پسند نہیں کرتے تھے اور انہیں یسوعؑ سے کرائیسٹ (Christ) یعنی نجات دہندہ بنا دیا۔ اگر کبھی حضرت مسیحؑ کی حقیقی اور دانشمندانہ تعلیم کا سراغ لگ گیا تو یقینی طور پر ہمیں ان جعلی عقائد کو مسترد کرنا پڑے گا جو آج تک مسیحیت کے نام پر (پولوس کی تعلیمات کی صورت میں) مقدس، قابل احترام اور نا قابل تنقید سمجھے جاتے ہیں اس صورت میں ہم اس تعلیم کی طرف رجوع کر سکیں گے جس کا سر چشمہ مسیحؑ کی (مبارک) ذات تھی''۔ (Jesus Lived in India, P. 28)

اور اس میں کیا شک ہے کہ مرزا غلام احمد صاحب قادیانی نے حضرت مسیحؑ کی حقیقی تعلیم کا سراغ لگانے کی کامیاب کوشش کی اور مسیحیت کے مقدس و مبارک چہرے پر پڑے ہوئے وہ نقاب اُتار پھینکے جو پولوس نے ڈال دیئے تھے۔ اس طرح مرزا صاحب نے حضرت مسیحؑ کی حقیقی تعلیم تک پہنچنے کا راستہ بنا دیا۔ یہی نہیں انہوں نے نام نہاد مسیحیت کے ہاتھ سے وہ حربہ ہی چھین لیا جس سے مسیحی مبلغ اسلام پر حملہ آور ہوتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان سے لے کر انگلستان تک سارا عالم مسیحیت ان کا دشمن ہو گیا اور ان کے خلاف الزام تراشیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ان پر جھوٹے مقدمات قائم کئے گئے، انہیں عدالتوں میں کھینچا گیا تا کہ اپنے اصل مشن کی طرف سے ان کی توجہ ہٹ جائے چنانچہ ایک انگریز پادری ''ہنری مارٹن کلارک'' نے مرزا صاحب کے خلاف قتل کا مقدمہ دائر کر دیا تا کہ جعلی عیسائیت کے خلاف حق و صداقت کی جو آواز مرزا صاحب بلند کر رہے تھے وہ دم توڑ دے۔ تعجب تو اس پر آتا ہے کہ مخالفت کی اس رو میں ہمارے بعض مسلمان اکابر بھی بہہ گئے اور مرزا صاحب کے مخالف پادریوں کا ساتھ دے کر ان کے ہاتھ مضبوط کرنے کا

موجب بنے۔

مرزا صاحب غلبۂ اسلام کے لئے جس جذبے سے میدان میں آئے تھے افسوس کہ اس کا اندازہ نہیں لگایا گیا بلکہ ان کے اور ان کی جماعت کے خلاف دشمنی کا طوفان کھڑا کر کے ان کی تحریک کو بھی نقصان پہنچایا گیا اور ملت اسلامیہ کو بھی انتشار میں مبتلا کر دیا گیا۔ اس طرح دراصل پادریوں کا مشن پورا ہو گیا کیونکہ مرزا صاحب نے موجودہ جعلی مسیحیت کی بنیاد پر حملہ کیا تھا اور زبردست دلائل سے ثابت کیا تھا کہ موجودہ عیسائیت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیش کی ہوئی مسیحیت ہرگز نہیں بلکہ ''پولوس'' کی تخلیق کردہ مسیحیت ہے وہی اس کا بانی تھا۔ اگر مرزا صاحب کی مخالفت کرنے کی بجائے ان کے موقف کو آگے بڑھایا جاتا تو یقینی بات ہے کہ عیسائیت کو یہ فروغ ہرگز حاصل نہ ہوتا اور لاکھوں کروڑوں مسیحی کلمہ پڑھ کر دائرۂ اسلام میں داخل ہو گئے ہوتے۔

ہمارے بارے میں خواہ کوئی کچھ کہے' یہ بڑی بزدلی کی بات ہے کہ ہم اس ڈر سے سچی بات نہ کہیں کہ ہمیں بھی قادیانی نہ بنا دیا جائے۔ ایک غیر جانبدار مبصر کی حیثیت سے جہاں تک ہم نے مرزا صاحب کی تحریک کا مطالعہ کیا ہے' ہم تو ان سے بہت متاثر ہوئے ہیں اور اپنے دل کے ہاتھوں یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ ہمیں تو مرزا صاحب کی تحریک میں خلوص ملا' سچائی ملی' توحید ملی' عشقِ رسولؐ ملا' غیرتِ رسولؐ ملی۔ حیرت ہوتی ہے کہ جس شخص نے اسلام اور ہادیٔ اسلامؐ پر کئے جانے والے ہر وار کو اپنے سینے پر لے لیا' جو شخص عشقِ رسولؐ میں اس قدر سرشار تھا کہ اپنی متاعِ جاں اور اپنی عزیز از جاں اولادوں کو اس راہ میں قربان کر دینا اپنے لئے عین سعادت جانتا تھا اس کے خلاف بغض و عداوت کے یہ شعلے کیسے بھڑکا دیئے گئے؟ وہ تو اسلام اور رسولِ اسلامؐ کے عشق میں خون کے آنسو بہا رہا ہے—— ذرا دیکھئے تو وہ کیا کہہ رہا ہے:۔

''کیا یہ سچ نہیں کہ تھوڑے ہی عرصے میں اس ملکِ ہند میں ایک لاکھ کے قریب لوگوں نے عیسائی مذہب اختیار کر لیا...... اور بڑے بڑے شریف خاندانوں کے لوگ اپنے پاک مذہب کو کھو بیٹھے یہاں تک کہ وہ جو آلِ رسولؐ کہلاتے تھے وہ عیسائیت کا جامہ پہن کر دشمنِ رسولؐ بن گئے اور اس قدر بدگوئی اور اہانت و دشنام دہی کی کتابیں نبی کریم صلی اللہ

علیہ وسلم کے حق میں چھاپی گئیں اور شائع کی گئیں کہ جن کے سننے سے بدن پر لرزہ پڑتا ہے اور دل رو رو کر یہ گواہی دیتا ہے کہ اگر یہ لوگ ہمارے بچوں کو ہماری آنکھوں کے سامنے قتل کرتے اور ہمارے جانی اور دلی عزیزوں کو جو دنیا کے عزیز ہیں ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالتے اور ہمیں بڑی ذلت سے جان سے مارتے اور ہمارے تمام اموال پر قبضہ کر لیتے تو واللہ ثم واللہ ہمیں رنج نہ ہوتا اور اس قدر کبھی دل نہ دُکھتا جو ان گالیوں اور اس توہین سے جو ہمارے رسولِ کریمؐ کی کی گئی دُکھا''۔(''آئینہ کمالاتِ اسلام'' ص 52,51)

اسلام اور رسولِ اسلام کے لئے شعلہ بجاں رہنے والا ایسا شخص کیا اس قابل نہ تھا کہ اس کی تکریم کی جاتی' اس سے پیار کیا جاتا کہ وہ بھی ہمارے آقا و مولا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پیار کرتا اور حضورؐ کی محبت میں اپنی جانِ پُرسوز کو گداز رکھتا تھا۔ ذرا سنئے تو! اس کی وہ صدائے پُرسوز جو اپنے محبوبؐ کی یاد میں اس کے قلبِ تپاں سے بلند ہو رہی ہے:۔

''میں ہمیشہ تعجب کی نگاہ سے دیکھتا ہوں کہ یہ عربی نبی جس کا نام محمدؐ ہے (ہزار ہزار درود اور سلام اس پر) یہ کس عالی مرتبہ کا نبی ہے اس کے عالی مقام کا انتہا معلوم نہیں ہوسکتا اور اس کی تاثیر قدسی کا اندازہ کرنا انسان کا کام نہیں۔ افسوس کہ جیسا حق شناخت کا ہے بجز اُس کے مرتبہ کو شناخت نہیں کیا گیا۔ وہ توحید جو دنیا سے گم ہو چکی تھی وہی ایک پہلوان ہے جو دوبارہ اس کو دنیا میں لایا۔ اُسؐ نے خدا سے انتہائی درجہ پر محبت کی اور انتہائی درجہ پر بنی نوع کی ہمدردی میں اُسؐ کی جان گداز ہوئی اس لئے خدا نے جو اُسؐ کے دل کے راز کا واقف تھا اُسؐ کو تمام انبیاء اور تمام اولین اور آخرین پر فضیلت بخشی اور اُس کی مرادیں اس کی زندگی میں اُس کو دیں۔ وہی ہے جو سرچشمہ ہر ایک فیض کا ہے اور وہ شخص جو بغیر اقرار اور افاضہ اُسؐ کے' کسی فضیلت کا دعویٰ کرتا ہے وہ انسان نہیں بلکہ ذریت شیطان ہے کیونکہ ہر ایک فضیلت کی کنجی اُسؐ کو دی گئی ہے اور ہر ایک معرفت کا خزانہ اُسؐ کو عطا کیا گیا ہے جو اُسؐ کے ذریعہ سے نہیں پاتا وہ محروم ازلی ہے۔ ہم کیا چیز ہیں اور ہماری حقیقت کیا ہے۔ ہم کافر نعمت ہوں گے اگر اس بات کا اقرار نہ کریں کہ توحیدِ حقیقی ہم نے اس نبیؐ کے ذریعہ سے پائی' زندہ خدا کی شناخت ہمیں اس کامل نبیؐ کے ذریعہ سے اور اُس کے نور سے ملی اور خدا کے مکالمات اور مخاطبات کا شرف بھی جس سے ہم اس کا چہرہ دیکھتے ہیں اسی بزرگ نبیؐ کے

ذریعہ سے ہمیں میسر آیا۔ اس آفتابِ ہدایت کی شعاع دھوپ کی طرح ہم پر پڑتی ہے اور اُس وقت تک ہم منور رہ سکتے ہیں جب تک کہ ہم اس کے مقابل پر کھڑے ہیں۔''
(''حقیقۃ الوحی'' ص 116,115)

کیا اس کی یہ دعوت قبول کرنے کے لائق نہیں تھی کہ:۔
''اے تمام وہ لوگو جو زمین پر رہتے ہو! اور اے تمام وہ انسانی روحو! جو مشرق اور مغرب میں آباد ہو! میں پورے زور کے ساتھ آپ کو اس طرف دعوت کرتا ہوں کہ اب زمین پر سچا مذہب صرف اسلام ہے اور سچا خدا بھی وہی خدا ہے جو قرآن نے بیان کیا ہے اور ہمیشہ کی روحانی زندگی والا نبی اور جلال اور تقدس کے تخت پر بیٹھنے والا حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ (''تریاق القلوب'' ص 11)

کیا ایسی دردمند اور پرخلوص آواز کسی جعل ساز یا منصوبہ باز کی ہو سکتی ہے؟ کیا اس میں ایسا زور، ایسا سوز و درد، ایسا جوش اور ولولہ پیدا ہو سکتا ہے؟ کیا ایسی آواز دبانے کے لائق تھی یا اس قابل تھی کہ ساری ملتِ اسلامیہ اس آواز میں اپنی آواز ملا دیتی تا کہ آسمان پر نجات یافتہ لکھی جاتی۔

پیام شاہجہانپوری
(25 مارچ 2004ء)
لاہور

⌘⌘⌘